ON THE RULE OF LAW

قانون کی حکمرانی

www.kitabosunnat.com

مصنف: برائن زیڈ ٹامانا ھا

مترجم: طاہر منصور فاروقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

DATA E

ON THE RULE OF LAW

قانون کی حکمرانی

25517

مصنف: برائن زیڈ ٹاماناھا

مترجم: طاہر منصور فاروقی

LIBRARY

تخلیقات

تخلیقات: علی پلازہ 3- مزنگ روڈ لاہور فون: 042-7238014
E-mail: takhleeqat@yahoo.com
Web Site: http://www.takhleeqat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق محفوظ

ناشر	:	تخلیقات، لاہور
زیر اہتمام	:	لیاقت علی
مترجم	:	طاہر منصور فاروقی
ٹائٹل	:	سہیل احمد
کمپوزنگ	:	آزاد کمپوزنگ سنٹر: 042-7598311
پرنٹر	:	بخاری پرنٹرز لاہور
بائنڈنگ	:	اشفاق
ضخامت	:	216 صفحات
تاریخ اشاعت	:	2007ء
قیمت	:	160/- روپے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

25517

مندرجات

○... پیش لفظ 4

○... تعارف 5

-1 کلاسیکل تصورات 13

-2 قرون وسطیٰ میں جڑیں 25

-3 لبرل ازم 51

-4 لاک، مونٹیسکیو اور وفاقیت کے مقالے 73

-5 قدامت پسندوں کا انتباہ 93

-6 انتہا پسند بایاں بازو اور انحطاط 113

-7 رسمی نظریات 141

-8 اثباتی نظریات 158

-9 تین تصورات 176

-10 بین الاقوامی سطح 194

-11 عالمی انسانی بہبود 209

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش لفظ

وطن عزیز میں عدالتی بحران کے دوران ذرائع ابلاغ (الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں) پہ عدلیہ کی آزادی کا تذکرہ تکرار کے ساتھ سامنے آیا۔ تحریروں' تقریروں اور مباحثوں میں قانون اور سیاسیات کے ماہرین اپنے حتمی تجزیہ میں یہی کہتے ہوئے سنے گئے کہ عدلیہ کی آزادی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ قانون کی حکمرانی قائم ہو۔ چنانچہ عام آدمی کی دلچسپی اس موضوع میں عروج پر پہنچ گئی۔

زیرنظر کتاب برائن زیڈ ٹاماناھا کی معروف تصنیف On The Rule.... Of Law.... کا ترجمہ اسی عوامی دلچسپی کے پیش نظر پیش کیا جارہا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ یہ نظریہ روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ عام لوگوں کو اس سے آگاہ ہونا چاہیے۔ بدقسمتی سے اس موضوع پر ہونے والا زیادہ تر کام علم سیاسیات اور علم قانون کے نصاب تک محدود رہا ہے۔ مصنف نے یہ کتاب اسی مقصد کے تحت لکھی ہے کہ قانون اور سیاسیات کے شعبوں سے باہر کے قارئین کو قانون کی حکمرانی کے تصور اور عملی صورت سے آگاہ کیا جائے۔ ترجمہ کرتے ہوئے کوشش کی گئی ہے کہ عمومی اور عام فہم انداز اپنایا جائے لیکن تکنیکی موضوعات کی زبان بھی تکنیکی ہوتی ہے۔ چنانچہ قانون اور پولیٹیکل سائنس کی اصطلاحات اور بعض مقامات پر بوجھل زبان کا استعمال ناگزیر تھا۔

مترجم: طاہر منصور فاروقی
2/43 شاہدرہ ٹاؤن' لاہور 042-7914506

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعارف

1990ء کے عشرہ میں کمیونزم کے تقریباً مکمل انہدام کے بعد بہت سے مبصرین کا خیال تھا کہ اب ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ ایسا دور جس میں آزادی، جمہوریت، انسانی حقوق اور سرمایہ داری کے مغربی نظریات کا غلبہ ہوگا اور ان کے ثمرات کرۂ ارض کے ان علاقوں تک پھیل جائیں گے جہاں ان نظریات کو ماضی میں مارکسزم، روایتی اقدار، مغربیت کی مخالفت یا دیگر خود ساختہ نظریات کے نام پر مسترد کیا جاتا رہا ہے۔ کہا گیا کہ تاریخ کا ایک اور دور ختم ہو گیا ہے اور نئے دور میں امن و خوشحالی کی عالمگیر حکمرانی قائم ہونے کو ہے۔

چیزیں کتنی جلدی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد وہ منظر تشکیل نہ پا سکا جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ قومی، نسلی، مذہبی اور سیاسی تنازعات نے نئی صف بندیاں مرتب کر دیں۔ نسل کشی اور ناقابل تصور بربریت کے نئے مناظر دیکھنے میں آئے۔ ایسے اقتصادی بحران اُبھرے جنہوں نے عالمی معاشی استحکام خطرے میں ڈال دیا۔ دہشت گردی اور جنگوں کے شعلے بھڑکتے رہے اور یہ سب کچھ اس سطح اور شدت سے زیادہ تھا جو پچاس برس کی سرد جنگ کے دوران تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ نئی عالمی تفریق نمودار ہوئی جو کمیونسٹ نظام اور مغرب کے درمیان شدید تناؤ کی وجہ سے زیر سطح

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔ یہ تفریق امیر اور غریب ملکوں کے درمیان' روشن خیال اور قدامت پسند معاشروں کے درمیان' اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کے درمیان' شمال اور جنوب یا مشرق اور مغرب کے درمیان' سرکاری سطح پر تاجرانہ سرمایہ داری اور آزادانہ تجارت کی سرمایہ داری کے درمیان' عالمی کارپوریشنوں کے غلبہ اور مقامی کاروباری خودمختاری کے تحفظ کے درمیان امریکی (یوایس) عسکری' اقتصادی' سیاسی اور ثقافتی اثرات اور بقیہ دنیا کے درمیان ابھری اور گہری ہوتی چلی گئی۔ پُرامید مبصرین کے نزدیک 1990ء کے عشرہ کے دوران فتح مندی کا ابھرنے والا اعتماد کہیں فضاؤں میں تحلیل ہوگیا۔

لیکن پھر اسی نئی غیر یقینی فضا میں ہر طرح کی تفریق کو عبور کرتے ہوئے ایک ہمہ گیر اتفاق رائے دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ اتفاق رائے ایک نکتہ کے لیے ہے اور وہ نکتہ ہے..... قانون کی حکمرانی..... دنیا بھر کے دانشور ٹھوس انداز میں کہہ رہے ہیں کہ قانون کی حکمرانی..... ہی سب کے لیے بہتر ہے۔ مغربی ممالک میں یہ تصور مکمل طور پر تسلیم شدہ ہے۔ اس کو سب سے پہلے ڈیکلریشن آف ڈیموکریٹک ویلیوز میں شامل کیا جسے دنیا کی سات بڑی صنعتی جمہوریتوں کے سربراہوں کی طرف سے جاری کیا گیا۔ یہ اعلامیہ کہتا ہے..... ''ہم قانون کی حکمرانی میں یقین رکھتے ہیں جو کسی خوف یا لالچ کے بغیر ہر شہری کے حقوق اور آزادیوں کا نہ صرف احترام کرتی ہے بلکہ ان کا تحفظ کرتی ہے اور وہ ماحول مہیا کرتی ہے جس میں انسانی روح' آزادی اور تنوع کے ساتھ بالیدگی حاصل کرتی ہے۔ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کے الفاظ میں ''امریکہ ہمیشہ انسانی عظمت و وقار کے ناقابل بحث مطالبہ..... قانون کی حکمرانی..... کے لیے ڈٹا رہے گا۔ یہ ایک عمومی دانش اور مغربی سیاسی روایت کا امتیازی وصف ہے کہ..... آزادی' قانون کی حکمرانی کے تحت ہوتی ہے۔

قانون کی حکمرانی کے لیے مغربی تائید و حمایت محض آزادی تک محدود نہیں۔ 1990ء کے عشرہ کے اوائل میں مغربی سرپرستی میں قائم ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف نے امداد لینے والے ملکوں کے لیے شرط عائد کردی کہ وہ اپنے ہاں قانون کی حکمرانی کا نفاذ یقینی بنائیں گے۔ یہ پابندی اقتصادی بنیادوں پر جواز رکھتی تھی تاکہ سرمایہ کاری' املاک' اثاثوں اور مارکیٹ کی سودا کاری کو ایک محفوظ ماحول یقینی طور پر مہیا کیا جاسکے۔ ورلڈ بنک کے سٹاف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ممبران اور مشیروں کے ایک ٹریننگ سیشن کے دوران..... قانون کی حکمرانی..... کا جملہ اتنی تکرار کے ساتھ سننے میں آیا کہ شرکاء نے اسے سیشن کا جملہ قرار دے دیا۔ ترقی کے ماہرین کا بیک آواز کہنا ہے کہ قانون کی حکمرانی کے بغیر کوئی پائیدار اقتصادی ترقی ممکن نہیں۔

قانون کی حکمرانی میں صرف مغرب ہی دلچسپی نہیں لیتا۔ اس تصور کی توثیق مختلف معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام رکھنے والے ممالک (کے سربراہ) بھی کرتے آ رہے ہیں۔ روسی صدر پیوٹن نے عدالتی اصلاحات کے نفاذ اور قانون کی حکمرانی کے اصولوں کی مکمل عملداری کو اپنے ملک کی اولین ترجیح بنا رکھا ہے۔ چین نے حال ہی میں قانون کی حکمرانی کو فروغ دینے کے لیے اقوام متحدہ کے ساتھ ایک کوآپریشن اینڈ ٹریننگ پیکٹ پر دستخط کیے ہیں۔ چینی حکمرانوں کا کہنا ہے کہ..... وہ قانون کی حکمرانی کے قیام کی حمایت کرتے ہیں۔ صدر جیانگ زی من نے قانون کی حکمرانی کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں بھی اس بات کا اعادہ کیا۔ ان کے جانشین ہو جنتاؤ نے اپنے انتخاب کے بعد کہا..... ''ہمیں قانون کی حکمرانی پر مبنی نظام استوار کرنا ہوگا تاکہ ہماری امیدیں محض کسی شخصیت سے وابستہ نہ رہیں۔ زمبابوے کے صدر رابرٹ موگابے نے کہا تھا..... صرف ایک ایسی حکومت ہی اپنے عوام سے قانون کی حکمرانی کی اطاعت کا مطالبہ کر سکتی ہے جو خود قانون کی حکمرانی کو اپنا شعار بنائے۔ انڈونیشیا کے صدر عبدالرحمٰن واحد نے اقتدار میں آنے کے سات ماہ بعد کہا تھا..... ہماری بڑی بڑی کامیابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہم قانون کی حکمرانی کا آغاز کر رہے ہیں۔ ایران کے صدر محمد خاتمی نے بار بار ایک سول سوسائٹی کی اہمیت اور قانون کی حکمرانی پر زور دیا ہے۔ میکسیکو کے صدر وائی سینٹ فاکس کیساڈا اعلان کر چکے ہیں کہ قانون کی حکمرانی کی عدم موجودگی ہی میکسیکو کے عوام کی سب سے بڑی پریشانی ہے۔ یہاں تک ایک بدنام زمانہ افغان جنگجو عبدالرشید دوستم کو طالبان کے بعد اقتدار کی مہم کے دوران کہتے ہوئے سنا گیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنا دفاع ٹینکوں اور بندوقوں سے نہیں بلکہ قانون کی حکمرانی سے کریں۔ اس طرح کے متعدد بیانات اور عزائم دنیا کے مختلف نظام ہائے حکومت و سیاست کے سربراہوں کی طرف سے آ رہے ہیں جو جمہوریت اور انسانی حقوق کو مسترد کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ اسلام کے دعویدار ہیں جبکہ کچھ سرمایہ داری کو مسترد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے رہے ہیں اور بقیہ لبرل ازم اور واضح طور پر مغرب مخالف ہیں۔ قانون کی حکمرانی کے لیے ان کی حمایت اور تائید کے اسباب ممکنہ طور پر مختلف پس منظر رکھتے ہوں گے۔ مثلاً کچھ آزادی کے مفاد میں' کچھ نظم ونسق برقرار رکھنے کے لیے اور کچھ اقتصادی ترقی کے لیے ایسا چاہتے ہیں لیکن سب اس کو ناگزیر قرار دے رہے ہیں۔

قانون کی حکمرانی کے لیے یہ کھلا اتفاق رائے تاریخ میں عدیم النظیر ہے' کوئی ایک سیاسی نظریہ کبھی اس طرح عالمگیر توثیق حاصل نہیں کر سکا۔ اس تصور سے وابستہ کچھ عالمی قائدین کی مبینہ وابستگی پہ ان کے اخلاص کو شک وشبہ کی نظر سے بھی دیکھا جا رہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ دنیا بھر میں ارباب بست وکشاد قانون کی حکمرانی کی وکالت کر رہے ہیں اور یہ بات بھی اتنی ہی اہم ہے کہ دنیا کے کسی چھوٹے یا بڑے ملک کی طرف سے اس کی مخالفت یا مخاصمت دیکھنے میں نہیں آئی۔ حکومتی عمائدین کی طرف سے اس کی تکرار ایک ٹھوس ثبوت ہے کہ قانون کی حکمرانی سے وابستگی حکومتوں کو عالمی سطح پر اپنے اقتدار کا قانونی جواز فراہم کرتی ہے۔

عالمی نظریہ کی حیثیت سے اس کا تیزی سے اور قابل ذکر انداز میں بلند ہونا اپنی جگہ اہم اور بے مثال ہے۔ لیکن قانون کی حکمرانی یا بالادستی کا یہ تصور بہت سے مغالطے لیے ہوئے ہے۔ کچھ حکومتی عمائدین قانون کی حکمرانی کی حمایت کرتے ہیں۔ کچھ جرنلسٹ اس جملے کا بہت استعمال کرتے ہیں لیکن کچھ باغی بھی ہیں جو حکومتوں پہ اس کی آڑ میں انتقامی کارروائیوں کا الزام عائد کرتے ہیں۔ لیکن دنیا بھر کے اربوں شہریوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اس کو اچھی طرح سمجھتے' اس پر یقین رکھتے اور صراحت کے ساتھ اسے بیان کرتے ہیں۔ اس جملے کی خفی یا جلی تفہیم ظاہر کرتی ہے کہ اس کے متضاد معنی بہرحال موجود ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ قانون کی حکمرانی میں انفرادی انسانی حقوق کا تحفظ شامل ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت' قانون کی حکمرانی کا حصہ ہے۔ کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ قانون کی حکمرانی اپنی فطرت میں خالصتاً رسمی ہے اور تقاضا کرتی ہے کہ قوانین پہلے سے مرتب کردہ' عمومی' غیر مبہم اور سب پر یکساں طور پر نافذ ہوں۔

دوسرے منکرین کا دعویٰ ہے کہ قانون کی حکمرانی سیاسی' سماجی' معاشی' تعلیمی اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ثقافتی حالات کا احاطہ کرتی ہے جن میں کسی فرد کی جائز خواہشات اور وقار حقیقت کا روپ دھار سکتے ہیں۔ باغی نشاندہی کرتے ہیں کہ مطلق العنان حکومتیں جو قانون کی حکمرانی پہ عملدرآمد کا دعویٰ کرتی ہیں۔ عام طور پر اس کو اپنے جبر و استبداد کا جواز بناتی ہیں۔ مثلاً چینی پروفیسر لی شوکوانگ کا کہنا ہے کہ چینی حکمران قانون کی ذریعے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی نہیں اور اس کا فرق یہ ہے کہ قانون کی حکمرانی کے تحت قانون سب پہ فائق اور اقتدار و اختیار کے ناجائز استعمال کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتا ہے جبکہ قانون کے تحت حکمرانی میں قانون کسی حکومت کے پاس ایسا ہتھیار ہوتا ہے جس کے ذریعے ''قانونی طور پر وہ عوام کو دباتی ہے۔ مفاہیم کے اس بے قابو اختلاف کی روشنی میں قانون کی حکمرانی ''خیر کے عقیدے'' کے مشابہ اس فہم میں ہے کہ ہر کوئی اس کے حق میں ہے۔ لیکن یہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں متضاد آرا پائی جاتی ہیں۔

نظریات کے ماہرین کے نزدیک اس میں کوئی بہتری نہیں۔ سیاسی اور قانونی نظریات دان بھی اکثر اوقات مبہم یا متضاد مفاہیم رکھتے ہیں۔ ایک ماہر کا کہنا ہے کہ..... ''قانون کی حکمرانی کے تصورات بھی اتنے ہی ہیں جتنے لوگ اس کا دفاع کرنے والے ہیں۔'' متعدد نظریات دان سمجھتے ہیں کہ یہ بنیادی طور پر ایک متنازعہ نظریہ ہے۔ ایک ایسا عقیدہ جس کا امتیازی وصف وہ اختلاف ہے جو اس کے بنیادی نکتہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دکھانا مشکل نہیں ہے کہ یہ جملہ ''قانون کی حکمرانی'' نظریاتی اعتبار سے ناجائز استعمال اور عمومی اعتبار سے اضافی استعمال کے نتیجہ میں بے معنی ہو چکا ہے۔

چنانچہ قانون کی حکمرانی کا تصور ایک عجیب و غریب حالت میں ہے۔ آج کی دنیا میں یہ ممتاز، فائق اور جواز مہیا کرنے والا سیاسی نظریہ ہے لیکن اس بات پر اتفاق رائے نہیں ہے کہ اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب کیا ہے؟ اس نظریہ کی وضاحت کرنا ہی اس کتاب کا بنیادی مقصد ہے۔ یہ نظریہ اتنا اہم ہے کہ معاصر سیاسی حالات میں اس کو مبہم اور غیر واضح نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اردگرد پھیلی ہوئی غیر یقینیت کے باوجود ایسا معاملہ نہیں ہے کہ پہلے سے طے شدہ کوئی سے معانی مناسب قرار دے دیئے جائیں۔ کچھ معقول تصورات کی ایک نسبتاً مختصر سی فہرست یقیناً موجود ہے جس میں ہر ایک تصور کو مسلمہ تاریخی اور سیاسی پس منظر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ تصورات نسبتاً واضح عناصر اور قابل فہم معانی رکھتے ہیں۔

یہ کوشش محض بہتر مفہوم پیدا کرنے کی کوشش نہیں ہے۔ ''فارن افیئرز'' میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے مطابق کئی عشرے اور اربوں ڈالرز دنیا میں قانون کی حکمرانی کی ترویج کے لیے خرچ کیے گئے ہیں جس کے مثبت نتائج بہت کم مرتب ہوئے ہیں۔ اگر یہ پہلے سے اپنے مقام پر مضبوطی سے قائم نہیں ہے تو پھر قانون کی حکمرانی کا قیام پُراسرار طور پر مشکل نظر آتا ہے۔ قانون کی حکمرانی کے گرد تاریخ' سیاست اور نظریے کی کھوج اس کی ابتدا کے حالات پر روشنی ڈالے گی اور اس کے اجزا کی شناخت ممکن بنائے گی۔ یہ کوئی ایسا فارمولا تیار نہیں کرے گی جس کی نقل ہر صورت حال میں تیار کی جا سکے تاکہ ہر سماجی سیاسی سیاق سباق کی انفرادیت میں اسے اپنایا جا سکے جو کامیاب نہ ہو سکتا ہو لیکن یہ جاننا کہ یہ کس طرح وجود میں آیا اور کس طرح کام کرتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے مفید معلومات مہیا کرے گا جو ایسے متبادل راستوں کی تلاش میں ہیں جنہیں مقامی حالات میں اپنایا جا سکے۔

قانون کی حکمرانی کی یہ وضاحت اس لیے کی جا رہی ہے کہ اس کی عملی تعبیر کو غیر محفوظ پیش رفت نہ سمجھا جائے۔ میں ان بہت سے لوگوں سے متفق ہوں جو یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ قانون کی حکمرانی ایک ایسی شاندار کامیابی ہے جو زبردست تعریف و توصیف کی حقدار ہے لیکن اس کی اپنی حدود و قیود ہیں اور بہت سے خطرات رکھتی ہے جن کا ذکر اس کے حامی کرتے رہتے ہیں۔ ایک نمایاں خلیج نظریاتی گفتگو اور سیاسی و عوامی گفتگو کے درمیان پائی جاتی ہے۔ نظریات دانوں نے مشاہدہ کیا ہے کہ مغرب میں کچھ عرصہ قانون کی حکمرانی کو زوال آ گیا تھا جو اے وی ڈائیسے کے ساتھ تقریباً ایک صدی پہلے شروع ہوا اور پھر پچاس سال پہلے فریڈرک ہائیک نے اسے نئی توانائی دی۔ اس کے بعد متعدد قانونی نظریات دانوں نے اس کی وکالت کی اور گزشتہ تین عشروں کے دوران ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بالخصوص اس کی پذیرائی ہوئی۔ چنانچہ ایک طرف سیاستدان اور ترقیاتی ماہرین فعال انداز میں قانون کی حکمرانی کے تصور کو دنیا بھر میں فروغ دینے میں مصروف ہیں تو دوسری طرف قانونی نظریات اس بات پہ متفق ہیں کہ مغرب میں قانون کی حکمرانی کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زوال آ رہا ہے جبکہ کچھ اس کی موت کو تیز تر کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ زوال ظاہر کرتا ہے کہ اس کے فروغ کے راستے میں موجود مسائل کو گہرا کیا جا رہا ہے۔

دو خصوصی امور ابتدا میں قابل ذکر ہیں۔ پہلا یہ کہ قانون کی حکمرانی کے کچھ بلند آہنگ چیمپئن جن میں ہائیک بھی شامل ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ وسیع تر سوشل ویلفیئر سٹیٹ اور تقسیمی انصاف کے حصول سے میل نہیں کھاتا۔ نظریات دان اکثر اوقات لبرل ازم' بے لگام سرمایہ داری اور قانون کی حکمرانی کو ایک پیکج قرار دیتے ہیں۔

تاہم بہت سے غیر مغربی معاشرے جو قانون کی حکمرانی کا نفاذ چاہتے ہیں۔ وہ لبرل ہونے کی کوئی خواہش نہیں رکھتے۔ جبکہ بہت سے مغربی معاشرے قانون کی حکمرانی کے ساتھ سوشل ویلفیئر سٹیٹ کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ بنیادی سماجی اور سیاسی مسائل کا ایک انبار قانون کی حکمرانی کا تصور اپنانے کے فیصلہ کا نتیجہ ہے۔ دوسرا یہ کہ قانون کی حکمرانی میں ایک خطرہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے کہ حکمرانی ججوں اور وکیلوں کی ہو جاتی ہے۔ جمہوریت دشمن نتائج سے قطع نظر یہ بات ان معاشروں میں ایک اضافی تشویش پیدا کرتی ہے جہاں ججوں اور وکیلوں کی آمد طبقہ اشرافیہ سے ہوتی ہے یا کسی اور امتیازی گروہ سے۔ ایسے ممالک جو قانون کی حکمرانی کے نفاذ کے لیے کام کر رہے ہیں انہیں اس طرح کے بھاری بھرکم مسائل سے آگاہ رہنے کی ضرورت ہے۔

اس کتاب میں ہم قانون کی حکمرانی کی خامیاں اور خوبیاں اجاگر کرنے کے لیے پوری توجہ دیں گے اور اس ضمن میں اس کے حق میں اور خلاف دونوں طرح کے نظری اور عملی دلائل کو زیر غور لایا جائے گا۔ تمام نظریات کی طرح بہت سے سماجی' ثقافتی پس منظر ایسے ہیں جن کے لیے یہ نظریہ ناموزوں ہے۔ لیکن اسے آزمانا چاہیے اور اگر کسی وقت دوسری اہم سماجی اقدار کو ترک کرنا پڑے تو گریز نہیں کرنا چاہیے۔ تمام نظریات کی طرح اس کے لیے بھی پسند و انتخاب بنایا جائے کہ اس نظریہ کو کس طرح متشکل کرنا اور کس طرح نافذ کرنا ہے اور ایسا کرتے ہوئے موجود تناظر اور موجودہ ترجیحات کو پیش نظر رکھا جائے۔

اس کھوج کے دوران ہونے والا ایک انکشاف قابل ذکر ہے کہ قانون کی حکمرانی کا تصور ابتدائی طور پر نان لبرل معاشروں میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ہزاروں برس پرانا

25517
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصور اردگرد کے سماجی' سیاسی اور اقتصادی حالات میں رونما ہونے والی غیر معمولی تبدیلیوں میں بھی زندہ رہا۔ حالانکہ ان تبدیلیوں نے اس نظریہ کو زیر عمل لانے اور اسے پیش کرنے کے طریقہ کار میں بہت سارد و بدل کر دیا تھا۔ ان تبدیلیوں نے کچھ ایسے الجھاؤ پیدا کر دیئے جو ابتدائی دور میں موجود نہیں تھے۔ یہ کھوج نہ صرف بتائے گی کہ کس طرح یہ مسائل پیدا ہوئے جو ہم عصر لبرل معاشروں سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ان طریقوں کو بھی منظر عام پر لائے گی جو جدید نان لبرل معاشروں کو اسے سمجھنے اور ان کے حالات کے مطابق اطاعت پذیری ممکن بنا سکتے ہیں۔

ہماری کھوج یا تحقیقی کام وقت اور زمانے کے اعتبار سے مرتب ہے۔ آغاز میں اختصار کے ساتھ قدیم یونانی اور رومن تصورات دیئے گئے ہیں پھر قرون وسطیٰ پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ پھر لبرل ازم کے جدید ابھار اور آخر میں موجودہ حالات میں قانون کی حکمرانی کو قومی اور بین الاقوامی سطوح پر جس طرح دیکھا جا رہا ہے۔ اس کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ تاریخ' سیاسیات اور نظریہ کو ساری کتاب میں باہم مربوط رکھا گیا ہے۔ ابتدائی چند ابواب زیادہ تر تاریخ پر مبنی ہیں۔ وسطی ابواب زیادہ سیاسی اور اختتامی ابواب زیادہ نظریاتی ہیں۔

اگرچہ سیاسی اور قانونی نظریات میں درپیش بہت سے متصادم موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے تاہم کوشش کی گئی ہے کہ قانون کی حکمرانی کے اردگرد پائے جانے والے تصورات اور مسائل کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ قارئین کے لیے نظریاتی پس منظر سے آگاہی نہ ہونے کے باوجود قابل فہم ہوں۔ اگرچہ یہ کتاب نظریات دانوں اور طلبا کے استفادہ کے لیے لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا ایک مقصد عام قارئین کو تاریخی' سیاسی اور نظریاتی مباحث کے بوجھل پن سے دور رکھ کر قانون کی حکمرانی کی بصیرت میں شریک کرنا ہے۔ قانون کی حکمرانی نے عوامی سیاسی قوت وخطابت کو بے اثر کر دیا ہے۔ اس کی امتیازی حیثیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ اس نظریہ کی ایک ہمہ پہلو تفہیم ہر اس فرد کے لیے دستیاب ہو جو دلچسپی رکھتا ہے اور جاننے کے لیے متجسس رہتا ہے۔

❖....❖....❖

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1

کلاسیکل تصورات

یونانی تصور

قانون کی حکمرانی کے بارے میں ہونے والا بیشتر تحقیقی کام نشاندہی کرتا ہے کہ اس کی جڑیں کلاسیکل یونانی تصور میں پائی جاتی ہیں اور اس ضمن میں بالخصوص افلاطون اور ارسطو کی تحریریں حوالہ جات کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ دعویٰ غلط نہیں ہے لیکن ایک ''حکم امتناعی'' ذہن میں رہے۔ ایک نصف ہزار یئے تک جسے تاریک دور کہا جاتا ہے۔ یونانی تصور تقریباً مکمل طور پر مغرب سے پوشیدہ رہا یہاں تک کہ قرون وسطیٰ کے شہاب میں اسے مذہبی علما نے مغرب میں متعارف کراتے ہوئے نئی زندگی دی۔ قانون کی حکمرانی نے ایک مسلسل روایت کی حیثیت سے اپنی جڑیں ایتھنز کے عروج کے دنوں کے بعد ایک ہزار سال تک گہری رکھیں۔ یونانی افکار کو قانون کی حکمرانی کے حوالے سے بہتر طور پر سمجھنے کے لیے عمدہ مثالیں اور بعد کے ادوار کے لیے سند قرار دیا جاتا ہے۔ بہت سے مسائل جو یونانیوں نے اور بالخصوص افلاطون اور ارسطو نے اپنی غیر معمولی بصیرت سے سلجھائے، وقت کی قید سے آزاد اور کسی بھی دور میں پیش آ سکتے ہیں۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں جب ایتھنز کی شان وشوکت اوج کمال پر تھی، اہل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یونان کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے وہاں ایک جمہوریہ کی حیثیت سے ایسی حکومت قائم کی جو براہِ راست شہریوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ایتھنز کے لوگوں کی سمت بندی پولیس یعنی پولیٹیکل کمیونٹی کرتی تھی۔ ہر مرد شہری جس کی عمر تیس سال سے زیادہ ہوتی' چاہے وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا' جیوری میں (معاوضہ پر) خدمات سرانجام دینے کا اہل تھا۔ جیوریز قانونی مقدمات کا فیصلہ کرتی تھیں۔ یہ لوگ مجسٹریٹس کی حیثیت سے بھی گورننگ کونسل میں خدمات سرانجام دیتے تھے۔ اس کونسل کا سربراہ ایک معینہ عرصہ کے بعد تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ اسی طرح یہ لوگ قانون ساز اسمبلیوں کے ارکان بن سکتے تھے اور مختلف مناصب پر تقرر عوام کی مرضی سے ہوتا تھا۔ احتساب کو یقینی بنانے کے لیے مقدمات کا فیصلہ کرنے والے مجسٹریٹس کے خلاف عام شہریوں کی شکایات پر قوانین کی خلاف ورزی کا مقدمہ دائر ہوسکتا تھا۔ ان اوصاف کی بدولت ایتھنز والوں کے نزدیک جمہوریت قانون کی حکمرانی کے ہم معنی تھی۔ ایتھنز میں کسی طرح کا کوئی پیشہ ور قانونی ماہرین کا گروہ تھا اور نہ ہی سرکاری عمال تھے جن کی قانون پر اجارہ داری ہوتی یا قانونی خدمات مہیا کرتے۔ قانون کلیتہً شہریوں کی سرگرمیوں کی پراڈکٹ تھا۔ ان کے نظام میں قانون کے سامنے سب کا مساوی ہونا ایک اہم قدر تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ایک جیسا قانونی معیار سب پہ نافذ ہوتا تھا۔ قانون کی نظر میں افراد کے مختلف درجے تھے مثلاً خواتین' بچے' غلام اور غیر شہری۔ ان کے لیے مختلف قانونی پہلو تھے۔ قانون کی نظر میں برابری کا مطلب تھا کہ قانون اپنے ضابطوں کے مطابق سب پر نافذ ہوگا چاہے کوئی طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتا ہو یا معمولی ہنرمند ہو۔ یعنی قانون کی زد میں آنے والے کا منصب و مرتبہ استثنا کا حقدار نہیں ہوگا۔

اس طرح کے عوامی نظام میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت بھی اتنی ہی جابر اور استبدادی ہوسکتی ہے جتنی بادشاہت یا ملوکیت..... جمہوری استبداد سے بچنے کے لیے قانون کو ایک ایسی حیثیت دی گئی جو اسے الگ تھلگ کر کے عوامی دستبرد سے بچا سکتی تھی۔ اب عوامی عدالتوں اور قانون ساز اسمبلیوں کے ذریعے اس میں ردوبدل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان عدالتوں اور قانون ساز اسمبلیوں کا کردار اب قانون کا احترام کرنا اور قانون کی محافظت اور سرپرستی کرنا تھا نہ کہ قانون کو اپنی مرضی اور منشا سے بیان کرنا۔ چونکہ قانون کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیونٹی میں ایک ماورائی حکم کا عکس سمجھا جاتا تھا چنانچہ اسے تقدیس کا درجہ حاصل ہو گیا۔ یونانی فلاسفر اور مدبر اپنے سے پہلے اور بعد میں آنے والوں کی طرح اس خواب کے دھوکہ میں آ گئے کہ بنیادی قانون کا کوئی ایسا نظام وضع کیا جائے جو مکمل طور پر حقیقی مفادات اور معاشرے کی اصل سماجی ضروریات کے مطابق اپنایا اور دائمی اور ناقابل ترمیم بنایا جا سکے۔ ''سولون کے قوانین'' کا جملہ ایک افسانوی بادشاہ کے حوالے سے اسی ضمن میں استعمال ہوتا ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح کے اس بادشاہ نے قوانین کا ایک مجموعہ بنایا اور عوامی عدالتیں قائم کیں۔ اس نے کچھ مخصوص قوانین کو ''قدیم اور مقدس'' قرار دے رکھا تھا' ان میں ترمیم نہیں ہو سکتی تھی۔ نئے قوانین منظور ہو سکتے تھے۔ پرانے قوانین میں تبدیلی ہو سکتی تھی لیکن یہ قانون سازی نظر ثانی کی طالب تھی۔ محرک کو موجودہ قوانین کی ناموزونیت ثابت کرنا پڑتی تھی۔ اس کے بعد ہی ترمیم منظور ہو سکتی تھی۔ اگر نئی قانون سازی پہلے سے موجود جائز قوانین سے متصادم پائی جاتی تو نئی قانون سازی کے محرکین کو جرمانہ کیا جاتا۔ ان مختلف طریقہ ہائے کار اور معیارات کے ذریعے ایک جمہوری نظام برقرار رکھا جاتا تھا جبکہ عوامی اقتدار اعلیٰ کے اصول قوانین کی فرمانروائی کے اصول کے ماتحت رہتے۔

افلاطون کا تعلق طبقہ اشرافیہ سے تھا۔ اس کا شاگرد ارسطو' مقدونیہ کا رہنے والا اور ایتھنز کا غیر شہری رہائشی تھا۔ ارسطو ایک طبیب کا بیٹا تھا جو بعد ازاں سکندر اعظم کا اتالیق مقرر ہوا۔ افلاطون اور ارسطو کے زمانہ میں ایتھنز اپنی پڑوسی ریاست سپارٹا سے شکست کھانے کے بعد رو بہ زوال تھا۔ یہ واقعات پانچویں صدی قبل مسیح کے قریب کے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ ایتھنز کے شہری انحطاط کا شکار ہو چکے تھے۔ ان میں ذاتی نظم و ضبط اور ضبط نفس کا فقدان پیدا ہو چکا تھا۔ وہ پولس' کی رہنمائی سے بے نیاز ہوتے جا رہے تھے جس نے ایتھنز کی جمہوریت کو عظیم تر بنایا تھا۔ ان سب باتوں کے برعکس وہ تجارت میں دلچسپی لینے لگے تھے اور ان ثمرات سے لطف اندوز ہو رہے تھے جو ایتھنز کی بحریہ کو وسعت دینے کے نتیجہ میں حاصل ہو رہے تھے۔ عوامی اقتدار کے خطرات کی نشاندہی کرنے پر افلاطون کے استاد سقراط کو ایتھنز کے جمہوریت پسندوں نے موت کی سزا دے دی۔ ان حالات میں افلاطون اور ارسطو عوامی جمہوریت میں موجود استبداد کی قوت کے لیے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زبردست پریشان تھے۔ چنانچہ انہوں نے زور دے کر کہا کہ پیش کیا گیا قانون ایک مستقل اور غیر متبدل نظام پیش کرتا ہے۔ "The Laws" میں افلاطون کے قانونی ضابطے مستقل نوعیت کے خواہاں ہیں۔ ان فلاسفروں نے قانون کی حکمرانی میں اپنے جس یقین کا اظہار کیا وہ اس کے استحکام اور قابو میں رکھنے کے اثرات پر بھرپور غور وفکر کے ساتھ تھا۔

افلاطون کا اصرار تھا کہ حکومت کو قانون کا پابند ہونا چاہئے۔ ''جہاں قانون کسی اور اتھارٹی کے ماتحت ہوتا ہے اور بذات خود کوئی طاقت نہیں رکھتا وہاں میری نظر میں ریاست کا انہدام زیادہ دور نہیں رہتا۔ لیکن اگر قانون حکومت کا آقا ہو اور حکومت اس کی غلام ہو تو پھر صورت حال خوش آئند ہوتی ہے اور لوگ ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں جو خدا کی طرف سے ریاست کو عطا ہوتی ہیں۔'' ارسطو کے الفاظ قانون کی حکمرانی کے لیے آج بھی فضاؤں میں گونجتے ہیں۔

اب مطلق العنان بادشاہت یا کسی حکمران کی تمام شہریوں پہ آمرانہ عملداری کسی ایسے شہر میں جہاں سب لوگ مساوی ہوں کچھ افراد کے نزدیک فطرت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس چیز کو منصفانہ سمجھا جاتا ہے کہ مساوی لوگوں میں ہر ایک پہ حکومت قانون کے مطابق کی جائے اور قانون کی حکمرانی' دلیل دی جاتی ہے کہ کسی بھی فرد کے لیے قابل ترجیح ہے۔ اسی اصول کے مطابق اگر یہ بہتر ہو کہ کچھ مخصوص افراد حکومت کریں تو انہیں صرف نگہبان اور قانون کے وزرا بنایا جائے۔ چنانچہ جو کوئی قانون کی حکمرانی چاہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ صرف خدا اور شعور (معقولیت) کی حکمرانی ہو اور جو انسان کی حکمرانی کا خواہشمند ہے وہ درندگی کے عنصر کا اضافہ چاہتا ہے۔ اس لیے کہ خواہش خونخوار درندہ ہے اور اقتدار کی خواہش حکمرانوں کے ذہن کج رو بنا دیتی ہے۔ چاہے وہ بہت اچھے انسان ہی کیوں نہ ہوں۔ قانون ایک ایسا شعور ہے جو خواہش سے متاثر نہیں ہوتا۔

ارسطو نے مذکورہ بالا عبارت میں بہت سے نکات اٹھائے ہیں جو قانون کی حکمرانی کی بحثوں میں ہمیشہ شامل ہوتے رہیں گے۔ مثلاً سیاسی برابری کی صورت حال میں حکومت خود اختیاری' حکومتی عمال کا قانون کے تابع ہونا اور قانون کی شناخت شعور (معقولیت) کے ساتھ' حکمرانی کے اختیارات میں موجود ناجائز استعمال کی طاقت کو روکنا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس کا آخری مشاہدہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ارسطو نے قانون کی حکمرانی کو عقل و شعور اور انسان کی حکمرانی کو خواہش قرار دیا ہے۔ ارسطو کے تبصرہ میں سب سے زیادہ توجہ طلب نکتہ قانون کی حکمرانی کے لیے وہ شرط ہے جس میں قانونی فیصلے کرنے والوں کو بلند کردار ہونا چاہیے۔ ایسا کردار عقل و شعور کے ساتھ منطقی قیاس آرائی کرتا اور اپنی خواہشات کو خوابیدہ رکھتا ہے۔

افلاطون اور ارسطو دونوں اصرار کرتے ہیں کہ قانون کو کمیونٹی میں مزید خیر لانے اور تمام شہریوں کی اخلاقیات کو فروغ دینے کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ جو قوانین پوری ریاست کی بہتری کے لیے وضع نہیں کیے جاتے' وہ جعلی ہوتے ہیں۔ چنانچہ انصاف وہ ہوگا جو قانون کے مطابق اور دیانتداری کے ساتھ ہو اور ناانصافی وہ ہوگی جو غیر قانونی اور بددیانتی پر مبنی ہوگی۔ افلاطون کے نزدیک قانون ایک الوہی حکم کا عکس ہے جس سے نیکی وابستہ ہے۔ دونوں مفکر اس امکان کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ قانون کو طبقہ اشرافیہ کے مفادات کے لیے استعمال (شریک کار) کر لیا جائے گا۔ ارسطو کے نزدیک حکومت کی حقیقی شکلیں منصفانہ قوانین کی طالب اور بے راہ رو حکومتیں غیر منصفانہ قوانین کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ وہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ جب قوانین اچھے ہوں تو انہیں بالاتر ہونا چاہیے۔

متعدد احتیاطی تدابیر وضع کی گئی ہیں تاکہ افلاطون اور ارسطو کے نظریات کو جدید بنانے کی خواہش کو روکا جا سکے۔ ان میں سے کسی نے قانون کے خلاف بغاوت کی وکالت نہیں کی۔ چاہے یہ غیر منصفانہ قوانین ہوں۔ قانون کی اطاعت کے جذبہ سے بڑھ کر کوئی ایسی چیز نہیں جسے حاسدانہ طریقے سے برقرار رکھنا ضروری ہو۔ ارسطو متنبہ کرتا ہے کہ اگر معمولی خلاف ورزیوں کو بھی سرایت کرنے کی اجازت دے دی جائے تو بالآخر ریاست تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ قانون کو سماجی نظام کے لیے لازمی قرار دیتا اور اس کی اطاعت شعاری پر اصرار کرتا ہے۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی عوامی جمہوریت کا دلدادہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ اسے ہجوم کی حکمرانی قرار دیتے تھے۔ ہجوم غیر تعلیم یافتہ' صلاحیت و ذہانت سے محروم ہونے کے علاوہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی فریب دینے والے لیڈر کے بہکاوے میں آ سکتا ہے۔ مزید برآں ان دونوں میں سے کوئی بھی Egalitarian نہیں تھا۔ ان کی دوٹوک رائے تھی کہ لوگوں میں سیاسی استعداد، ذہنی بصیرت کمال ہنر ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ صفات پیدائشی سمجھی جاتی ہیں۔ ان دونوں مفکرین کا اصرار تھا کہ جو لوگ بہتر ہیں انہیں حکومت کرنا چاہیے وہی اضافی انعام وصلہ کے حقدار ہیں۔

ان کا نقطۂ نظر تھا کہ بہترین حکومت بہترین آدمی کی ہوتی ہے قانون کی نہیں کیونکہ قانون ہر صورت حال سے نمٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور نہ ہی ہر طرح کے امکانات کے بارے میں قبل از وقت غور کر سکتا ہے۔ افلاطون کا کہنا ہے۔ درحقیقت جہاں اچھا بادشاہ فرماں روائی کرتا ہے وہاں قانون انصاف کے راستے میں اسی طرح ایک رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے جیسے ایک ضدی اور جاہل آدمی۔ قانون کے تحت جس حکمرانی کی وکالت وہ کرتے تھے، دوسرا بہترین حل تھا جو انسانی کمزوریوں کی وجہ سے ضروری ہو جاتا ہے۔ افلاطون نے The Laws میں قانون کی حکمرانی کا حکم ایک فیض رساں سرپرست گروہ (فلسفیانہ تعلیم رکھنے والے اور راست باز) کی حکمرانی کے متبادل کے طور پر دیا تھا جس کی تجویز اس نے (The Republic) میں پیش کی تھی۔ ارسطو قانون کی حکمرانی کی وکالت اس خطرہ کے پیش نظر کرتا ہے کہ جب اختیارات ایک فرد میں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو بدعنوانی اور اختیارات کا ناجائز استعمال شروع ہو جاتا ہے۔

اگرچہ افلاطون اور ارسطو قانون کی بالادستی کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں لیکن ان کی توجہ ایتھنز کے جمہوریت پسندوں سے اختلاف کی رو سے یکسر متصادم ہے جن کا ذکر ابتدا میں ہو چکا ہے اور خود وہ بھی قانون کی حکمرانی میں یقین رکھتے تھے۔ افلاطون اور ارسطو عوامی استبداد کو روکنے کے لیے سخت فکرمند تھے۔ اس کے برعکس ایتھنز کے جمہوریت پسند..... اس وقت کی مخصوص عوامی حکومت جس نے افلاطون اور ارسطو میں اضطراب پیدا کیا تھا۔ اس بات سے خوف زدہ تھے کہ حکومت اشرافیہ کے ہاتھ میں نہ آ جائے۔ ''تیس جابروں'' کے بدنام زمانہ دور میں وہ اذیتیں جھیل چکے تھے۔ ان کی حکومت سپارٹا نے اپنی فتح کے بعد قائم کی تھی (عدیدیہ حکومت کے ان ارکان نے ایتھنز پر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

404 سے 303 قبل مسیح تک فرمانروائی کی) ان غاصبوں میں سے ایک قریطیاس افلاطون کا چچا اور سقراط کا شاگرد تھا۔ (ایتھنز کے جمہوریت پسندوں کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ شہری بذات خود قانون کی بالادستی کے لیے براہِ راست اس میں شرکت کریں۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں خدشات کے درمیان پایا جانے والا تناؤ (قانون جمہوریت کو حدود و قیود میں رکھنے کے لیے ہو یا خود اختیاری حکومت کا نتیجہ ہو) آج تک تاریخ میں کم نہیں ہو سکا۔

قانون کی حکمرانی کے تحت ایتھنز کی حکومتوں کے دوران تمام شہری قانون کے سامنے برابر تھے۔ قوانین عمومی بنیادوں پر استوار تھے' کسی فرد کے خلاف نہیں۔ کونسل' مجسٹریٹس اور قانون ساز اسمبلیاں قانون کی پابند تھیں۔ شہری قوانین کی حدود و قیود میں رہتے ہوئے معمولات زندگی کے لیے آزاد تھے۔ اس طرح اہالیان ایتھنز نے قانون کے تحت ایک شکل کی آزادی حاصل کر لی تھی۔ یہ جدید اصطلاح کے مطابق شخصی آزادی نہیں تھی۔ ایک اعتبار سے وہ اس کے حامل نہیں تھے البتہ حکومت خود اختیاری کی آزادی میں شریک تھے اور وہ سب کچھ کرنے میں آزاد تھے جو قانون میں ممنوع نہیں تھا۔

رومن تصورات

قانون کی حکمرانی میں رومنوں کا کردار منفی اور مثبت دونوں طرح کا تھا۔ ان کے منفی پہلو کے نتائج نہایت سنگین رہے۔ سیسرو مثبت پہلو کا ذریعہ تھا۔ پہلی صدی قبل مسیح میں لکھی جانے والی The Republic میں وہ ایسے بادشاہ کی مذمت کرتا ہے جو قانون کی پاسداری نہیں کرتا اور مطلق العنان بن جاتا ہے۔ وہ اسے انتہائی متعفن اور نفرت انگیز مخلوق قرار دیتا ہے..... اس کا کہنا ہے ''ایسا شخص کس طرح ایک انسان کہلانے کا حقدار ہے جو ہر قانون و ضابطہ کو مسترد کرتا ہے جو اسے اس کے شہریوں کے ساتھ بلکہ تمام تر نوع انسانی کے ساتھ مہذب شراکت کار کا پابند بناتے ہیں۔ جولیس سیزر کے ہم عصر سیسرو کی یہ تحریر رومن جمہوریہ کے آخری دنوں کی ہے۔ اس کے بعد رومنوں میں شخصی حکومتوں کا دور شروع ہو گیا۔'' اب ہر شخص نے جان لیا ہے کہ جمہوریہ کی قانون کی حکمرانی اور نظام

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت کی جگہ طاقتور کی حکمرانی نے لے لی ہے۔ سیسرو کے The Laws میں قانون کی حکمرانی کے بارے میں درج ذیل پیرا توجہ طلب ہے۔

آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک مجسٹریٹ کا فرض منصبی ذمہ داری سنبھالنا اور ایسی ہدایات جاری کرنا ہے جو درست' مفید اور قوانین کے مطابق ہوں۔ جس طرح مجسٹریٹس قوانین کے تابع ہیں اسی طرح لوگ مجسٹریٹس کے تابع ہیں۔ درحقیقت یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ایک مجسٹریٹ قانون ناطق اور قانون ایک خاموش مجسٹریٹ ہوتا ہے۔

اس نے زور دیتے ہوئے کہا: ''یہ ہے قانون جو حکمرانی کرتا ہے' ناں کہ فرد جو مجسٹریٹ بن جاتا ہے۔ سیسرو پوری نکتہ رسی کے ساتھ موازنہ کرتا ہے کہ ایک بادشاہ کے تحت حکمرانی کیا ہوتی ہے جبکہ کسی مجموعہ قوانین کے تحت رہنا کیسا ہوتا ہے جو ایک آزاد کمیونٹی کے لیے مرتب کیا جاتا ہے۔''

سیسرو کے نزدیک قوانین کی بالاتر حیثیت قوانین فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ قانون فطرت عقل وشعور کا قانون ہے۔ عقل وشعور کے قانون کے مطابق قانون کو کمیونٹی کی بہتری کے لیے ہونا چاہیے۔ منصفانہ ہونا چاہیے اور اپنے شہریوں کی مسرت اور تحفظ کو محفوظ بنانے والا ہونا چاہیے۔ یہ قانون فطرت وضعی قانون پر استوار بلکہ حقیقت میں تمام انسانوں کے طرز عمل پر استوار ہوتا ہے۔ سیسرو کے مطابق یہی وجہ ہے کہ قانون کا مطلب انصاف اور بے انصافی کے درمیان ایک امتیازی خط کھینچنا اور تمام انتہائی قدیم اور انتہائی اہم چیزوں..... یعنی فطرت کی مطابقت تشکیل دینا ہے۔ نقصان دہ یا غیر منصفانہ ضوابط قانون کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ چنانچہ بالاتر قرار نہیں پائے۔ تاہم سیسرو غیر منصفانہ قوانین کی عدم اطاعت کی حمایت نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں اس کا ایمان تھا کہ صرف عقل مند ہی حقیقی قانون کو عقل دستور کی مطابقت میں پہچان سکتا ہے۔

سیسرو نے عوامی جمہوریت کی حمایت نہیں کی۔ اس کے برعکس وہ ایک مخلوط آئین کو ترجیح دیتا ہے جس میں اقتدار شاہی خاندان سرکردہ شہریوں اور معمولی حد تک عوام میں منقسم ہوتا ہے۔ بہترین (اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دانشمند) شہریوں کو وہ حکمرانی کے لیے زبردست اختیارات دینے کا حامی تھا کیونکہ اس کے نزدیک وہ ان قوانین فطرت کی ضروریات میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جنہیں معاشرے پر حکمرانی کرنا چاہیے۔

اگرچہ سیسرو کو ایک اہم نیچرل لاتھیورسٹ اور قانون کی حکمرانی کے اولین حامیوں میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے لیکن اس کی زیادہ تر تحریریں نشاۃ ثانیہ کی ابتدا تک گم ہو چکی تھیں۔ان میں The Republic کا مکمل متن بھی شامل ہے جو چھٹی صدی عیسوی تک ضائع ہو گیا تھا۔ یوں افلاطون اور ارسطو کی طرح وہ بھی قانون کی حکمرانی کی روایت میں نسبتاً کم براہِ راست اجداد میں سے ہے۔ البتہ ایک ایسی اتھارٹی ہے جس کا کام بعد کی سیاسی بحثوں کے سیاق وسباق میں شامل فہرست کیا گیا اور اس سے استفادہ کیا گیا۔سیسرو نے ایک کلیدی کام یہ کیا کہ افلاطون اور ارسطو کی صدائے بازگشت بنتے ہوئے زیادہ اصطلاحوں اور زوردار انداز میں اصرار کیا کہ قانون کو کمیونٹی کی بہتری اور منفعت کے لیے اور فطرت کی موافقت میں ہونا چاہیے۔سیسرو قانون کی بالادستی کو اس کی انصاف کے ساتھ وابستگی وہم آہنگی سے مشروط کرتا ہے۔

قانون کی حکمرانی کے حوالے سے رومنوں کا منفی کردار (Lex Regia) اور (Corpus Iuris Civilis) میں پایا جاتا ہے۔اس کے لیے تھوڑا سا تاریخی پس منظر پیش کرنا ضروری ہے۔رومن جمہوریہ' اشرافیہ کی اسمبلی کے ماتحت پانچویں صدی قبل مسیح سے 27 قبل مسیح تک قائم رہی۔ اس برس آگسٹس کی شہنشاہی شروع ہوگئی۔ آگسٹس کا دور حکومت 27 ق م سے 14 عیسوی تک رہا۔ بعد کی متعدد صدیوں میں رومن سلطنت بحر روم اور یورپ کے وسیع علاقہ تک پھیل گئی۔

کانسٹنٹائن (قسطنطین) 306 عیسوی میں سلطنت روما کا شہنشاہ بنا اور اس کے ساتھ ہی سلطنت کے مقدر میں ایک نیا موڑ آیا۔شہنشاہ نے آبائی مذہب چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لی اور پہلا عیسائی شہنشاہ بن گیا۔ اس نے ایک فرمان کے ذریعے سلطنت میں عیسائیت کے عقائد کی تبلیغ واشاعت کی اجازت دے دی۔کلیسائے باسلیق تعمیر کیے اور امور سلطنت کے ساتھ ساتھ مذہبی سرگرمیوں اور فیصلہ سازی میں نمایاں حصہ لینا شروع کر دیا۔شہنشاہ قسطنطین اپنی طرز کا بشپ تھا۔اس نے سیکولر اور مذہبی لیڈرشپ کو اس طرح مخلوط کیا کہ کئی صدیوں تک بادشاہ اس کی ہمسری کرنے کی کوشش کرتے رہے۔قسطنطین

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے دیگر دوررس اقدامات میں سے ایک سلطنت کا دارالحکومت مشرق میں لانا تھا۔(اس نے بازنطین کے پرانے شہر میں نیا دارالحکومت تعمیر کیا۔ جسے قسطنطنیہ (Constantinople) کہا گیا۔آج کل اسے استنبول کہا جاتا ہے۔رومن سلطنت کا زوال پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔روم پہ بعد کے برسوں میں جرمن قبائل کی مسلسل یلغار رہی۔قسطنطین نے متحدہ رومن سلطنت کی خواہش کرنے کی بجائے بازنطینی سلطنت کی بنیاد رکھی۔اس طرح سابقہ رومن سلطنت مغربی اور مشرقی حصوں میں تقسیم ہوگئی۔دونوں کے راستے اس طرح جدا ہوئے کہ پھر کبھی ایک نہ ہو سکے۔

اور اب Lex Regia کی بات ہو جائے۔ جمہوری حکومت سے شخصی حکومت کی طرف منتقلی کو قانونی جواز کی ضرورت تھی۔ Lex Regia یا قانون بادشاہت نے یہ خدمت سرانجام دے دی۔قانون بادشاہت کے مطابق روم کے عوام نے سلطنت کی بقا کے لیے واضح طور پر مطلق اختیارات شہنشاہ کو سونپ دیئے تھے لیکن قانون بادشاہت مکمل طور پر ایک افسانہ تھا۔ یہ قصہ ابتدائی رومن جیورسٹس (لیگل ایکسپرٹس) نے شہنشاہ کے اقتدار و اختیار کو جائز بنانے کے لیے گھڑا تھا۔اس افسانوی حیثیت نے بہرحال اپنی تاریخی اہمیت کو نہ چھپایا۔قرون وسطیٰ میں اور بعدازاں اس دغابازی کے اثرات کے تحت قانون بادشاہت کا سہارا جمہوریت پسند اور ملوکیت پسند دونوں ہی لیتے رہے۔ جمہوریت پسند اس لیے اسے استعمال کرتے رہے کہ یہ ابتدائی عوامی اقتدار اعلیٰ کا تصور پیش کرتا تھا جبکہ ملوکیت پسند اس لیے اس کا ذکر کرتے تھے کہ یہ کسی شہنشاہ کو قانون سے بالاتر حاکم مطلق بناتا تھا۔

شہنشاہ جسٹینین 527ء میں برسراقتدار آیا' جس کارنامے کے لیے اسے یاد کیا جاتا ہے وہ رومن قانون کی تدوین تھی۔اس کے حکم پر ماہرین قانون نے اس وقت کے بے ترتیب متمرد قوانین اور قانونی آرا کو اکٹھا اور منظم کیا۔ پانچ سال کے دوران ماہرین نے Codex تیار اور جاری کیا جس میں قوانین وضابطے تھے۔Digest بنایا جس میں قوانین کے تجزیوں پر مشتمل ماہرین قوانین کی تحریریں تھیں۔ Institutes مرتب کیا جس میں مذکورہ دونوں کتابوں سے اقتباسات درج تھے اور اسے قانون کی تعلیم دینے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والے سکولوں میں نصاب کے طور پر جاری کیا گیا۔ تینوں کتابوں کو مشترکہ طور پر Corpus Iuris Civlis (سول کوڈ) کہا گیا۔ تاہم اس کا معروف نام جسٹینین کوڈ ہی رہا۔ یہ زیادہ تر موجود روایات' ضابطوں اور ماہرین قانون کے فیصلوں اور تبصروں پر مشتمل تھا جنہیں از سرنو منظم' مرتب اور جامع شکل میں لایا گیا۔

اس کوڈ یا مجموعہ قوانین میں قانون کی حکمرانی کے حوالے سے دو ڈیکلریشن کچھ اس طرح تھے۔

1- جو بات بادشاہ کو خوش کرے وہ قانون کی قوت رکھتی ہے۔
2- بادشاہ قوانین کا پابند نہیں۔

(اولپین Ulpian) تیسری صدی کا معروف ماہر قانون ان ڈیکلریشنز کی حمایت میں LEX Regia کا حوالہ دیتا ہے۔ بعد میں اسے کوڈ میں شامل کر لیا گیا۔ اس وقت کے نکتہ ہائے نظر میں اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ شہنشاہ کو فیصلہ سازی کا اختیار حاصل ہو۔ لیکن جسٹینین نے اس اختیار کا استعمال کرتے ہوئے کوڈ جاری کیا اور پھر یہ تصور بھی نہیں پایا جاتا تھا کہ شہنشاہ قوانین سے بالاتر ہے اور اس لیے کہ وہ قوانین بناتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ تفہیم قانون کے حکمرانی کے تصور ہی سے متصادم ہے۔ یہ کوڈ مشرقی سلطنت روما میں نافذ العمل تھا لیکن مغربی سلطنت میں نظر انداز کر دیا گیا یہاں تک کہ بارہویں صدی میں اسے پھر سے تلاش کر کے نافذ کیا گیا۔ لیکن اس دوران مطلق العنان بادشاہوں کا قانون سے بالاتر ہونے کا عقیدہ کوڈ سے باہر رہ کر نشوونما پاتا رہا اور مغرب پہ اثر انداز ہوا اور پھر کوڈ کے دوبارہ منظر عام پہ آنے پر مغرب پھلا پھولا اور قرون وسطیٰ میں اور بعد کے برسوں میں مسلمہ اصول بن گیا۔

شہنشاہ کے اختیارات بمقابلہ قانون کی مکمل تصویر بہرحال ان ڈیکلریشنز میں دکھائی گئی تصویر سے زیادہ مختلف ہے۔ شہنشاہ جن کی قانون سازی زیادہ تر ان فرامین اور احکامات پر مشتمل ہوتی تھی جو ماہرین قانون تیار کرتے تھے۔ خود وہ اس قانون سازی میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ کوڈ میں دوبارہ شامل کیے گئے بیشتر قوانین' ماہرین قوانین کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سابقہ تحریروں سے لیے گئے تھے۔ علاوہ ازیں عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ شہنشاہ جب خود اپنے قانون سازی کے اختیار کو استعمال نہیں کرتا تو قانونی روایت کا سہارا لیتا ہے حالانکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق قانون میں ترمیم کا اختیار رکھتا ہے۔ شہنشاہ کے ہر اقدام کو قانونی اقدام نہیں سمجھا جاتا تھا اور عمومی قوانین کی خلاف ورزیوں کی بے قاعدہ سرگرمیوں کو ناپسند کیا جاتا تھا (ذہن میں رہے کہ شہنشاہ کسی قانونی ادارے کو جوابدہ نہیں تھا)۔ یہاں تک کہ جب شہنشاہ کسی قانون کو تبدیل کرنے کے لیے اپنے اختیارات استعمال کرتا..... تو اولپین نے ایک مختلف تناظر میں لکھا ہے کہ اگر وہ قانون ایک طویل عرصہ سے منصفانہ سمجھا جا رہا تھا تو اس کو تبدیل کرنے کے لیے مناسب وجوہات کا موجود ہونا ضروری قرار دیا جاتا۔ اس بات کی عکاسی کرنے والی ایک الگ قانونی دفعہ کوڈ میں اصرار کرتی ہے..... کسی حکمران کے جاہ وجلال کی شان یہ ہے کہ وہ خود کو قوانین کا پابند تسلیم کرے۔

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ شہنشاہ کی قانون کے لیے مطلق العنانی شتر بے مہار جیسی نہیں تھی۔ شہنشاہ خیال کی حد تک تو قانون سے بالاتر ہوتا تھا اور عوام الناس بھی یہی سمجھتے تھے لیکن عملاً قانون کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ امتزاج یعنی قانون سازی کے اختیارات رکھنا اور قانون کا پابند ہونا یقیناً اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے اگر قانون کی حکمرانی کو کام کرنے دیا جائے۔ جدید قانونی نظام بھی اسی تناؤ کے شکار ہیں۔ کہ مقتدر اعلیٰ قانون کا منبع اور قانون کا ماتحت دونوں حیثیتیں رکھتا ہے۔ ہر کامیاب انتظام میں ایک اخلاقیات موجود ہوتی ہے کہ اچھا بادشاہ' اچھا قانون ساز اور قانون کا پابند ہوتا ہے۔

❖ .... ❖ .... ❖

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

2

قرونِ وسطیٰ کی جڑیں

قانون کی حکمرانی کی روایت نہایت سست رفتار کے ساتھ کسی منصوبہ بندی کے بغیر وجود میں آئی اور قرونِ وسطیٰ میں شروع ہوئی۔ اس کا نہ تو کوئی اکلوتا ذریعہ تھا اور نہ ابتدائی نکتہ۔ تین ذرائع نے اسے جنم لینے میں مدد دی۔ چنانچہ ان کا ذکر تفصیل سے کیا جائے گا۔ سب سے پہلے بادشاہ اور پوپ کے درمیان بالادستی کی کشاکش، دوسرے جرمن روایتی قانون اور تیسرے میگنا کارٹا، جس نے فرمانرواؤں پہ قانون کے ذریعے پابندیاں عائد کرنے کی اشرافیہ کی کوششوں کو مؤثر کر دیا۔ لیکن ان ذرائع پہ گفتگو کرنے سے پہلے تاریخی سیاق وسباق کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

مؤرخین میں اس بات پہ اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے کہ مغرب کا قرونِ وسطیٰ کا دور 1000 سال پہ محیط ہے۔ اس کا آغاز پانچویں صدی عیسوی میں رومن سلطنت کے انہدام کے ساتھ ہوا اور پندرہویں اور سولہویں صدی میں نشاۃ ثانیہ کے ساتھ اس کا اختتام ہوا۔

اس کی ابتدائی صدیوں کو تاریک دور کہا جاتا ہے۔ جب شہنشاہ قسطنطین نے رومی سلطنت کا دارالحکومت مشرق میں قسطنطنیہ میں منتقل کیا تو سلطنت کا مغربی حصہ ایک طویل انحطاط اور زوال کی طرف لڑھک گیا۔ اس زوال کو شدت جرمن قبائل کے پے در

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پے حملوں نے دی۔ جرمن قبیلے جاہل اور وحشی اور اس شائستہ یونانی-رومی تہذیب کا الٹ تھے جس کو انہوں نے تاخت وتاراج کیا۔ ان جرمن قبائل گاتھ' وسی گاتھ' آسٹروگاتھ اور وینڈلز کو چوتھی صدی عیسوی کے آخر اور پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایشیا (منگولیا) سے آنے والے جنگجوؤں نے اپنے علاقوں سے نکال کر رومی سلطنت میں دھکیلا تھا۔ ان وحشی قبائل نے کئی مرتبہ روم کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ چنانچہ ماضی کا عظیم الشان روم اب کھنڈر بن گیا اور اب وہاں کی آبادی محدود ہو کر رہ گئی۔ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیروکار عرب سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ کا بہت سا علاقہ' تمام تر شمالی افریقہ اور آئبیرین جزیرہ نما (موجودہ سپین) پر قبضہ کرنے کے بعد جنوبی فرانس تک اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ چنانچہ بحر روم کے علاقہ میں نشوونما پاتی ہوئی تجارت کے راستے بند ہو گئے۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں ناروے کے وائی کنگز کو عروج حاصل ہوا۔ وہ یورپ کے جہاز رانی کے قابل دریاؤں میں اور بڑے سمندروں کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے غارت گری کرتے اور جو کچھ اٹھا سکتے تھے اٹھا لے جاتے۔ دسویں صدی عیسوی میں مشرقی یورپ کی سرحدوں سے ہنگری کے باسی مگیاروں کو بھی خطرات نے گھیر لیا۔

قرون وسطیٰ کا مغربی معاشرہ محصور ہو کر رہ گیا۔ منتشر دیہی آبادی اپنی معاش کے لیے کاشتکاری اور محدود دسی تجارت پر اکتفا کرنے پہ مجبور ہو گئی۔ شہر چھوٹے چھوٹے اور قلیل آبادی پر مشتمل تھے۔ انہیں باہم متصل تعمیر کیا جاتا یا ہر شہر کے گرد فصیل بنا دی جاتی تاکہ لوٹ مار کرنے والے گروہوں' مضافاتی علاقوں کے سرداروں یا غیر ملکی حملہ آوروں سے محفوظ رکھا جا سکے۔ شہروں میں ہی چرچ پائے جاتے تھے۔ شہروں میں ہی کبھی کبھار اجتماعات ہوتے اور شہر ہی ہنرمندوں اور چھوٹی چھوٹی مارکیٹوں کے مقام تھے۔ زیادہ تر لوگوں کی زندگیاں اپنے محدود سے پیدائشی علاقے میں ہی گزرتی تھیں۔ سفر غیر محفوظ اور دشوار گزار تھے۔ ہر وقت رہزنوں کا خطرہ رہتا تھا۔ سڑکیں اور پل مرمت نہ ہونے کے سبب منہدم ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں شہروں کے دروازوں' پلوں' بندرگاہوں اور سڑکوں پر جابجا محصول چونگیوں پہ ادائیگی سفر کو مزید مہنگا اور ناقابل برداشت بنا دیتی تھی۔ چنانچہ سخت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جان راہب اور تاجر ہی سفر کا حوصلہ رکھتے تھے۔ گشتی تاجر اور ان کے علاقائی میلے جو رومی سلطنت کے دور میں ایک معمول تھے اب ناپید تھے۔ سکہ رائج الوقت اب ملاوٹ والی چاندی تھی اور اسے بھی محدود پیمانے پر ڈھالا جاتا تھا۔ جاگیرداروں کے قوانین اور مقامی روایتی قواعد وضوابط کہیں رومن قوانین اور پادریوں کے قوانین کے ساتھ اختلاط میں رائج تھے اور کہیں شاذ و نادر نافذ العمل تھے۔ مقامی سردار (جاگیردار) یا طاقتور بشپ اپنی اپنی علاقائی اور کلیسیائی عدالتوں کے بالترتیب سربراہ تھے۔ رومن دور کی طرح اب پیشہ ور ماہرین قانون نہیں پائے جاتے تھے۔ چرچ کے باہر تعلیم وتدریس نہ ہونے کے برابر تھی۔

جاگیرداری نظام نویں اور دسویں صدی عیسوی میں وجود میں آیا۔ زمین اور مزارع ہی دستیاب ذرائع تھے لیکن ان دونوں کے لیے فعال مارکیٹ بہت چھوٹی تھی۔ ایک سنگین قسم کا سماجی نظام وجود میں آیا جو زمیندار اور زمین پہ کام کرنے والوں کے درمیان پیچیدہ سے تعلق کے گرد گھومتا تھا۔ جاگیردارانہ معاشرہ زمینداروں' اشراف' پادریوں اور کمیروں یا زرعی مزدوروں پر مشتمل تھا۔ ہر طبقہ کے بارے میں طے تھا کہ اسے معاشرے میں ایک مخصوص کردار ادا کرنا ہے۔ اشرافیہ اور اس کے منصب دار (نائٹس) زرعی املاک واراضی کے مالک تھے' جس کی تقسیم اور تخصیص مختلف طریقوں سے ہوتی تھی۔ ذیلی تقسیم کے تحت اراضی ماتحت منصب داروں کی تحویل میں دی جاتی اور اس طرح ایک کثیر سطحی نیٹ ورک پر مشتمل باہمی تعلقات کا نظام تخلیق ہو چکا تھا۔ سرکردہ نواب کی مرکزیت کے ساتھ ایک نظام مراتب تھا جس میں خدمات (عسکری اور غیر عسکری) یا خراج (پیداوار یا لگان) کی ادائیگی سب سے نچلا طبقہ اپنے مقامی عہدیدار کو زمین کے استعمال یا تحویل کے بدلے میں کرتا تھا۔ کچھ اراضی زمیندار اپنے پاس رکھتے۔ جہاں ان کے مزارع کاشتکاری کرتے۔ بقیہ اراضی منصب داروں میں تقسیم کر دی جاتی جو دیگر لوازمات کے علاوہ ضرورت پڑنے پر مسلح سپاہی مہیا کرنے کے بھی پابند ہوتے تھے۔ اگرچہ جاگیرداروں اور ان کے منصب داروں کو اپنے کمیروں پہ وسیع تر اختیارات حاصل تھے لیکن وہ ان کے حوالے سے مختلف ذمہ داریاں بھی رکھتے تھے جن میں بنیادی ذمہ داری انہیں بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنا۔ ان کے تنازعات طے کرنے اور قحط اور آفات کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وقت ان کی مدد کرنا وغیرہ شامل تھا۔ پادری یعنی معاشرے کے روحانی رہنما ایک جیسے نہیں تھے۔ کچھ لاطینی تعلیم سے بہرہ مند اور اشرافیہ کی اولاد تھے جن کے پاس وسیع تر جاگیریں یا خانقاہوں کی ملکیتی اراضی اور جائیدادیں تھیں۔ ان املاک میں کمیرے بھی شامل ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ چرچ کو تحائف یا وصیتی ترکہ میں ملتا تھا۔ مذہبی عہدیدار بشپ درحقیقت پیرز (جاگیردار) ہوتے تھے۔ وہ مذہبی امور کے علاوہ اپنے قصبوں اور شہروں کے اعلیٰ سطحی امور پہ بھی حرف آخر ہوتے تھے۔ ان کی عدالتوں کا حلقہ اثر اور اختیار وسیع تر ہوتا تھا۔ لیکن دیگر مذہبی رہنما' مقامی پادری عموماً کسانوں میں سے ہوتے۔ وہ لاطینی زبان ہکلا کر اور رک رک کر بولتے تھے کیونکہ مقامی زبانیں بازاری اور غیر علمی سمجھی جاتی تھیں اور مذہبی رہنماؤں کے لیے یہ زبانیں استعمال کرنا' نازیبا تھا۔ وہ بیچارے خستہ حال گرجاؤں کو سنبھالتے تھے۔ انہیں گرجا سے وابستہ اراضی پہ بھی کام کرنا ہوتا تھا تاکہ اپنی معاش کا انتظام کر سکیں۔ کمیرے کھیتوں میں سارا سال کام کرتے اور پابند رہتے۔ انہیں کہیں اور جانے کی آزادی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ وہ جاگیردار آقاؤں کے تابع مہمل ہوتے اور صرف منقولہ املاک رکھ سکتے تھے۔ کوئی بڑی منڈی نہ ہونے کی وجہ سے زرعی اجناس کی پیداوار کے لیے بھی کوئی محرک موجود نہیں تھا اور پھر ایسی ٹیکنالوجی بھی میسر نہیں تھی کہ اضافی پیداوار حاصل کی جا سکے۔ اپنی حالت زار کے خاتمہ اور بہتری کے لیے ان کے پاس نہ وسائل تھے اور نہ ذرائع۔ جاگیرداری نظام حفظ مراتب میں جکڑا ہوا اور جامد تھا۔ اس دور میں شہروں کی آبادی نسبتاً آزاد تھی لیکن شہر چھوٹے چھوٹے اور قلیل مقدار میں تھے۔

بادشاہ اور سلاطین بھی جاگیردار ہوتے تھے۔ ان کی ذاتی وسیع و عریض زمینیں اور زرعی املاک ان کی دولت کا ذریعہ تھیں۔ ان کا کنٹرول مخصوص علاقوں تک محدود رہتا۔ اپنے امرا و نوابوں پر بھی ان کا اختیار معمولی سا تھا اور یہ امرا ان کے ماتحت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے حریف بھی ہوتے تھے۔ کسی طرح کا منظم حکومتی ڈھانچہ اور متحدہ درباری نظام بھی نہیں تھا۔ شارلیمان مغرب کا آخری طاقتور شہنشاہ تھا۔ اس کا دور حکومت 814 عیسوی میں ختم ہوا۔ اس کے مرنے پر فرانکی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ گیارہویں بلکہ بارہویں صدی عیسوی تک ایسا ریاستی نظام مرتب نہ ہوا جس میں عدالتیں وجود میں آتیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ٹیکسوں کی وصولی کا مؤثر انتظام قائم ہوتا جس کو قانون کی تعلیم رکھنے والے افراد چلاتے اور بادشاہوں کی ملازمت میں آتے۔ قرون وسطیٰ کے دوران صرف رومن کیتھولک چرچ ہی کسی منظم ادارے کی مشابہت میں مغربی یورپ میں موجود تھا۔

اس دوران مشرقی رومن سلطنت مسلسل علم اور قدامت کے تحفظ کا مقام بنی رہی۔ اگرچہ اس کی شان و شوکت کم ہو رہی تھی لیکن اپنا اقتدار یونان' سربیا' مقدونیہ' بلغاریہ' اٹلی کے کچھ حصوں اور مشرق وسطیٰ تک قائم رکھنے میں کامیاب تھی۔ البتہ وہ مغرب سے تیزی کے ساتھ لاتعلق ہو رہی تھی۔ لاطینی زبان کی جگہ یونانی زبان کو اپنا لیا گیا تھا۔ تاریخ میں بازنطینی سلطنت کے نام سے موسوم یہ سلطنت یونانیت کی مقلد اور مشرقی ہو چکی تھی۔ حالانکہ اس کے شہنشاہ اب بھی مغرب کی طرف دوبارہ اتحاد کی خواہش سے دیکھتے اور اسے مشرقی سلطنت کے ماتحت لانا چاہتے تھے۔ یہ خواہش جزوی اور عارضی طور پر شہنشاہ جسٹینین کے دور میں پوری بھی ہوئی۔ مشرقی سلطنت کے لیے زیادہ تشویش کا باعث جنوب سے مسلمانوں کے حملے تھے۔ متعدد مرتبہ عربوں' ایرانیوں اور ترکوں نے بلغار کی جس کے نتیجہ میں انجام کار رومی سلطنت زمین بوس ہوگئی۔ لیکن اس سے پہلے شمال اور مشرق سے بلغار' روسی اور منگول جبکہ مغرب سے نام نہاد مسیحی اتحادی اور (غارت گر) صلیبی مجاہدین ارض مقدس کو آزاد کرانے کے مشن پہ جاتے ہوئے قسطنطنیہ سے گزرتے اور راستے میں غارت گری کرتے۔ اگرچہ رومن پوپ اور جرمانی بادشاہ جو مغربی یورپ پہ حکمرانی کرتے تھے' صدیوں سے بازنطینی شہنشاؤں کو پوری رومن سلطنت کا رسمی سربراہ تسلیم کرتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن اب ان کے تعلقات معاندانہ ہو چکے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو قسطنطنیہ کی طرف سے روم پر قبضہ کرنے کے عزائم اور دوسرے ان شہنشاؤں کی طرف سے بطریق (Patriarchs) کا تقرر تھا۔ یہ بطریق' اسقف اعظم سے اوپر کے درجہ کے سردار کلیسا ہوتے تھے۔ بازنطینی شہنشاہ ان کے ذریعے مذہبی امور میں اپنے فیصلے نافذ کرتے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پہلی دراڑ پڑی جب بت شکنی کا تنازعہ پیدا ہوا۔ پوپ نے شہنشاہ کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ بت پرستی سے بچنے کے لیے مسیحی اولیا کی مورتیاں اور بت توڑ دیے جائیں۔ اختیار و اقتدار کی اس طویل کشمکش کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختتام گیارہویں صدی میں ہوا اور مشرقی آرتھوڈوکس چرچ اور رومن کیتھولک چرچ باضابطہ اور مستقل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

ہمارے موضوع کا تعلق بنیادی طور پر مغرب سے ہے کیونکہ قانون کی حکمرانی کی روایت نے وہیں جڑیں پکڑیں۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے' کلاسیکل تصورات (یونانی فلاسفی اور رومن ضابطے) قرون وسطیٰ کے پہلے نصف میں مغرب میں ناپید ہو چکے تھے۔ البتہ بچے کھچے رومن قوانین جاری تھے۔ ارسطو کے کام (اسے مسلمانوں نے محفوظ کر رکھا تھا) اور جسٹینین کوڈ کی بازیافت بارہویں اور تیرہویں صدی میں ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مغرب میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد میں اضافہ ہم زمانہ واقعات ثابت ہوئے۔ یونیورسٹی آف بولوگنا (قانون کی تعلیم کے لیے) اور یونیورسٹی آف پیرس قائم ہو چکی تھیں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے علاوہ متعدد دیگر یونیورسٹیوں کا آغاز بھی ہو رہا تھا۔ یورپ بھر سے طالب علم' علم و دانش کے ان مراکز کی طرف امڈے چلے آ رہے تھے۔ وہ نصاب پڑھتے اس پر بحث کرتے۔ مذہب' سائنس' اخلاقیات' فلاسفی اور قانون کے نظریات کو زیر بحث لاتے۔ قانون کے علاوہ بقیہ تمام مضامین ابھی الگ حیثیت میں نہیں پڑھائے جاتے تھے۔ تجارتی سرگرمیوں کو نئے میدان ملے۔ طویل تاریک اونگھ کے بعد یورپ کی بیداری کے یہ اولین مراحل تھے۔ اس بیداری نے ایک ایسے ماحول میں آگے بڑھنے کی جدوجہد اختیار کر لی جو کیتھولک آرتھوڈکسی سے لبریز تھا جس میں تجارت کو برا سمجھا جاتا تھا' قرضوں پہ سود کی ممانعت تھی اور چرچ کی غیر مشروط اطاعت پر زور دیا جاتا تھا جبکہ چرچ ایسا ادارہ تھا جو اندھی عقیدت پر زور دیتا اور عقل و شعور کو خطرہ سمجھتا تھا۔

ارسطو (ایک کافر) کو تھامس ایکناس نے چرچ کے لیے قابل قبول بنایا۔ اس نے عقل و شعور اور چرچ کے عقائد کے درمیان ہم آہنگی ثابت کی۔ ایکناس نے مغرب کے قانونی نقطۂ نظر بالخصوص فطرت کے قوانین کے حوالے سے زبردست اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس نے تیرہویں صدی کے اپنے عظیم کام (Summa Theologia) میں ججوں کے بارے میں ارسطو کے نقطۂ نظر کی بازگشت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ججوں کو قانون کی حکمرانی میں رہنا چاہیے۔ انہیں فیصلے اپنی مرضی سے نہیں قانون کے مطابق کرنا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہئیں۔ جو لوگ ایسی باتوں کا انصاف کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں جن کے لیے وہ محبت' نفرت یا کسی قسم کا لالچ رکھتے ہیں تو وہ اپنے انصاف کو بے راہ رو کر دیتے ہیں۔ ارسطو کی طرح ایکناس نے زور دیا کہ قانون کی بنیاد معقولیت پر ہوتی ہے چنانچہ اس کی سمت عمومی بہتری اور اچھائی (خیر) کی طرف ہونا چاہیے۔ ایکناس قرار دیتا ہے کہ ایک غیر منصفانہ وضعی قانون..... مطلقاً کوئی قانون نہیں ہوتا۔ چنانچہ وضعی قانون کو الوہی اور فطرت کے قانون کے ماتحت ہونا چاہیے۔ تاہم ایکناس تسلیم کرتا ہے کہ یہ بات منطقی طور پر مقتدر اعلیٰ کے لیے ناممکن تھی کہ وضعی قانون کے تحت خود کو محدود اور پابند کرتا۔ ''مقتدر اعلیٰ کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ قانون سے مستثنیٰ ہے' کیونکہ سیدھی سی بات ہے کہ کوئی انسان خود پہ جبر نہیں کرتا اور قانون کے پاس کوئی ایسی جابرانہ قوت مقتدر اعلیٰ کے اختیار سے تحفظ کے لیے نہیں ہوتی۔ چنانچہ مقتدر اعلیٰ مبینہ طور پر قانون سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ کوئی اسے سزا نہیں دے سکتا اگر وہ قانون کے خلاف اقدام کرتا ہے۔ ایکناس مزید کہتا ہے کہ یقیناً مقتدر اعلیٰ اپنی مرضی سے خود کو قانون کے تابع کر سکتا ہے اور ایسا ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ جو قانون کوئی انسان دوسرے کے لیے بناتا ہے اسے خود بھی اس کا پابند ہونا چاہیے اور آخر میں اس کا کہنا ہے کہ مقتدر اعلیٰ اگر قانون کی جابرانہ قوت سے آزاد ہے تو خدا کی نظر میں وضعی قانون کے تحت حدود و قیود میں ہے اور الوہی قانون اور فطرت کے قانون کا غلام ہے جس پر خدا کی طرف سے پابندیاں عائد ہیں۔

اس پس منظر میں ہم اب قرون وسطیٰ کے دوران قانون کی حکمرانی کی روایت کے لیے تین اہم مراحل کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔

پوپ بمقابلہ بادشاہ

مذہبی بادشاہت کا تصور سب سے پہلے شہنشاہ قسطنطین نے پیش کیا۔ جس کے نتیجہ میں پوپ اور بادشاہ کے درمیان کشاکش ناگزیر تھی۔ لیکن (Gelasian Doctrine) پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں وضع کیا گیا۔ یہ اصول باقاعدہ قرار دیتا تھا کہ سیکولر اور مذہبی حکام کو اپنے اپنے میدان میں بالادستی حاصل ہے۔ چنانچہ تنازعہ دبانے میں دونوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فریقوں کو مدد مل گئی۔ لیکن جسٹینین نے یہ اصول مسترد کر دیا۔ بعد کے بادشاہوں اور شہنشاہوں نے بھی ایسا کیا اور مذہبی امور پہ بھی اپنی حاکمیت کا دعویٰ اس بنیاد پر کیا کہ وہ مامور من اللہ ہوتے ہیں۔ جب خدا انہیں یہ مرتبہ و حیثیت دیتا ہے تو انسان اس پر کس طرح پابندی عائد کر سکتے ہیں۔ اس کے ردعمل میں پوپ نے خود کو دنیاوی رہنماؤں کا حاکم اعلیٰ قرار دے دیا۔ مادی امور پر روحانی برتری کا منطقی استدلال یہی تھا۔

شہنشاہ بہت سے مذہبی امور سرانجام دیتے تھے جن میں بشپ اور چرچ کے دیگر منصب دار اور اہلکاروں کا تقرر اور برطرفی' کلیسیائی کونسلوں کا اجلاس طلب کرنا اور ان میں شرکت کرنا تاکہ مذہبی مسائل حل کرنے کے ساتھ ساتھ چرچ کے قوانین اور پالیسیوں سے متعلقہ امور کا تعین۔ بہت سے پوپ شہنشاہوں کی توثیق سے منتخب ہوتے یا کونسل میں نشست حاصل کرتے تھے۔ جسٹینین خود کو عظیم تر دنیاوی اور روحانی قوت سمجھتا تھا۔ شاہی اور پروہتی اختیارات کا امتزاج شہنشاہوں کی یکتا حیثیت کا امتیازی نشان بن گیا۔ شہنشاہ کے قوانین' فرامین اور احکامات کو الوہی قوانین' فرامین اور احکامات قرار دیا جاتا تھا جن کا علم لوگوں کو شہنشاہ کے ذریعے ہوتا تھا۔ قوانین محض شہنشاہ کی مرضی نہیں خدائی منشا سمجھے جاتے تھے جو انہیں تقدیس کا درجہ عطا کرتی تھی۔ جسٹینین نے اعلان کیا تھا کہ..... قوانین ہماری مقدس زبان سے جنم لیتے ہیں۔ چنانچہ قانون ایک الوہی حکم یا فرمان الٰہی تھا۔ شارلیمان کا کہنا تھا کہ..... وہ خدا اور باپ' بادشاہ اور پروہت اور تمام عیسائیوں کا سردار اور رہنما ہے۔ اس نے پوپ لیوسوم کے لیے پاپائیت کی حدود و قیود مقرر کر دیں۔ وہ چرچ کے عقائد و نظریات کے حوالے سے بھی پوپ کو ہدایات دیا کرتا تھا۔ رومن مطلق العنانی میں اب ایک مذہبی عنصر بھی شامل ہو گیا تھا جس نے شہنشاہ کو خدا کے سوا کسی کے سامنے جوابدہ نہ رہنے دیا۔ یقیناً عوام کے سامنے تو نہیں۔ مغربی بادشاہ اور سلاطین' شہنشاہ کے خطاب کے بغیر ہی الوہی اختیار کے مالک بن بیٹھے اور اپنے اپنے علاقوں میں بشپ کے تقرر اور ٹیکسوں کے نفاذ کے اختیارات استعمال کرنے لگے۔

رومن پوپ بھی مذہبی اور دنیاوی دونوں میدانوں میں اپنے وسیع تر اختیارات استعمال کر رہے تھے۔ ان کا پہلا ہدف پورے کلیسا میں سربراہ کی حیثیت سے استحکام

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل کرنا تھا۔ وہ اپنی برتری کا دعویٰ اس بنیاد پر کرتے تھے کہ وہ سینٹ پیٹر کے جانشین ہیں۔ پوپ بھی اپنے استحقاق میں بادشاہ تھے کیونکہ وہ روم میں دنیاوی سربراہ کا خلا پورا کر رہے تھے اور پاپائی ریاستوں کی جغرافیائی سرحدوں میں حکمران تھے۔ ان کی شاہانہ حیثیت تسلیم کرتے ہوئے ان کے لیے Princep کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی جو شہنشاہ اور بادشاہ کے لیے وقف تھی۔

رومن قانون کو قرون وسطیٰ کے دوران روم میں مسلسل اہمیت حاصل رہی۔ وہ چرچ کے شرعی قانون اور ادارہ کے کلچر پہ بھی اثر انداز ہوا۔ اس نے بہت سے پوپ بھی اپنے رنگ میں رنگ دیئے جو مطلق العنان بادشاہوں کا طرز عمل اختیار کر گئے۔ ان میں سے متعدد قانون کی تربیت رکھتے تھے۔ چرچ نے روم کے شاہی کلچر کے آمرانہ اوصاف اور عدالتی اختیارات اپنا لیے۔ اب وہ ایک سخت قسم کا نظام مراتب رکھتا تھا جو چوٹی سے جاری ہونے والی ہدایات کا پابند تھا۔

نڈر پوپ کلیسا کی سربراہی سے آگے نکل گئے۔ اب وہ بادشاہوں اور شہنشاہوں پر بالادستی کا اصرار کرنے لگے۔ ان کا استدلال تھا کہ روحانی سلطنت کو دنیاوی سلطنت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ پوپ گریگوری VII نے 1073ء میں Dictatus Papae جاری کرتے ہوئے اعلان کیا کہ پاپائی حاکمیت ہی اکلوتی' عالمی اور مکمل ہے جبکہ بقیہ تمام تر دنیاوی اقتدار و اختیار چاہے وہ شہنشاہ کی صورت میں ہوں' بادشاہ کی صورت میں یا بشپ کی صورت میں جزوی اور دست نگر ہیں۔ الوہی قوانین اور قوانین فطرت جن کے ارضی نمائندے اور مفسر پوپ ہیں' وضعی قوانین کو کنٹرول کرتے اور (خدا کی منشا کے مطابق) بادشاہوں پہ بھی نافذ العمل ہیں۔ بالادستی کے اس دعویٰ کے لیے ایک اور مخصوص بنیاد کو Donation of Constantine کہا جاتا ہے۔ یہ آٹھویں صدی کی جعل سازی تھی۔ اس کے مطابق شہنشاہ قسطنطین جذام کے مہلک مرض میں مبتلا تھا۔ روم کے بشپ سیلویسٹر کی دعا سے وہ صحت مند ہو گیا۔ ممنون شہنشاہ نے اسے کلیسا کا سربراہ یعنی پوپ بنا دیا اور نئے دارالحکومت قسطنطنیہ منتقل ہونے سے پہلے پوپ سیلویسٹر کے حق میں تاج و تخت سے دستبردار ہو گیا تھا۔ لیکن پوپ نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے تاج

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شہنشاہ کو واپس کر دیا۔ اس دلچسپ کہانی کے پیچھے موجود عقیدہ بہت انقلابی تھا..... پوپ تمام حکمرانوں سے برتر ہے' یہاں تک کہ رومن شہنشاہ سے بھی جس کا تاج وتخت پوپ کا مرہون منت ہے اور اسے پاپائی فرمان سے معزول کیا جا سکتا ہے۔

پوپ کی طرف سے مطلق اختیار و اقتدار کی خواہش محدود عسکری قوت کے استعمال سے پھوٹی تھی۔ اور یہ خواہش قرون وسطیٰ کے ان دنوں میں غیر معقول نہیں تھی جب مغرب کی مقدس رومن سلطنت صرف مسیحیت کی وجہ سے متحد تھی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ قرون وسطیٰ کے معاشرہ میں چرچ سب پر حاوی تھا۔ ان میں شہنشاہ اور بادشاہ بھی شامل تھے۔ البتہ کافر اس کے حلقہ اثر سے باہر تھے۔ اس دور میں سارا یورپ مسیحی ایمان سے لبریز تھا۔ مقامی سطح پر بشپ بہت سے شہروں اور قصبوں میں حاکم اعلیٰ تھے۔ معاشرہ پوری طرح مسیحی تھا اور مذہبی اور دنیاوی حلقوں کو الگ الگ کرنے والی کوئی حد بندی نہیں تھی۔

من گھڑت Donation کے قصہ نے سیاسی امور میں فوراً اپنا کردار ادا کیا۔ پیپن (Pepin) کو میروونگین خاندان سے اقتدار لینے کے لیے قانونی جواز کی ضرورت تھی۔ یہ خاندان اب تک فرانک سلطنت پر حکمرانی کرتا آیا تھا۔ پوپ نے پیپن کی طرف سے درخواست قبول کر لی کہ چرچ اس کے تخت وتاج کے دعوے کی توثیق کر دے۔ پوپ نے اپنے نمائندے کے ذریعے پیپن کو مقدس تیل سے بپتسمہ دے دیا۔ جواب میں پیپن نے کھلے بندوں Donation کے واقعہ کو درست قرار دیا اور پاپائیت کے جائز اختیارات وحاکمیت کا اعتراف کیا۔ یہ سب کچھ باہمی مفادات کے تحفظ کا ایک انتظام تھا جس نے ایک دوسرے کو قانونی جواز فراہم کر دیا۔

لیکن پیپن کے بیٹے شارلیمان کی تاج پوشی کے وقت صورت حال مختلف تھی۔ شارلیمان ایک طاقتور حکمران تھا جس نے ایک فاتح کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا۔ اس کے مقابلہ میں برسر اقتدار پوپ لیو III کمزور پوزیشن میں تھا جسے حال ہی میں ایک رومن ہجوم نے پیٹا تھا اور اب وہ اپنا وقار بحال کرنے کے لیے پُرعزم تھا۔

800ء کے کرسمس کے دن جب شارلیمان سینٹ پیٹر کے گرجا میں دعا کے بعد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھڑا ہوا تو پوپ لیو نے اچانک بادشاہ کے سر پر تاج رکھ دیا۔ رومن پادری اور عوام جو پہلے سے تیار اور ریہرسل کر چکے تھے' زور سے چلائے۔ چارلس آگسٹس نے رومنوں کے عظیم اور امن بخش شہنشاہ کی تاج پوشی کی۔ وہ زندہ اور فتح یاب رہے۔ شارلیمان اس قدر برہم اور جھنجھلاہٹ کا شکار تھا کہ آئین ہارڈ کے مطابق .....اس نے کہا کہ اتنی اہم مذہبی تقریب کے باوجود وہ اس روز کبھی گرجا میں نہ جاتا اگر اسے پوپ کے ارادے کا علم ہوتا۔

شارلیمان پوپ کی طرف سے تاجپوشی کے آئینی مضمرات کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور لوگوں کو اپنے بارے میں بشپ آف روم کا ممنون اور دست نگر ہونے کا تاثر نہیں دینا چاہتا تھا۔ شارلیمان کی اس بصیرت کی تصدیق گیارہویں صدی کے اواخر میں ابھرنے والے ڈرامائی تنازعہ سے ہوتی ہے۔ اپنے وقت کے انتہائی طاقتور فرمانروا ہنری IV نے اپنی سلطنت میں سرکردہ مذہبی رہنماؤں کے تقرر کے روایتی استحقاق پر زور دیا۔ یہ اقدام پوپ گریگوری VII کے مذکورہ بالا اعلان کے برعکس تھا جس کے مطابق چرچ کے تمام امور کا کنٹرول پوپ کے پاس تھا۔ پہلے سے مقرر کردہ اپنے چرچ کے منصب داروں کی اعانت سے ہنری نے گریگوری کو چیلنج کر دیا۔ گریگوری نے فوراً ہنری کو معزول کر دیا۔ اعلان کر دیا کہ اب وہ بادشاہ نہیں ہے اور دھمکی دے دی کہ نافرمانی کرنے والے کو مسیحی برادری سے خارج کر دیا جائے گا۔ اگرچہ اس کی نظیر ماضی میں موجود نہیں تھی لیکن یہ اقدام بہت مؤثر ثابت ہوا۔ خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے ہنری صورت حال کو قابو کرنے کے لیے گریگوری کے پاس دوڑا ہوا گیا۔ لیکن اسے بتا دیا گیا کہ تین روز تک انتظار کرے' اس کے بعد پوپ سے ملاقات ہوگی۔ ملاقات میں ہنری نے پوپ گریگوری کے سامنے ناک رگڑی۔ آئندہ اس کے احکامات پہ تعمیل کا وعدہ کیا چنانچہ اسے بحال کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ہنری نے انتقام لینے کے لیے سازش کی اور گریگوری کو جلاوطن کر دیا جہاں وہ اپنی موت تک رہا۔ لیکن بادشاہ اور پاپائیت کے درمیان اختیارات کا تنازعہ کئی عشروں تک چلتا رہا۔

اختیارا کے پاپائی دعوؤں کو بادشاہ جائز طور پر نامناسب سمجھتے تھے لیکن حلف برداری تاجپوشی کی تقریب کا لازمی حصہ بنی رہی جس کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ بادشاہ پوپ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا ماتحت ہے اور قانونی پابندیوں میں رہتے ہوئے حکمرانی کرتا ہے۔ تخت نشینی کے موقعہ پر بادشاہ اس کلیسیائی عقیدہ کو تسلیم کرتا تھا جو اس کی بادشاہت کی نوعیت' مقصد اور حدود کے بارے میں رائج تھا اور اس تمام طریقۂ کار سے گزرنے کو قبول کرتا تھا۔ تاجپوشی اور حلف برداری کی تقریبات میں بادشاہ واضح اور غیر مبہم انداز میں خود کو پابند کرتا تھا کہ وہ کلیسیائی اور دنیاوی روایتی اور وضعی قوانین کو سربلند رکھے گا۔ چرچ کے اعلیٰ عہدیداران تقریبات کی رسوم ادا کرتے۔ ان میں یہ جرمانی تصور شامل ہوتا تھا کہ بادشاہ کا سب سے بڑا فریضہ کمیونٹی کے قوانین کی نگہبانی کرنا ہے۔ تمام رسومات میں بادشاہ وعدہ کرتا کہ وہ اپنے فرائض نیک نیتی سے ادا کرے گا۔ اس دور کے بعد کبھی کوئی بادشاہ حلف برداری کے بغیر تخت نشین نہیں ہوا۔ پیپن نے کہا تھا..... جس طرح ہم قانون کو سب کے لیے دیکھیں گے' ہماری خواہش ہوگی کہ قانون کو سب اسی طرح ہمارے لیے بھی دیکھیں۔ چارلس دی بولڈ نے قسم کھائی..... ''میں قانون اور انصاف کو سربلند رکھوں گا۔'' ہکلے لوئیس نے دعویٰ کیا..... میں قوم کی روایات اور قانون کا تحفظ کروں گا۔ یہاں تک کہ لوئیس چہاردھم جو مطلق العنانیت کی بدنام زمانہ مثال قرار دیا جاتا ہے اس نے 1667ء میں اپنے ایک فرمان میں کہا کہ..... یہ نہ کہا جائے کہ مقتدر اعلیٰ اپنی ریاست کے قوانین کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس صورت حال قانون قدرت کی حقانیت ہے' جو چیز کسی سلطنت کو حقیقی مسرت سے ہمکنار کرتی ہے وہ یہ ہے کہ رعایا بادشاہ کی اطاعت کرے اور بادشاہ قوانین کی اطاعت کرے۔

ان حلف برداریوں کی تکرار اور رضا کارانہ حلفی اظہار کی اہمیت کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ فرماں رواؤں نے اس طرح بار بار تصدیق کی کہ وہ قانون کے پابند ہیں چاہے وہ قوانین روایتی تھے' وضعی تھے' فطری تھے یا الوہی۔ اور اس طرح نہ صرف وہ تسلیم کرتے تھے بلکہ اس شرط کی توثیق کرتے تھے کہ قانون سے وفاداری ہی وہ مناسب ترین معیار ہے جس کے مطابق شاہی طرز عمل کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اس معمول نے خود نافذ کردہ فریضہ کو طے شدہ عوامی توقع بنا دیا۔

قانون اور معاشرے پہ اس مکمل مذہبی لبادے کے بارے میں قرون وسطیٰ کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تفہیم نے قانون کی حکمرانی کے لیے ایک اور انداز میں بنیادی کام کیا۔ مثلاً قرون وسطیٰ کا ایک مفکر کہتا ہے:

> ''روح اور جسم کے استعاراتی استعمال نے جو کچھ بتانے کی کوشش کی وہ یہ تھا کہ..... چونکہ مسیح میں ایمان پورے کلیسا کو متحد رکھنے کا ذریعہ اور ایمان کی تشریح پادریوں کا فریضہ ہے' چنانچہ قانون جو بذات خود معاشرے کو باقاعدگی دینے والا بیرونی عنصر ہے ایمان پر مبنی ہونا چاہیے۔ ایمان اور قانون علت و معلول کے تعلق میں ایک دوسرے کا سہارا بنے۔ تاہم ان کا اظہار مختلف طریقے سے ہوا کیونکہ ہر قانون کو انصاف کے تصور کا مجسمہ بننا تھا اور چونکہ انصاف مسیحی ایمان کا ایک ضروری جزو تھا' اس لیے ''روح'' اس تمثیل میں انصاف کے مسیحی تصور کے معنوں میں لی گئی۔ اس معاملے میں معمولی سا شائبہ ہے کہ قانون کی حکمرانی کا قرون وسطیٰ کا تصور قانون کی بالادستی کے تصور میں اجاگر ہوا تھا۔''

اس طرح معاشرے پر ایک ایسے قانون کی حکمرانی رہی جس کی شناخت مسیحی انصاف کے ساتھ ہوتی تھی۔ ایک عیسائی ہونے کی حیثیت سے بادشاہ اس قانون کا اسی طرح اطاعت گذار تھا جس طرح کوئی اور عیسائی فرد۔ وہ ایک کھلے حلف میں اپنی اطاعت گزاری اعلیٰ تر (فطری' الوہی اور روایتی) قانون اور وضعی قانون کے لیے کرتا تھا۔ مطلق العنان بادشاہت کا جو سانچہ رومن قانون نے ورثہ میں دیا تھا وہ تبدیل ہو کر ایک ایسے سانچے میں ڈھل گیا جو بادشاہوں کو کھلے بندوں قانون کا مطیع بناتا تھا۔

جرمانی روایتی قانون

قرون وسطیٰ میں قانون کی حکمرانی کے متعلق اکلوتا نقطۂ نظر جرمانی روایتی قانون ہی پیش کرتا ہے جو قرار دیتا ہے کہ بادشاہ قانون کا ماتحت اور پابند ہے۔ یہ رومن مطلق العنان بادشاہت کے تصور کو توازن میں لانے کا سبب بنا۔ جرمانی روایتی قانون نے جرمن زبان بولنے والے علاقوں کو ہی نہیں انگلستان' فرانس اور سپین سمیت یورپ کے وسیع تر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علاقے کو بھی متاثر کیا۔ جہاں جہاں جرمن قبائل آباد تھے وہاں اس نظریہ کی شدت رہی البتہ لاطینی (رومن) زبان بولنے والے علاقوں میں اس کے اثرات کمزور تھے۔ قرون وسطیٰ میں زیادہ تر قوانین روایتی تھے' وضعی یا تحریری نہیں تھے۔ بیشتر غیر تحریری روایتی قوانین کو قدیم عالی نسب اجداد کا قانون ہونے کے دعویٰ کی وجہ سے تقدیس کا درجہ حاصل تھا۔ قرون وسطیٰ کے دوران جائز قوانین کی یہی طاقتور شکل تھی۔ مزید برآں روایتی قوانین کو لوگوں کی بھرپور پشت پناہی حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ اس حقیقت کی بدولت انہیں وسیع طور پر تسلیم کرتے ہوئے اطاعت کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ قانون سازی محدود تھی اور اس کے بارے میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ کوئی نیا قانون بنانے کی بجائے موجودہ روایتی غیر تحریری قوانین کی وضاحت کے لیے ہے۔ روایتی قوانین کی بالادستی قانونی تبدیلی کی ممانعت نہیں کرتی تھی۔ اس کا تقاضا صرف یہ ہوتا تھا کہ تبدیلی کو وہ لوگ قبول کر لیں جو متاثر ہو سکتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے ایک ماہر فرنس کیرن کے مطابق قانون کی بالادستی کا جرمانی نقطۂ نظر اس حد تک رومن نقطۂ نظر سے ہم آہنگ تھا کہ قانون کسی فرمانروا کی مرضی اس تفہیم کے ذریعے بن سکتا ہے کہ..... فرمانروا نے قانون کو اپنی مرضی میں جذب کر دیا ہو۔ کیرن وضاحت کرتا ہے۔

> ''جرمانی ریاست میں قانون' روایتی تھا۔ یعنی اجداد کا قانون۔ یہ ایک پہلے سے موجود' معروضی قانونی صورت حال تھی جو اَن گنت موضوعی حقوق کا مرکب تھی۔ تمام گہری بنیادیں رکھنے والے حقوق بھی اسی طرح من مانی تبدیلیوں سے محفوظ تھے جس طرح معروضی قانونی ڈھانچے کے وہ حصے جن سے بادشاہ اپنا اختیار حاصل کرتے تھے۔ جرمانی سیاسی نظریات کے مطابق ریاست کا مقصد موجود نظام کو اور قدیم اچھے قوانین کو محفوظ کرنا انہیں نافذ کرنا اور زیر عمل لانا ہوتا ہے۔ جرمانی کمیونٹی جوہری طور پر ایسی تنظیم تھی جو قانون اور نظم و نسق کو برقرار رکھتی تھی۔''

بادشاہ اور ریاست قانون کے تحت' قانون کے لیے اور قانون کی مخلوق کے طور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر پائے جاتے تھے اور ان کی سمت صرف اور صرف کمیونٹی کا مفاد ہوتا تھا۔ ایک بادشاہ قانون کا محافظ تھا جس کے پاس اپنے طور پر نیا قانون نافذ کرنے کے اختیارات نہیں تھے۔ ایسا کرنا کفر کرنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں جرمانی روایتی قانون اور مسیحی تفہیم کے اختلاط نے قانون کی شناخت انصاف سے وابستہ کردی۔ قانون اور اخلاقی فریضے یک جان ہوگئے۔ اس طرح ایک فہم یہ مرتب ہوا کہ قانون محض حکم نہیں ہوتا۔ اسے انصاف کی دلالت اور ایک حق کی پہچان بننا چاہیے۔

روایتی جرمانی ''حق مزاحمت'' بادشاہوں پہ قانون کی بالاتری کے تصور کا زبردست اظہار تھا۔ اس کے مطابق اگر کوئی بادشاہ قانون شکنی کا مرتب ہوتو عوام کو اس سے کنارہ کشی کا حق تھا۔ بادشاہ اور اس کے عوام دونوں ایک باہمی ذمہ داری رکھتے تھے کہ قانون کو خلاف ورزی یا بدعنوانی سے بچایا جائے۔ بعض واقعات میں دیکھنے میں آیا ہے کہ جب بادشاہ واضح طور پر اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام رہا تو رعایا نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور اسے معزول کردیا۔ اس تصور کی کلید وفاداری تھی جس کے تحت بادشاہ اور عوام دونوں ہی قانون کے پابند تھے۔ قانون دونوں طرف یکساں طور پر نافذ تھا۔ حالانکہ غیر مساوی ذمہ داریاں دونوں سمتوں میں رواں تھیں جن میں وفاداری اور اطاعت گزاری بھی شامل تھی۔ یہ تصور جاگیرداری نظام کے سماجی تعلقات کے دائرے میں بھی متحرک رہا' جو حکمران یہ قانون توڑتا وہ اپنے عوام کی اطاعت گزاری کے حق سے محروم ہو جاتا۔ دیگر ذمہ داریوں کے علاوہ بادشاہ پابند تھا کہ وہ جاگیرداری کے لوازمات اور معاہدوں کا احترام کرے۔ وہ آسانی سے دوسروں کی املاک ضبط نہیں کرسکتا تھا۔ کوئی بھی فرد اپنے بادشاہ اور جج کی مزاحمت کرسکتا تھا' جب وہ قانون کے خلاف چلتے بلکہ وہ ان کے خلاف جنگ چھیڑنے میں بھی مدد دے سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اسے وفاداری سے انحراف کا مرتکب قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔

قرون وسطیٰ کے کچھ ماہرین دعویٰ کرتے ہیں کہ ان روایتی قوانین کے اثرات کو مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ان تصورات کے اثرات کو ان تصورات سے الگ کیا جائے جن کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے اور جو ایک دوسرے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں شامل ہو چکے تھے اور ایک دوسرے کو توانا کرتے تھے۔ لیکن شکوک وشبہات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ نظرانداز نہیں ہو سکتے۔ قرون وسطیٰ کے بیشتر دور میں ایک حقیقی روایت موجود تھی کہ مقتدر اعلیٰ قانون کا پابند تھا اگرچہ عملاً وہ ہمیشہ اس پابندی کا احترام نہیں کرتا تھا۔ بہت سے قانون دان یہ نتیجہ اخذ نہیں کرتے کہ بادشاہ کے مطلق اختیارات فطری یا الوہی قانون یا نارمل اور طے شدہ آئینی نظام سے بالاتر تھے۔ قانون سے انحراف علت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے کہ بادشاہ کو کسی قانونی ادارے کے سامنے انحراف کی جواب دہی کے لیے نہیں لایا جا سکتا تھا' ان تصورات سے پھر بھی یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ قانون کو نظرانداز کرنے میں پوری طرح آزاد نہیں تھا۔ بادشاہوں' ماتحت حاکموں اور ان کے عمال کو پابند کرنے کے علاوہ روایتی قانون سب پر نافذ ہوتا تھا جن میں مقامی نواب اور ان کی اشرافیہ برادری بھی شامل تھی جو جاگیرداری عدالتیں لگاتی اور روزمرہ کے اس فہم کی تصدیق کرتی اور مستحکم بناتی کہ کوئی بھی فرد قانون سے بالاتر نہیں۔

میگنا کارٹا:

قرون وسطیٰ میں قانون کی حکمرانی کے مبدا کی بحث میگنا کارٹا کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس منشور آزادی پہ 1215ء میں دستخط ہوئے جس کے دس سال بعد ایکناس پیدا ہوا۔ اگرچہ یہ ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے جس کے اثرات قانون کی حکمرانی کی روایت میں گونجتے ہیں لیکن میگنا کارٹا ہی وہ منشور تھا جس نے قرون وسطیٰ میں قانون کی حکمرانی کی تیسری جڑ یا مبدا کو توانا کیا۔ یہ مبدا امرا کی طرف سے بادشاہوں کو پابند بنانے کے لیے قوانین کو استعمال کرنے کی کوششیں تھیں۔

تکرار کے ساتھ زیر تذکرہ آنے والی اس دستاویز کی تاریخی اہمیت کبھی بھی متنازعہ نہیں رہی لیکن مؤرخین اس نکتہ پر منقسم ہیں کہ اس نے کب یہ اہمیت حاصل کی اور کیا یہ اس کی حقدار تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ ''آزادی سب کے لیے'' کے تصور کو اس نے مجسم کیا اور اس کی وجہ شہرت بھی یہی ہے۔ اصل میں یہ دستاویز ان مراعات کی پیداوار تھی جو باغی نوابوں نے بادشاہ جان سے بالجبر حاصل کیں۔ وہ بادشاہ جان کی طرف سے فرانس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ہاری ہوئی جنگ کے لیے بھاری ٹیکسوں سے بچنا چاہتے تھے۔ دستاویز میں بڑے بڑے زمینداروں کے لیے مراعات کا تذکرہ ہے۔ ناقدین کا دعویٰ ہے کہ اس دستاویز کی اہمیت اس وقت تک معمولی تھی جب تک اسے سترہویں صدی میں کوک نے بے جا شان و شکوہ (پر مبنی غلط کردار نگاری) سے مزین کرتے ہوئے اسے ظالمانہ قوت و اختیار کے خلاف جدوجہد کی علامت کا نہ بنا دیا۔ لیکن حامیوں کا مؤقف ہے کہ میگنا کارٹا کو نہ صرف اپنے زمانے میں اہمیت حاصل تھی بلکہ بعد ازاں بھی یہ اہمیت برقرار رہی باوجودیکہ بادشاہ جان نے فوراً ہی اس سے قطع تعلق کر لیا لیکن بعد کے بادشاہوں اور پارلیمنٹوں نے متعدد مواقع پر اس کی توثیق کی اور صدیوں تک یہ عوام کی گفتگو کا موضوع رہی۔ مزید برآں اس کے حامی دعویٰ کرتے ہیں کہ اگرچہ اس کے فوری فریق بادشاہ اور نواب تھے لیکن نوابوں نے تمام آزاد لوگوں کے مفادات کی نمائندگی کی اس کا تذکرہ خود دستاویز کرتی ہے۔

ہمارے پیش نظر موجود مقاصد سے اس بحث کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہرحال میگنا کارٹا اس حقیقت کی علامت ہے کہ قانون نے شہریوں کو بادشاہ کے خلاف تحفظ دیا۔ اس کی شق 39 ایک تاریخی دفعہ ہے۔

> ''کوئی آزاد فرد نہ تو حراست میں لیا جائے گا نہ قید میں ڈالا جائے گا اور نہ غیر قانونی قرار دیا جائے گا یا جلاوطن کیا جائے گا۔ نہ ہی اسے کسی طرح نقصان پہنچایا جائے گا۔ نہ ہم اس کے خلاف جائیں گے اور نہ ہی کسی کو اس کے خلاف ہراساں کرنے کے لیے بھیجیں گے' سوائے اس کے کہ اس کے ساتھی اس کے خلاف قانونی فیصلہ دیں یا وہ ملک کا قانون توڑے۔''

یہ زبان تصدیق کرتی ہے کہ باغی نواب' بادشاہ کے ججوں کے ماتحت نہیں تھے۔ کیونکہ یہ جج بادشاہ کے لیے جانبداری کا مظاہرہ کرنے میں بدنام تھے۔ تحریر تصدیق کرتی ہے کہ فیصلے عمومی قانون کے تحت ہونا چاہئیں نہ کہ بادشاہ کی منشا کے مطابق۔ اور عام عدالتوں کو قانونی کارروائی کا محفوظ ذریعہ قرار دیا گیا۔

چند عشروں کے بعد میگنا کارٹا کے اثر کے تحت بریکٹن کے ہنری نے اپنا مقالہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

On the Laws and Customs of England لکھنا شروع کیا۔ اس میں بریکٹن کے قلم کار نے قانون کی حکمرانی کا یہ مشہور نقشہ کھینچا۔

''وہ فرمانروا کہلاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ حکومت کرتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اچھی حکومت کا سربراہ ہے۔ وہ بادشاہ ہے لیکن اس وقت تک جب تک اچھا حکمران ہے۔ لیکن اس وقت ایک ظالم و جابر ہے جو پُرتشدد تسلط کے ساتھ ان لوگوں کو دباتا ہے جو اس کی نگہبانی میں دیئے گئے ہیں۔ اسے اپنے اقتدار کو قانون کے ذریعے نرم بنانا چاہیے کیونکہ قانون اقتدار کی لگام ہے۔ تاکہ وہ قوانین کے مطابق رہے' کیونکہ بنی نوع انسان کا قانون فیصلہ دے چکا ہے کہ اس کے اپنے قوانین قانون وضع کرنے والے کو پابند بناتے ہیں۔ یہ کہنا کسی حاکم کی شان کے مطابق ہے کہ بادشاہ خود کو قوانین کا پابند تسلیم کرتا ہے۔ کسی مقتدر اعلیٰ کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اور بات مناسب ترین نہیں کہ وہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور نہ ہی اس سے عظیم کوئی اقتدار اعلیٰ ہوسکتا ہے کہ قانون کے مطابق حکمرانی کی جائے۔ چنانچہ اسے چاہیے کہ اس طرح قانون کے سامنے جھک جائے جس طرح قانون نے اسے سرفراز کیا ہے۔ کیونکہ قانون ہی اسے بادشاہ بناتا ہے۔''

بادشاہ کو قانون کے تابع بنانے کے علاوہ میگنا کارٹا کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ اس نے قانون کے واجب عمل کے تصور کو بھی فروغ دیا۔ یہ یونائیٹڈ سٹیٹس کے آئینی تجزیوں میں بہت اہم ہے۔ اگرچہ یہ الفاظ شق نمبر 39 میں بعینہٖ استعمال نہیں ہوئے لیکن..... ''قانون کا واجب عمل'' کا جملہ 1354ء کے ایک تحریری قانون میں استعمال کیا گیا تھا اور سرزمین کے قانون یا ملک کے قانون کے ساتھ وابستہ کیا گیا۔ وقت کے ساتھ اس نے یہ مفہوم اختیار کرلیا کہ قانونی کارروائی کی کم از کم وہ صورت جس میں ایک منصفانہ سماعت یقینی ہو بالخصوص کسی غیر جانبدار فیصلہ ساز کے سامنے شنوائی کا موقعہ دیا جائے اور عدالتی عمل کے سیاق سباق کے مطابق ہونا چاہیے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور آخری بات یہ کہ میگنا کارٹا کی ایک شناخت آئین پسندی کے ذریعہ کی ہے۔ اس سے مراد قانونی اصطلاح میں حکومت اور اس کے لوگوں کے درمیان بنیادی تعلقات کا ڈھانچہ قائم کرنا ہے۔ انگریزوں نے روایتی قانون اور قوت ادراک پر مبنی تحریری آئین کے بارے میں دیومالائی تصور اپنا رکھا تھا۔ میگنا کارٹا نے ان کے آئین میں ایک بنیاد ساز تحریری جزو کا اضافہ کر دیا۔ (کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح یہ اپنی قدامت پسندی سے منحرف ہو گیا ہے)۔ برطانیہ میں جہاں پارلیمنٹ کے مقتدر ہونے کا تصور پایا جاتا ہے۔ میگنا کارٹا کو اعلیٰ تر قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے اور اس کی اصطلاحوں کو متعدد مرتبہ عام قانون سازی میں نظرانداز کیا جا چکا ہے لیکن ابھی تک ایک مقبول فہم میں اسے قانون کی ایک اعلیٰ تر شکل سمجھا جاتا ہے۔ بالخصوص شق نمبر 39 جو انتہائی مقدس اور ناقابل ترمیم ہے۔ انہی معنوں میں صدیوں سے زیر تذکرہ ہے۔

قانون کی حکمرانی کی روایت پہ میگنا کارٹا کا زیادہ اثر قرون وسطیٰ کے بعد مرتب ہوا۔ لیکن اس دور میں یہ دستاویز قانون کی حکمرانی کے مؤقف کو ہی پیش کرتی رہی۔ میگنا کارٹا کی بار بار توثیق اس وقت ہوئی جب کمیونٹی مطالبہ کرتی اور بادشاہ یہ حقوق دیتے رہے چنانچہ اس سے یہ تصور توانا ہوا کہ بادشاہ بھی اپنی رعایا کی طرح قانون کے تابع ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس نے وضعی قانون کے نظام میں ایک مرتکز ادارے جیسے جزو کا اضافہ کیا۔ یعنی عام عدالتیں اور ہم مرتبہ قانون دان (منصف) وجود میں آئے۔

قرون وسطیٰ کا ورثہ گومگو کی حالت میں

دعویٰ کیا گیا ہے کہ..... وہ اصولی بنیاد جس پر قرون وسطیٰ کا سیاسی نظریہ تعمیر کیا گیا..... قانون کی بالادستی کا اصول تھا۔ آگے آنے والا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ کئی طرح سے متشکل ہوا۔ مثلاً بادشاہ حلف اٹھاتے تھے کہ وہ الوہی' فطری' روایتی اور وضعی قوانین کی پابندی کریں گے۔ اسی طرح وسیع تر ادراک پیدا ہوا کہ ہر ایک کو بشمول بادشاہ ان قوانین کے تحت چلنا چاہیے اور پھر رومن' جرمانی اور مسیحی تصورات کے ذریعے بھی یہ تصور ابھرا کہ اچھا بادشاہ قانون کی پاسداری کرتا ہے۔ بادشاہ بھی رضاکارانہ طور پر یا دباؤ میں آ کر یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سمجھوتے کرنے لگے کہ عام قانونی کارروائیوں کے تحفظ کے لیے دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ پھر ان لوگوں کی وجہ سے بھی پیدا ہوا جو بادشاہوں (اور نوابوں) کو قانونی حدود و قیود میں رکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے اور ان بادشاہوں کی وجہ سے بھی ابھرا جو تسلیم کرتے تھے کہ انہیں قانونی جواز صرف اس دعوے کے نتیجہ میں ہی مل سکتا ہے کہ وہ قانون کے پابند رہیں گے اور اس کے مطابق عمل کریں گے۔ اگرچہ سابقہ بحث کو مختلف ذرائع اور الگ الگ اعانتوں کے حوالے سے آگے بڑھایا گیا لیکن درحقیقت یہ ایک دوسرے کے اثرات کا ماحصل تھا۔ تاہم ان جڑوں میں ایک پوشیدہ الجھن یا گومگو کی کیفیت موجود تھی جو قرون وسطیٰ کا حصار ٹوٹنے پر کھل کر سامنے آ گئی اور توانا ہو گئی۔

سولہویں صدی کی اصلاحات کے ساتھ چرچ کی گرفت ختم ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کی روشن خیالی کے ساتھ سائنس اور دانش طلوع ہوئے۔ مذہبی اور دنیاوی امور کی سماجی اور ثقافتی تفریق اور علیحدگی وجود میں آئی۔ ابتدا میں بتدریج اور غیر محسوس طریقے سے یہ سب کچھ ہوا لیکن وسیع تر داخلی بصیرت کے ساتھ قرون وسطیٰ کا ان کا باہمی ادغام ختم ہو گیا۔ الوہی یا خدائی قوانین وضعی قوانین سے الگ ہوئے۔ الوہی اور فطری قوانین کا غلبہ ریاست کے امور سے ختم ہو گیا۔ ریاست کے وسیع تر پھیلاؤ کے ساتھ اس عمل میں تیزی قرون وسطیٰ کے دور کے بعد آئی۔ قانون سازی کے حجم اور امکانات میں اضافہ اور روایتی قوانین کے تناسب اور وقار میں بدرجہ اتم کمی آئی۔ عام قوانین کو خود مختار مجموعہ قوانین کی نظر سے دیکھنے کا اینگلو-امریکن نقطۂ نظر انیسویں صدی کے آخر تک برقرار رہا لیکن اس میں انحطاط بہرحال آیا۔ عرصہ دراز سے موجود یہ تصورات کہ قانون سازی نئے قوانین تخلیق نہیں کرتی بلکہ محض پہلے سے موجود فطری قوانین یا روایتی قوانین کا اعلان کرتی ہے مکمل طور پر پیچھے رہ گئے اور یہ نقطۂ نظر آگے آ گیا کہ قانون' قانون سازی کے عزم کی پراڈکٹ ہوتی ہے جس کی شکل اپنی مرضی کے مطابق بنائی جاتی ہے۔ اسے قانون کا انسٹرومینٹل ویو کہا جاتا ہے۔

قانون کی حکمرانی کے پریشان کن نتائج انہی تبدیلیوں سے پیدا ہوئے۔ قرون وسطیٰ کے دور میں بادشاہ وضعی قانون کے پابند سمجھے جاتے تھے کیونکہ فطری قانون' خدائی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قانون اور روایتی قانون اس کا مطالبہ کرتے تھے۔ قوانین کے یہ ذرائع بھی حدود قائم کرتے اور وضعی قانون کو پابند بناتے تھے۔ ایک کلیدی وصف ان میں مشترکہ طور پر یہ تھا کہ یہ سب بادشاہوں کی دسترس سے باہر تھے۔ جب یہ اپنی اہمیت کھو بیٹھے تو وضعی قانون باقی رہ گیا اور اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو گیا۔ جس قدر زیادہ یہ سمجھا گیا کہ قانون وضعی ہوتا ہے' اسی قدر زیادہ قانون ساز کی بالادستی میں اضافہ ہوتا گیا اور قانون سازوں کے اقدامات پر کسی طرح کی قدغن لگانا مشکل ہو گیا۔ اگر حکومت مطلق العنان فرماں روا کی ہوتی تو جبر و استبداد روکنا مشکل ہو جاتا کیونکہ قانون ساز بذات خود فرماں روا ہوتا تھا۔ اس صورت حال نے سب کچھ تبدیل کر دیا۔ کیونکہ اگر وضعی قانون محض مرضی کا معاملہ ہے اور خواہش کے مطابق بدلا جا سکتا ہے تو پھر ظاہر ہے آپ قانون ساز پہ کوئی حقیقی قانونی پابندی عائد نہیں کر سکتے۔ ایکنا س کا کہنا ہے:

> ''قانون کی حکمرانی کو کس طرح مقتدر قانون ساز سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟ صدیوں سے یہ سوال موجود ہے کہ کس طرح یا درحقیقت کیا حکومت کو قانون کے ذریعے اس وقت پابند کیا جا سکتا ہے جب یہی قانون کا حتمی ذریعہ ہو۔ اس سوال کی مستقل اہمیت اور ممکنہ جوابات کو ہم اگلے صفحات میں تفصیل سے پیش کریں گے۔''

متوسط طبقہ کا ابھار

یورپ میں قرون وسطیٰ سے نشاۃ ثانیہ اور روشن خیالی کے ذریعے جدید دور میں تبدیل ہونا' قانون کی حکمرانی اور جمہوری اداروں کا قیام عمل میں آنا کسی مداخلت کے بغیر نہیں تھا جس کے نتیجہ میں لبرل ازم اپنے نکتۂ عروج کو پہنچا۔ کچھ عرصہ کے لیے سترہویں صدی کے اردگرد یورپ میں مطلق العنان بادشاہ پائے جاتے تھے۔ ان کا اقتدار بادشاہوں کے خدائی حق کے عقیدہ پر قائم تھا۔ یہ عقیدہ کہ خدا براہِ راست بادشاہ کو منتخب کرتا ہے' دراصل بادشاہوں کو چرچ سے آزاد کرنے کے مقصد کے تحت تراشا گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں بادشاہ مزید ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہو گیا۔ چنانچہ دعویٰ کیا گیا کہ بادشاہ یا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریاست جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے' خدا کے سوا کسی کو جوابدہ نہیں اور سیاسی اقتدار اعلیٰ ہمیشہ کے لیے اس طرح آزاد ہے کہ کسی طرح کی ارضی محکومیت ''شاہی اقتدار'' سے خارج ہے۔ بادشاہ' قانون سے بالاتر ہیں کیونکہ وہ قانون بناتے ہیں اور اپنے اقدامات کے لیے صرف خدا کو جوابدہ ہیں۔ مطلق حکمرانی کے دیگر مظاہر میں بادشاہ اپنا شاہی اختیار استعمال کرتے ہوئے اہم نوعیت کے مقدمات کی سماعت کرتے' اختیارات تقسیم کرتے جو انہیں مخصوص مواقع پر قانون کو التوا میں رکھنے کا حق دیتے۔

قانون کی حکمرانی کے تصورات جن کا ذکر اس باب کے شروع میں کیا گیا ہے۔ بہرحال پوری طرح کچلے نہیں جا سکے تھے۔ اگرچہ بادشاہ مجبور کر دینے والے حالات میں قانون سے بالا اقدامات کرتے تھے لیکن معمول کے زیادہ تر امور میں اپنی مطلق العنانیت کے باوجود وہ قانون کی حدود و قیود میں رہتے۔ ان پابندیوں کو برقرار رکھنے میں کئی چیزوں نے مدد کی۔ بادشاہوں کی طرف سے یہ بات تسلیم کرنے سے قطع نظر کہ ایسا کرنا انہیں قانون سے مطابقت رکھنے والا حاکم ظاہر کرتا تھا اور یہ بات ان کے مفاد میں تھی۔ اصل صورت حال یہ تھی کہ قرون وسطیٰ میں شروع ہونے والی قانونی تعلیم کے نتیجہ میں اب وکلاء اور ججوں یعنی پیشہ ور قانون دانوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ کم از کم انگلستان میں اس وقت شاہی مطلق العنانیت کے ساتھ صدیوں پرانی روایت موجود تھی۔ اپنا نظام تعلیم اور ذخیرہ علم تھا۔ عدالتیں شاہی مداخلت کے خلاف ڈٹ جاتی تھیں یا مداخلت کو روکنے کی کوشش کر سکتی تھیں۔ اس کا ثبوت کوک کے ایک فیصلہ میں ملتا ہے جو 1607ء میں جاری کیا گیا۔ اس میں بادشاہ' جیمز اول کی طرف سے ایک ایسے مقدمے کے فیصلہ کو مسترد کیا گیا تھا جو پہلے سے عدالت میں زیر سماعت تھا اور یہ استرداد قانون پہ بادشاہ کے حتمی اختیار کے باوجود کیا گیا۔ ''ججوں نے حلف اٹھا رکھا ہوتا ہے کہ وہ انگلستان کے قانون اور روایت کے مطابق انصاف کو برسر عمل لائیں گے۔ بادشاہ عدالتوں میں سے کوئی مقدمہ نہیں لے سکتا اور اس پر بذات خود فیصلہ نہیں دے سکتا۔'' یہ شواہد بتاتے ہیں کہ قانون ایک مسلمہ' باقاعدہ ادارہ جاتی حیثیت اختیار کر چکا تھا یا اس منزل کے قریب تھا اور اس کو بڑھتا ہوا خود مختار قانونی پیشہ ایک مخصوص شکل دے رہا تھا۔ عدالتیں اس ادارہ کا مرکز اور ججز قانون کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محافظ اور ترجمان کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

ہم ایسی کوئی کوشش نہیں کریں گے جو وضاحت کرے کہ کون سے ذرائع جاگیرداری کو مطلق العنان بادشاہوں کے ذریعے لبرل ازم کی طرف لے گئے اور جو پورے یورپ میں مختلف واقعات اور اوقات میں رونما ہوئے۔ کیونکہ یہ بحث ہمارے موضوع سے آگے نکل جائے گی۔ البتہ ایک عامل تاجروں کا ابھار مختصر طور پر ضرور زیر بحث لائیں گے کیونکہ اس نے لبرل ازم کے ظہور میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ یہ تاجر متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی سرگرمیوں نے تاریخ سازی کی۔ چنانچہ اس حوالے سے واقعات کا تذکرہ ہم تاریخی اختلافات کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے موضوع کو پیش نظر رکھ کر کریں گے۔

بارہویں صدی میں شہر اقتصادی سرگرمیوں کے مراکز بن گئے۔ چنانچہ وہاں آبادی اور تجارت میں اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ تاجروں کے پاس دولت جمع ہونے پر ایسے واقعات تیزی سے رونما ہونے لگے جنہوں نے انجام کار جاگیرداری نظام کی گلا گھونٹنے والی گرفت ختم کر دی۔ اس کا سماجی غلبہ تیرہویں صدی کے آخر تک نہایت کمزور اور سترہویں صدی تک پورے یورپ میں بالکل ختم ہوگیا۔ تاجروں کے لیے زمینداری پہ مبنی نظام مراتب رکھنے والے جاگیردارانہ نظام میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ جاگیرداری نظام کے مختلف طبقوں سے باہر رہتے ہوئے وہ آزاد تھے۔ لیکن نظام سے باہر ہونے کی وجہ سے انہیں محدود تحفظ اور معمولی سیاسی طاقت میسر تھی۔ وہ شہر جن میں ان کی سرگرمیاں جاری تھیں متمول اور آباد تو تھے لیکن انہیں مقامی حکومت تشکیل دینے کا اختیار نہیں تھا۔ تاجر اس جاگیردارانہ نظام میں روز افزوں پریشانی اور جھلاہٹ کا شکار تھے۔ اس لیے کہ یہ نظام عدالتوں پر زمیندار اشرافیہ کو ترجیح اور قدر و منزلت دیتا تھا اور زمیندار اشرافیہ ایسے متروک اور پابندیاں عائد کرنے والے قوانین نافذ کرتی تھی جو ان کے مفادات کو تحفظ دیتے اور تاجروں کی سرگرمیوں میں رکاوٹیں پیدا کرتے تھے۔ اشرافیہ کے پاس زمین تو بہت سی تھی لیکن دولت نہیں تھی۔ چنانچہ حسد کی وجہ سے تاجروں کی دولت کو روکنا یا موجودہ دولت کو ان سے چھین لینا چاہتے تھے۔ یاد رہے کہ قرون وسطیٰ کے چرچ اور ان کے بشپ بڑے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بڑے زمیندار تھے ان کے پاس قانونی اور سیاسی قوت ہوتی تھی جس سے وہ اپنی مذہبی حیثیت کو طاقتور بناتے تھے۔ یہ سب بھی تجارت کے خلاف متحد تھے اور اسے بے معنی سرگرمی قرار دیتے ہوئے سود کی ممانعت کی وجہ سے تجارتی قرضوں یا ادھار کی مذمت کرتے تھے۔

بادشاہوں کو زمیندار اشرافیہ کے ساتھ مسلسل تنازعات کا سامنا رہتا تھا۔ بادشاہوں کی سخت جان حریف ہونے کے علاوہ اشرافیہ اس وقت بھی مزاحمت کرتی جب بادشاہ عسکری یا مالی معاونت طلب کرتا۔ (اسی بات نے میگنا کارٹا کی رفتار تیز کر دی)۔ اس مزاحمت نے بادشاہوں کی مالی حالت اور عسکری قوت کمزور کر دی۔ ان کے وسائل زیادہ تر جاگیرداروں کے مرہون منت تھے۔ اشرافیہ اس وقت بھی تعمیل نہ کرتی جب بادشاہ کسی جنگ کے لیے ٹیکس کے نفاذ کا حکم دیتا۔ اس طرح کی نافرمانی بادشاہوں کو مجبور کرتی کہ ضروری مالیات میں اضافہ کے لیے اپنی زمینیں بیچ دیں۔ اس سے ان کی طاقت میں مزید ضعف آ جاتا۔

ایک مشترکہ مفاد..... مشترکہ دشمنوں سے نمٹنے کی ضرورت..... نے بادشاہوں اور تاجروں کے درمیان اتحاد کو جنم دیا۔ بادشاہ اپنی آمدنی کا بہت بڑا حصہ نوابوں کی عدالتوں کے برعکس فیس مہیا کرنے والی ریاستی عدالتوں' دولت مند تاجروں سے حاصل ہونے والے قرضوں اور کسٹم جیسے تجارتی ٹیکسوں کی صورت میں قابل بھروسا ذرائع سے حاصل کر رہے تھے۔ چنانچہ یہ بات بادشاہوں کے مفاد میں تھی کہ تاجروں کی جدوجہد کی معاونت کی جائے کیونکہ تاجر ساہوکار بھی تھے اور بادشاہوں کو قرضے دیتے تھے۔ چنانچہ بادشاہوں نے شہروں کی حمایت کی جو تاجروں کی قیادت میں زمیندار اشرافیہ کے خلاف حکومت خود اختیاری کے تحت کارپوریشنز بننا چاہتے تھے۔ تاجر چونکہ کم مشقت طلب محنت چاہتے تھے۔

چنانچہ زرعی اشرافیہ کے کمیرے اور کھیت مزدور' ان کو وسیع تعداد میں دستیاب ہو گئے۔ کسی بھی ایسے فرد کو اس زمانے میں آزادی مل جاتی تھی جو ایک سال سے شہر میں رہ رہا ہو۔ (دیہات میں جاگیرداروں کے کمیروں اور کھیت مزدوروں کے لیے یہ آزادی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں تھی)۔شہروں کے قانون نے نہ صرف ذاتی غلامی اور زمینوں پہ کام کرنے کی پابندی ختم کر دی بلکہ جاگیردارانہ حقوق اور مالی دعوے بھی ختم کر دیئے جو تجارت اور صنعت کی سرگرمیوں میں مداخلت کرتے تھے۔ بدلتے ہوئے اقتصادی ڈھانچے کے عامل نے انگلستان سمیت ہر جگہ کام کیا جہاں تاجروں کے مفاد میں بادشاہوں نے مراعات دے دیں۔تاجروں کے اصول وضوابط جو وہ آپس کے لین دین' مارکیٹ یا علاقائی میلوں میں زیر عمل لاتے انہیں عدالتوں نے تسلیم کر لیا۔

جب تجارت کو فروغ حاصل ہوا اور دولت بڑھی تو افراط زر نے اشرافیہ کی اقتصادی طاقت نچوڑ لی کیونکہ وہ طے شدہ لگان پر انحصار کرتی تھی اور اسے آسانی سے بڑھایا نہیں جا سکتا تھا۔ جب دولت کی بنیاد ارضی ملکیت کی بجائے چیزوں کی خرید وفروخت بن گئی تو اشرافیہ ایک معاشی جنجال میں پھنس گئی۔اس کی آمدنی میں انحطاط آ رہا تھا جبکہ اعلیٰ سماجی طرز حیات اور شان وشوکت اضافی آمدنی کا تقاضا کرتے تھے۔ تاجروں کے مطالبات پورے کرنے کے لیے زمین بھی فروخت کے لیے مارکیٹ میں آ گئی۔تاجروں کے نزدیک اب بھی زمین کی ملکیت دولت اور مرتبہ کا ذریعہ تھی۔اشرافیہ کے وہ ارکان جو تجارتی سرگرمیوں میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے یا کامیاب تاجر خاندانوں میں شادیاں نہیں کرتے تھے' زوال کا شکار ہو گئے: (اس طرح کی شادیاں دو طرفہ مفادات رکھتی تھیں۔ایک طرف دولت تھی تو دوسری طرف جاہ ومرتبہ جو شادی کی صورت میں یکجا ہو جاتے)۔بعض مقامات پہ تو یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ تمام اشراف شہر کے تاجروں کے مقروض ہو گئے۔ بڑے بڑے جاگیردار اپنے کمیروں کو آزاد کرنے پر اتر آئے کیونکہ یہ آزادی خریدنا پڑتی تھی۔ جاگیرداروں کو ایک طرف آزاد ہونے والے کمیروں سے نقد رقوم مل رہی تھیں جنہیں اپنی غلامی میں رکھنے پر صرف ان کی خدمات یا فصلیں ملتی تھیں تو دوسری طرف وہ آزاد ہونے والے کمیروں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو رہے تھے۔ ان ذمہ داریوں میں ان کی کفالت اور حفاظت شامل ہوتی تھی۔

ان مختلف عوامل نے جب زور حرکت دکھایا تو مغرب میں جاگیرداری کا نظام نزاع کی حالت میں داخل ہو گیا۔اب موت اس کا مقدر تھی۔تاجروں کو دی جانے والی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تجارتی سرگرمیوں کی سہولت نے وقت کے ساتھ ساتھ ایک نئے معاشرے اور قانونی اداروں کو جنم دیا۔ جاگیردارانہ سماج میں فرد کو پیدائش کے ساتھ ملنے والی حیثیت زندگی بھر اس کا مقدر رہتی تھی جبکہ نئے سماج میں فرد کی ذاتی محنت دولت کا حصول اور اس میں اضافہ ممکن بناتی تھی اور پھر مارکیٹ' تجارتی قرضے' مالی سہولتیں' جائیداد رکھنے کے حقوق اور معاہدوں کی قوت عمل نئے سماج کے اوصاف تھے۔ یہ منظر ہر جگہ موجود نہیں تھا اور نہ ہی یہ مکمل کہانی ہے۔ جب تاجروں نے بادشاہ کو ایک بڑے خطرے کی حیثیت سے دیکھا تو انہوں نے بادشاہ کے خلاف اشرافیہ سے اتحاد کر لیا۔ کئی مرتبہ بادشاہوں اور اشرافیہ نے تاجروں اور ساہوکاروں کے خلاف صف بندی کی۔ بعد کے ادوار میں تامین پسند (Protectionist) ٹاؤن گلڈز نے بیرونی تاجروں کے خلاف محاذ آرائی کی۔ یہ گلڈز ہنرمندوں کے گروہوں پر مشتمل تھیں۔ مقامی ہنرمند ملکی مصنوعات کا تحفظ چاہتے تھے۔ چنانچہ اپنے مفاد میں بادشاہوں نے ان کی سرپرستی کی۔ اپنی حالت بہتر بنانے اور تنخواہوں میں اضافہ کے لیے اگر محنت کش تاجروں کے خلاف بغاوت کرتے تو بادشاہ یا اشرافیہ بدنظمی کے خوف سے دبا دیتی۔ طاعون' خراب فصلیں' قحط اور جنگیں وقفے وقفے سے آبادی میں کمی کر دیتیں۔ چنانچہ افرادی قوت میں کمی آ جاتی۔ طلب کم ہو جاتی اور تجارتی ترقی رک جاتی۔ یوں کوئی ایک اکلوتا یا سیدھا راستہ نہیں تھا جس پر چل کر واقعات نے کوئی نیا منظر تشکیل دیا۔ یقیناً کئی اور عوامل بھی ملوث تھے لیکن تمام تر واقعات کا نکتہ عروج یہ تھا کہ ایک متوسط طبقہ ابھر آیا۔ اس کی اہمیت اور کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ اس کے مفادات کو لازم و ملزوم کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ یہ سب کچھ لبرل ازم کا نقیب تھا۔

❖....❖....❖

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

3

لبرل ازم

لبرل ازم سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل میں دور جدید سے پہلے پیدا ہوا۔ کسی بھی سیاسی نظریہ کی طرح لبرل ازم کے بارے میں متصادم نکتہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں اور یہ جان رالز کے سوشل ویلفیئر لبرل ازم سے لے کر رابرٹ نوزیک کے لبرٹیرین لبرل ازم تک اور فریڈرک ہائیک کے کنزرویٹو لبرل ازم سے آئزیاہ برلن کے پلورلسٹک لبرل ازم اور ایمی گٹ مین کے ایکیلی ٹیرین لبرل ازم تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن بات یہیں پہ ختم نہیں ہوتی بلکہ تصویر کچھ اور پیچیدہ ہو جاتی ہے کیونکہ لبرل ازم محض سیاسی نظریئے اور نظام حکومت پر مشتمل نہیں بلکہ ایک کلچر' ایک معاشی نظریہ' ایک نفسیات' ایک اخلاقی نظریہ اور ایک نظریہ علم بھی ہے۔ اس تنوع اور پیچیدگی کے باوجود لبرل ازم کے بارے میں ہر نقطۂ نظر قانون کی حکمرانی کے لیے ایک بنیادی مقام رکھتا ہے اور قانون کی حکمرانی آج کل لبرل ازم کی اصطلاحوں میں اچھی طرح سمجھی جاتی ہے۔

لبرل ازم سب سے بڑھ کر انفرادی آزادی پر زور دیتا ہے۔ جان سٹوارٹ مل کی کلاسیک اصطلاحوں میں دیکھیں..... ''اکلوتی آزادی جو نام کی حقدار ہے۔ اس سے مراد اپنی بہتری کی جستجو اپنے انداز میں کرنا ہے۔ تاہم اس طرح کہ ہم اس جستجو میں دوسروں کو ان کی بہتری سے محروم نہ کریں اور نہ اس کے حصول میں ان کی کوششوں میں رکاوٹ پیدا کریں۔''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لبرل سوشل کانٹریکٹ کی روایت جو نہایت مؤثر طریقے سے جان لاک نے وضع کی ہے۔ قانون اور ریاست کے مبداء مثالی اصطلاحوں میں بیان کرتی ہے۔ زندگی قانون کے بغیر (فطرت میں) غیر محفوظ اور تنازعات کی زد میں رہتی ہے۔ امن قائم رکھنے کے لیے قوانین' غیر جانبدار قانون نافذ کرنے والے اور غیر متعصب جج درکار ہوتے ہیں۔ خودمختار افراد ایک ایسے باہمی معاہدے میں داخل ہونے کا انتخاب کرتے ہیں جو انہیں ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے تاکہ ایسی حکومت تشکیل دی جائے جو محفوظ نظام کے مفاد میں مجموعہ قوانین کا اجرا اور نفاذ کرے جس کے نتیجہ میں وہ اپنی فطری آزادی کا تبادلہ ایک قانونی نظام میں رہنے سے کریں جبکہ ان کے بنیادی حقوق اور آزادیاں برقرار رہیں۔ یہ انتظام قانونی طور پر جو کچھ پیش کرتا ہے وہ ان کی بہ رضا و رغبت منظوری ہے۔ منظوری افراد کی خودمختاری کا احترام کرتی ہے چاہے وہ اس طرح قانون کی ہدایات کے غلام بن جاتے ہیں۔

مساوات لبرل ازم میں آزادی کی ساتھی ہے اور یہ تمام افراد کو خودمختاری کے حقوق دیئے جانے کی بدولت اخلاقی برابری کا نتیجہ ہے۔ ہر ایک کے ساتھ مساوی احترام اور وقار کا سلوک کیا جانا چاہیے کیونکہ انسان ہونے کی وجہ سے ان کے پاس پیدائشی طور پر عقل اور اخلاقی طرز عمل ہے۔ لبرل ازم میں مساوات قرار دیتی ہے کہ تمام شہری ایک جیسے سیاسی حقوق رکھتے ہیں اور قانون کے سامنے برابری کے حقدار ہیں۔ آزادی اور مساوات تقاضا کرتے ہیں کہ حکومت بہتری اور بہبود کے سوال پر غیر جانبدار رہے۔'' ..... چونکہ کسی معاشرے کے شہری اپنے تصورات میں مختلف ہوتے ہیں چنانچہ حکومت کو ان کے ساتھ اس لیے ایک جیسا سلوک نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ایک تصور کو دوسرے پہ ترجیح دیتی ہیں چاہے حکام سمجھتے ہوں کہ ایک تصور حقیقی طور پر برتر ہے۔ یا ایک تصور کو زیادہ تعداد رکھنے والے یا زیادہ طاقتور گروپ نے اپنا رکھا ہے۔

یہ باب لبرل ازم میں مرکزی موضوعات کا ایک تعارف مہیا کرے گا تاکہ لبرل نظاموں میں قانون کی حکمرانی کے بارے میں تاریخی اور ہم عصر نظریات کی (اگلے صفحات میں آنے والی) بحث کا پس منظر دستیاب رہے۔ ایک اہم یاددہانی ضروری ہے تاکہ لبرل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ازم پہ طویل توجہ مرکوز کرنے کی ابتدا ہو سکے۔ اگر چہ لبرل ازم قانون کی حکمرانی کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا (اس کی وضاحت آگے آئے گی) لیکن قانون کی حکمرانی لبرل ازم کے بغیر بھی قائم رہ سکتی ہے۔ پچھلے دو ابواب میں قانون کی حکمرانی کے کسی تصور کا تذکرہ' یونانی' رومی یا قرون وسطیٰ کے حوالے سے نہیں ہوا جس کا تعلق لبرل نظام سے ہو۔ قانون کی حکمرانی کی لبرل سمت بندی ان پہلے سے موجود لبرل ذرائع سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ لبرل ازم میں قانون کی حکمرانی فرد کی آزادی کے تحفظ پر زور دیتی ہے۔ یونانی یا قرون وسطیٰ کی قانون کی حکمرانی کے مفہوم میں ایسا نہیں ہے۔ یونانی تصورات میں آزادی کا تصور اجتماعی حکومت خود اختیاری تھا اور قانون کو بالادستی اس لیے دی گئی تھی کہ یہ شہریوں کی طرف سے بذات خود مؤثر بنایا جاتا تھا اور کمیونٹی کی اخلاقیات اور روایت کو نافذ کرتا اور ان کی عکاسی کرتا تھا۔ قرون وسطیٰ کی تفہیم میں قانون کی حکمرانی کا رُخ لالچی اور غارت گر بادشاہوں کو روکنے کی طرف تھا اور زور دیا جاتا تھا کہ قانون کو کمیونٹی کی بہبود کے لیے ہونا چاہیے۔ قانون کی حکمرانی کے دونوں تاریخی تصورات میں بالادستی فرد کو نہیں کمیونٹی کو دی گئی تھی۔ کمیونٹی کا رُخ رکھنے والے معاشروں میں یا متعین مراتب رکھنے والے معاشروں میں حکومت کے ظلم وستم پہ پابندیاں افراد کی آزادی میں اضافہ نہیں کرتیں اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ سماجی اور ثقافتی پابندیاں اگر فرد کے اردگرد موجود ہوں تو وہ فرد کی نام نہاد آزادی کو بے معنی اور ناقابل فہم بنا دیتی ہیں۔ نجی زندگی کا احساس بذات خود آزادی کے ایک تصور سے اخذ کیا گیا ہے۔ (نجی زندگی ذاتی تعلقات کا وہ علاقہ ہے جو مقدس اور دخل اندازی سے محفوظ قرار دیا جاتا ہے)۔ تاہم اس کی تمام تر مذہبی جڑیں اپنی ترقی یافتہ شکل میں نشاۃ ثانیہ یا اصلاحات سے زیادہ پرانی نہیں ہیں۔ اس کی انفرادیت پسندی کے سبب ایک مستقل دھکیل یا دباؤ خوف کی صورت میں لبرل خیالات میں پوشیدہ ہے۔ دوسروں کی طرف سے استحصال کا خوف اور بالخصوص ریاست کا خوف۔

آزادی کے چار تصورات

مذکورہ مانوس لبرل داستان افراد کو ایک ناقابل رشک خطرناک صورت حال

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں داخل کرنے سے شروع ہوتی ہے۔ یہ صورت حال بظاہر تقاضا کرتی ہے کہ ذاتی تحفظ اور سماجی نظم وضبط کے مفاد میں آزادی کو قربان کر دیا جائے۔ قانون کی عدم موجودگی میں ایک فرد کلی طور پر آزاد ہوتا ہے۔ لیکن یہ آزادی اسے بہتری اور بہبود نہیں دے سکتی۔ دوسری طرف ذاتی تحفظ اور بقا کے بدلے آزادی سے دست کش ہو جانا ایک مشتبہ تبادلہ ہوگا اگر اس کے نتیجہ میں قانونی استبداد کا شکار ہونا پڑے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ آپ رضا کارانہ طور پر جیل کی کوٹھڑی میں بند ہو جائیں کیونکہ سلاخوں کے پیچھے آپ محفوظ رہ سکتے ہیں۔ لبرل ازم کے علمبردار کہتے ہیں کہ اگر ہر ایک فرد مطلق آزاد ہو تو پھر حقیقی طور پر کوئی بھی آزاد نہیں ہوگا اور اس کی وجہ وہ خطرہ ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے لاحق رہتا ہے۔ اگر چہ یہ استدلال درست ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک فرد اسی وقت آزاد ہوتا ہے جب وہ قانون کے آگے سر جھکا دیتا ہے لیکن اس سے تشکیک ابھرتی ہے۔ یہ اعتراف کرنا زیادہ صاف گوئی نہیں ہے کہ قانون کے تحت ہم آزاد نہیں ہیں۔ لیکن جو فوائد قانون مہیا کرتا ہے کیا وہ نظر انداز کرنے کے قابل ہیں؟ جدید لبرل جمہوری نظام اس سوال کا چہار پہلو جواب دیتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ کہ فرد اس حد تک آزاد ہے کہ قوانین جمہوری طریقے سے وضع کیے جاتے ہیں۔ شہری اس کی منظوری دیتے ہیں بلکہ درحقیقت وہ از خود وہی قوانین بناتے ہیں' جن پر چلنے کے وہ پابند ہوتے ہیں۔

فرد بیک وقت حاکم بھی ہے اور محکوم بھی۔ اس طرح افراد خود پر حکمرانی کرتے ہیں..... ''ایسے قانون کی اطاعت جو ایک فرد خود اپنے لیے تجویز کرتا ہے..... آزادی ہے۔ روسو نے کہا تھا..... ''ایک قوم چونکہ قوانین کی غلام ہوتی ہے' اس لیے اسے ان قوانین کا مصنف خود ہونا چاہیے۔'' علاوہ ازیں فرض کر لیا گیا ہے کہ جمہوریت کے تحت شہری ایسے قوانین نہیں بنائیں گے جو خود ان کے لیے متشدد ہوں۔ قانون بنانے کا ان کا اختیار خود انہیں بہترین تحفظ دیتا ہے۔ حکومت خود اختیاری سیاسی آزادی ہے۔ نمائندہ جمہوریت حکومت خود اختیاری کا جدید مظہر مغرب میں موجود ہے۔ یہ آزادی کے کلاسیکل یونانی مفہوم سے مشابہہ ہے۔ اگر چہ اس اعتبار سے بہت مختلف ہے کہ ان کی جمہوریت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نمائندوں پر مشتمل نہیں براہِ راست ہوتی تھی۔ ہم عصر دنیا میں سیاسی آزادی خودمختاری کے لیے احتجاج اور آرزو کے پیچھے پائی جاتی ہے۔ یہ احتجاج اور جدوجہد غیرملکی تسلط یا اس اکثریتی گروہ سے آزادی کے لیے ہوتا ہے جو مختلف ثقافتی شناخت یا مذہب رکھتا ہے۔ سیاسی آزادی کی عملی تعبیر اجتماعی فیصلوں میں حقیقی شرکت کے مواقع کا مطالبہ کرتی ہے جس کے ساتھ حاکمانہ سیاسی اور قانونی ڈھانچہ ہو۔ یہ ووٹ کا حق دیتی اور سیاسی عہدے کی اہلیت دیتی ہے۔ اظہارِ رائے کی آزادی' اجتماع اور وابستگی کو یقینی بناتی ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ فرد اس حد تک آزاد ہوتا ہے جس حد کے بعد حکومت کے عمال موجود قانون کے مطابق مداخلت کرنے کے لیے مطلوب ہوتے ہیں۔ یہ ضرورت افراد کو اس بات کا تعین کرنے کے قابل بنا کر آزادی کو فروغ دیتی ہے کہ وہ کہاں ریاست کے قانونی ڈھانچے کے تحت قابلِ گرفت ہوں گے۔ چنانچہ وہ قانون شکنی نہ کر کے اپنے معاملات میں قانونی مداخلت سے بچتے ہیں۔ شہری صرف قانون کے غلام ہوتے ہیں۔ ناں کہ ان لوگوں کے من مانے طریقے یا فیصلے کے غلام ہوتے ہیں جو سرکاری اختیارات کے تحت دوسروں کو جبر و استبداد کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ قرار دیتی ہے کہ قوانین کو واضح اور غیر مبہم لفظوں میں پہلے سے عوام میں مشتہر کیا جائے' ان کو سب پر یکساں طریقے سے نافذ کیا جائے اور ان کی تشریح و اطلاق یقینی اور دیانتداری سے ہو۔ اس کی معنی خیز مثال پہلے سے کسی قانون کے موجود نہ ہونے کی صورت میں مجرمانہ سزا کی ممانعت ہے۔ یہ ''قانونی آزادی ہے۔'' مونٹسکیو نے بڑے خوبصورت پیرائے میں اس کا اظہار کیا ہے۔

''آزادی وہ سب کچھ کرنے کا حق ہے جس کی اجازت قوانین دیتے ہیں'' یعنی یہ آزادی وہ سب کچھ کرنے کی ہے جس کی ممانعت قوانین کھلے طور پر نہیں کرتے۔ قانونی آزادی' ماڈرن لبرل جمہوری نظام میں قانون کی حکمرانی کی غالب ترین نظریاتی تفہیم ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ فرد اس حد تک آزاد ہے کہ حکومت فرد کی نجی خودمختاری کی قابلِ حرمت (ناقابلِ خلاف ورزی) دنیا میں مداخلت نہ کرنے کی پابند ہے۔ اکثر اوقات تحفظات کو شہری حقوق یا آزادیاں کہا جاتا ہے اور ان کا ذکر انسانی حقوق کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعلانات میں کیا جاتا ہے۔ یہ پابندیاں ٹھوس اور حقیقی یا محض کارروائی کی حد تک ہو سکتی ہیں۔ بہرحال یہ شخصی آزادی ہے۔ شخصی آزادی خودمختاری کا وہ کم سے کم درجہ تشکیل دیتی ہے جو قانون کے تحت رہنے کی رضامندی دینے کے باوجود افراد اپنے پاس رکھتے ہیں۔ یہ ان تحفظات پر مشتمل ہوتی ہے جو 'مل' کی اس آزادی کے اثرات کی اجازت کے لیے ضروری ہوتے ہیں..... جو ہماری اپنی بہتری کی جستجو اپنے انداز میں کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ یہی چیز کسی لبرل ریاست کو معاشرے میں ہر ایک پر اچھائی (خیر) یا بہتری کا مخصوص روپ یا نقطۂ نظر ٹھونسنے سے روکتی ہے۔ جب شخصی آزادی تسلیم کر لی جاتی ہے تو یہ امکان میں غیر یقینی اور اجزا کے اعتبار سے متنوع ہوتی ہے۔ حسب معمول محفوظ شدہ حلقہ (شخصی آزادی) کے خدوخال کے بارے میں عدم اتفاق پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس بات میں بھی عدم اتفاق ہے کہ ان خدوخال کا تعین کیسے کیا جائے۔ اس میں عام طور پر مذہب اور ضمیر کی آزادی' اظہار رائے اور سیاسی نظریات کی آزادی' اذیت رسانی اور ظالمانہ سزاؤں سے آزادی اور کسی کو اپنی زندگی کی اقدار اور معاش کے انتخاب کی آزادی شامل کی جاتی ہے۔ نجی زندگی (ذاتیات) یا ذاتی وقار کے وسیع تر حلقہ کے حوالے سے بھی زوردار جملے استعمال کیے گئے ہیں۔ یو ایس سپریم کورٹ نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

> ''آزادی سے مراد ذات کی ایسی خودمختاری ہے جس میں سوچ' عقیدے' اظہار اور مخصوص ابلاغی رویہ کی آزادی شامل ہے۔''

زیر سطح ضروری تصور یہ ہے کہ افراد حکومت کی مداخلت سے آزاد رہتے ہوئے جسم اور ذہن کی یک جہتی کے حقدار ہیں۔ یہی تصور لبرل روایت میں آزادی کا معیاری نقطۂ نظر ہے۔

اور آخری یا چوتھا پہلو یہ ہے کہ آزادی کو اس وقت فروغ ملتا ہے جب حکومت کے اختیارات مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ شعبے مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ ہیں۔ (یہ تقسیم افقی ہوتی ہے) کچھ شعبوں میں یہ تقسیم عمودی ہوتی ہے جس میں میونسپل'

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریجنل اور نیشنل یا ضلعی' صوبائی اور قومی سطح پر اختیارات کی تقسیم ہوتی ہے۔ اس میں قانون کا اطلاق آزاد عدلیہ کے سپرد ہوتا ہے۔ یہ تقسیم تمام تر اختیارات کو ایک ادارے میں جمع ہونے سے روک کر آزادی کو فروغ دیتی ہے اور اس میں حکومت اپنے مختلف شعبوں کے باہمی انحصار پر کام کرتی ہے۔ عدالتی ڈھانچے کی دیگر حکومتی اداروں سے علیحدگی خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک آزاد عدلیہ کو قانون کے نفاذ کی ذمہ داری سونپنا اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ ایک مکمل قانونی ادارہ حکومت کے اقدامات کے قانونی جواز کو پرکھنے کے لیے دستیاب ہے۔ یہ آزادی کا ادارہ جاتی تحفظ ہوتا ہے۔ آزادی کی یہ صورت ادارہ جاتی ڈھانچوں اور طریقۂ کار کو مشروط کرتی ہے کہ شہریوں کی آزادی کی عملی تعبیر کے امکانات کو حکومت کے اختیارات کی مؤثر تقسیم کے ذریعے وسعت ملے۔ یہ پہلو کیفی اعتبار سے سابقہ تینوں پہلوؤں سے مختلف ہے۔ اس میں بذات خود آزادی کی ایک قسم کی بجائے آزادی کے مختلف فروغ کے لیے ڈھانچہ جاتی انتظام ہوتا ہے۔

آزادی کی پہلی تینوں صورتوں میں سے ہر ایک اپنے انداز میں خود اختیاری کے ایک مختلف رنگ کا جواز پیش کرتی ہے۔ سیاسی آزادی افراد کو اجازت دیتی ہے کہ وہ (اجتماعی طور پر) ان اصولوں اور ضابطوں کا تعین کریں جن کے تحت انہوں نے زندگی بسر کرنا ہے۔ قانونی آزادی افراد کو اجازت دیتی ہے کہ وہ ان اصولوں اور ضابطوں سے آگاہی کے ساتھ اور ان کی مطابقت کے ساتھ جو چاہیں اپنی مرضی کے مطابق کریں۔ شخصی آزادی افراد کو یقین دلاتی ہے کہ وہ اپنے لیے اس خودمختاری کا ایک کم از کم درجہ متعین کر لیں جس کی انہیں خواہش ہے۔ تاہم ان آزادیوں میں سے کوئی ایک بھی مطلق یا بے پایاں نہیں ہے۔ پہلی آزادی دوسرے افراد کی شرکت اور تعاون کو مشروط کرتی ہے۔ دوسری آزادی کی حدود مروجہ قانون کی ممانعتیں متعین کرتی ہے۔ خودمختاری کا جو امکان تیسری آزادی مہیا کرتی ہے وہ دوسرے افراد کی مساوی خودمختاری اور ریاست کی ضروریات کی حدود میں پایا جاتا ہے۔ حدود و قیود کا ایک الگ سیٹ ان افراد پہ نافذ کیا جاتا ہے جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ حق خود اختیاری کے استعمال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مثلاً بچے' ذہنی معذور اور مجرم جبکہ پچھلے زمانوں میں خواتین' غلاموں اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نوآبادیاتی محکوموں کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے لازمی تعلیم جیسے اقدامات بچوں اور نوجوانوں کے لیے ان کی آزادی کو مجروح کیے بغیر زیرِعمل لائے جا سکتے ہیں۔

ماڈرن لبرل جمہوری نظام اس تشکیک آمیز سوال جس کا ذکر ابتدا میں ہوا تھا کہ..... قانون کا پابند فرد کس طرح آزاد کہلا سکتا ہے؟ کا جواب چاروں اقسام کی آزادیوں کے گہرے امتزاج کی صورت میں دیتے ہیں۔ کسی جمہوری نظام میں شہری وہ قوانین تخلیق کرتے ہیں جن کے تحت وہ زندگی بسر کرتے ہیں (سیاسی آزادی) حکومتی عمال شہریوں کے خلاف ان قوانین کے مطابق کارروائی کرتے ہیں (قانونی آزادی)۔ پہلی آزادی کی رو سے وہ خود پہ حکمرانی کرتے ہیں دوسری کی رو سے ان پر ان قوانین کی حکمرانی ہوتی ہے جن کو وہ خود تخلیق کرتے ہیں۔ اس طرح شہری کسی بھی مقام پر کسی دوسرے فرد کی حکمرانی میں نہیں ہوتے۔ مزید برآں شہری ایک انفرادی خودمختاری کے خصوصی طور پر محفوظ حلقہ کے مالک ہوتے ہیں جو قانون کی مداخلت کو روکتی ہے (شخصی آزادی)۔ لبرل جمہوری نظام مخصوص انداز میں اس امتزاج کو اختیارات کی علیحدگی کی کوئی شکل استعمال کرتے ہوئے ساتھ رکھتے ہیں۔ بالخصوص آزاد عدلیہ کے ساتھ (آزادی کا ادارہ جاتی تحفظ)۔ کم وبیش کسی استثنا کے بغیر (برطانیہ ایک نمایاں جزوی استثنا ہے) یہ انتظام ایک تحریری آئین کی شکل میں رائج ہے جو حکومت کے عمال اور شہریوں کے لیے واجب' لازم اور آزاد عدالتوں کے ذریعے نافذالعمل ہوتا ہے۔ مسلمہ طور پر ثابت شدہ ہے کہ یہ لبرل تعمیر مکمل طور پر قانونی ہے۔ قانون وہ داخلی ڈھانچہ ہے جو لبرل سسٹم کو تھامتے ہوئے ایستادہ رکھتا اور اسے مخصوص شکل اور استحکام دیتا ہے۔

آزادیوں میں کشیدگیاں

اگرچہ یہ چاروں جواب عموماً اکٹھے پائے جاتے ہیں لیکن اس کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ یہ آسان معاملہ ہے۔ قانونی آزادی' شخصی آزادی اور ادارہ جاتی آزادی (کا تحفظ) یہ سب سیاسی آزادی کے ساتھ بیک وقت برقرار رہ سکتی ہیں مثلاً ایک ایسے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظام میں جس کے قوانین ایک غیر جمہوری اشرافیہ (فلاسفر یا علما) وضع کرتی ہے اور جس کا خواب یوٹوپیائی فلاسفر دیکھتے رہے ہیں۔ یقیناً بہت ٹھوس دلائل دیئے جا سکتے ہیں کہ اشرافیہ کا وضع کردہ نظام کسی جمہوری نظام کے برعکس زیادہ سے زیادہ قانونی اور شخصی آزادی دے سکتا ہے۔ لیکن یہ تجویز ایک مشکل پیدا کرتی ہے کہ اگرچہ اشرافیہ پر مشتمل نگران یا محافظوں کی طرف سے بدعنوانی کے امکانات کسی حد تک ختم بھی کر دیئے جائیں۔ پھر بھی سیاسی آزادی کی ضرورت اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔ حکومت خود اختیاری کو اسی لیے وسیع طور پر ترجیح دی جاتی ہے' چاہے کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ حکمرانی کی جائے۔

قانون اور آئین کے نظریات دان اکثر اوقات یہ نکتہ اٹھاتے ہیں کہ قانونی آزادی (قانون کی حکمرانی کی صورت میں) سیاسی آزادی (جمہوریت) کے بغیر بھی برقرار رہ سکتی ہے۔ محض عوام الناس سے وعدے اور قانون میں خودمختاری اور مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ میں امتیاز کی کوئی جمہوری اہمیت نہیں۔ ایک غیر جمہوری قانونی نظام ممکن ہے اصولی طور پر قانون کی حکمرانی کے تقاضوں سے مطابقت رکھتا ہو اور اس کی رون خیال مغربی جمہوریتوں کی اکثریت سے زیادہ بہتر ہو۔ کچھ نظریات دانوں نے استدلال پیش کیا ہے کہ ججوں کی طرف سے بڑھتے ہوئے دلائل کی بدولت قانون کی حکمرانی نے سخت گیر جمہوریت کے پھیلاؤ اور حقیقی اثر میں ایک واضح رکاوٹ بننے کا کردار ادا کیا ہے۔ قانون کی حکمرانی اور جمہوریت کے درمیان تعلق غیر متشکل ہے۔ قانون کی حکمرانی جمہوریت کے بغیر بھی قائم رہ سکتی ہے لیکن جمہوریت کو قانون کی حکمرانی کی ضرورت ہے کیونکہ بصورت دیگر جمہوری طریقے سے بنائے گئے قوانین اطلاق کے مرحلہ میں آ کر ممکن ہے پس پشت ڈال دیئے جائیں۔

قانونی آزادی شخصی آزادی کے بغیر آسانی سے قائم رہ سکتی ہے۔ نان لبرل حکومتیں قانون کی حکمرانی کے ساتھ اس کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔ ایک فرد جو قانون کی اجازت سے کھلی جگہوں میں آزاد ہے اس بارے میں کچھ نہیں کہتا کہ یہ کھلی جگہیں کتنی وسیع (یا تنگ) ہونی چاہئیں۔ قانونی آزادی افراد پہ سخت قسم کی پابندیوں سے متاثر نہیں ہوتی کیونکہ یہ صرف اتنا چاہتی ہے کہ حکومت کے اقدامات پہلے سے مشتہر کردہ قوانین سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطابقت رکھتے ہوں۔ یہ قوانین کے اجزا پر نکتہ چینی نہیں کرتی۔ بنجمن کانسٹنٹ نے دو صدیاں پہلے مونٹیسکیو کی طرف سے آزادی کی تعریف کی ناموزونیت کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا تھا..... ''یقیناً اسے آزادی نہیں کہا جا سکتا جب لوگ وہ کچھ نہ کر سکیں جس کی اجازت انہیں قوانین دیتے ہیں۔ لیکن قوانین ایسی بہت سی چیزوں پہ پابندی عائد کر سکتا ہے جن سے آزادی یکسر ختم ہو جائے۔ استبدادی قوانین رکھنے والی کوئی حکومت احتیاط کے ساتھ ان قوانین پہ عملدرآمد کر کے قانونی آزادی کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس طرح کے نظاموں میں زیادہ قانونی آزادی شخصی آزادی کے لیے بدترین ہوتی ہے۔ یہاں بھی تعلق غیر متشاکل ہوتا ہے۔'' شخصی آزادی قانون کی حکمرانی کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتی۔ کم از کم ایسی صورت میں نہیں جب یہ قانونی طور پر قابل نفاذ حقوق کے اندر پائی جاتی ہو۔

آزادیوں کے امتزاج میں غالباً سب سے بڑا مسئلہ شخصی آزادی اور سیاسی آزادی کے درمیان قوی تنازعہ ہے۔ یسعیاہ برلن نے کہا تھا: ''شخصی آزادی اور جمہوری حکمرانی کے درمیان کوئی ضروری تعلق نہیں ہے۔'' اس سوال کا جواب کہ ..... مجھ پہ کون حکومت کرتا ہے؟ منطقی طور پر اس سوال سے مختلف ہے کہ..... حکومت کہاں تک میرے معاملات میں مداخلت کرتی ہے؟'' شخصی آزادی کا ہدف حکومتی اختیار کو افراد کے خلاف استعمال ہونے سے روکنا ہے جبکہ سیاسی آزادی کا ہدف وہ قوت حاصل کرنا ہے جو اس اختیار کو استعمال میں لاتی ہے۔ اول الذکر کی تشویش وہ جبر و استبداد ہے جو افراد کے ساتھ روا رکھا جا سکتا ہے اور اگر یہ جمہوریت کی پیداوار ہو تو تب بھی کم شدت نہیں رکھتا آخر الذکر کی تشویش یہ طے کرنا ہے کہ کون قانون سازی کے ذریعے سماجی اور سیاسی کمیونٹی کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا ہدف ہے جس کو شخصی آزادی کی طے کردہ حدود روکتی ہیں۔ یہ تنازعہ دو متصادم نظریات کے درمیان جنگ کی نمائندگی کرتا ہے۔ کمیونٹی کے مفاد میں اجتماعی حکومت خود اختیاری بمقابلہ افراد کی خواہش کہ انہیں اپنی مرضی پہ چھوڑ دیا جائے۔'' یہ ایک اکلوتے تصور کی دو مختلف تعبیریں نہیں ہیں بلکہ زندگی کے دو نہایت گہرے اختلافی اور ناقابل مفاہمت رویے ہیں۔ ان دونوں مطالبوں کو مکمل طور پر کبھی پورا نہیں کیا جا سکتا۔''

لبرل عناصر نے روایتی طور پر شخصی آزادی کو جمہوریت کے مقابلہ میں ہمیشہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فائق وممتاز قرار دیا ہے۔ زیادہ تر ابتدائی لبرل تو عوامی جمہوریت کے خلاف تھے۔ ان کا موقف تھا کہ اس انداز حکمرانی میں حکومت جاہل اکثریت کے پاس آ جائے گی۔ یہ اشرافیہ کے لیے خطرہ اور بدنظمی کو کھلی دعوت ہوگی۔ اگر چہ کانٹ کے اس دعویٰ کی طرح لبرل لوگ بظاہر جمہوریت نواز جذبات رکھتے ہیں کہ..... ایک فرد کے پاس قانونی آزادی ہوتی ہے کہ وہ ایسے قوانین پہ عملدرآمد نہ کرے جن کی اس نے رضامندی نہیں دے رکھی۔ لیکن یہ خیال اتنا فیاضانہ نہیں جتنا بظاہر محسوس ہوتا ہے کیونکہ کانٹ تمام ''مجہول'' لوگوں کو ووٹ دینے کا اہل قرار نہیں دیتا۔ ان مجہول شہریوں میں وہ نوآموزوں' غلاموں' تمام عورتوں' کھیت مزدوروں' مختصر یہ کہ ان تمام افراد کو ووٹ دینے کا حقدار نہیں سمجھتا جو دوسروں کے زیر کفالت یا زیر حفاظت ہوں۔ کچھ ممتاز جدید لبرل نظریات دان استدلال پیش کرتے ہیں کہ شخصی آزادی کو درپیش سنگین خطرہ نمائندہ جمہوریت سے ہے۔ چونکہ غریبوں کی تعداد ہمیشہ اور ہر جگہ امیروں سے زیادہ ہوتی ہے چنانچہ نظری اعتبار سے جمہوری ریاست نجی املاک کے حقوق پر کوئی قدغن لگانے میں آزاد ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ ان خدشات کے پیش نظر جب کانٹ جیسے لبرل نظریات دان قانون کے لیے رضامندی پر اصرار کرتے ہیں تو اکثر اوقات ان کا مطلب حقیقی انداز کی رضامندی نہیں بلکہ ایک فرضی سی رضامندی ہے۔

چار قسم کی آزادیوں میں پائی جانے والی یہ کشیدگیاں نظرانداز نہیں ہوسکتیں کیونکہ ناگزیر ہیں اور باہم قابل عمل نہیں۔ ہر لبرل جمہوری نظام مختلف طریقوں سے ان میں مصالحت پیدا کرتا ہے۔ لبرل ازم میں ایک اور بنیادی تناؤ آزادی اور مساوات کے درمیان کشیدگی ہے۔ جب بھی کوئی غیر مساوی تقسیم (اثاثوں کی بشمول دولت اور صلاحیت) ہوتی ہے تو آزادی کو کسی نہ کسی حد تک بروئے کار لانا پڑتا ہے تاکہ اعلیٰ تر مساوات یقینی بنائی جاسکے۔ لبرل ازم کی ان دو اقدار کے درمیان کشیدگی میں ہم آہنگی پیدا کرنا جو لبرل سوشل ویلفیئر ریاستوں کی ایک بڑی ذمہ داری ہوتی ہے' اگلے ابواب میں زیر بحث لایا جائے گا کیونکہ یہ قانون کی حکمرانی کے انحطاط کے مغربی دعوؤں میں بنیاد بنائی گئی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لبرل ازم کا سوشل کلچرل تناظر

لبرل ازم کا مکمل احاطہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان تصورات کو زیرِ غور نہ لایا جائے جو اٹھارہویں صدی کی روشن خیالی کے اردگرد پائے جاتے ہیں۔ روشن خیالی کا بنیادی عقیدہ عقل اور سائنس کا اطلاق جبکہ جہالت اور ضعیف الاعتقادی کا خاتمہ تھا۔ آئزک نیوٹن کی فزکس نے کچھ ایسے قوانین مہیا کیے جو زمین اور آسمان میں تمام مادے کے مقام اور حرکت کی پیشین گوئی کر سکتے تھے۔ چنانچہ فطرت کے بارے میں ماضی کی تمام تر پُراسراریت کا دھندلکا ختم کرنے کے لیے سائنس کی غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ عمل میں آیا۔ اس عظیم تر پیش رفت کے بعد ہر چیز کے بارے میں سمجھ لیا گیا کہ یہ انسانی فہم کی رسائی میں ہے۔ روشن خیال فلاسفروں کا نمایاں کام یہ رہا کہ انہوں نے عقل اور سائنس کا اطلاق سماجی' سیاسی' قانونی' معاشی اور اخلاقی دائروں تک بڑھا دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان کی سائنس کو اس طرح ترقی دی جا سکتی ہے کہ وہ حکومت اور معاشرے کی تشکیل مخصوص انداز میں کرنے کی اجازت دے کر ایک منصفانہ اور باشعور زندگی کو ابھارے۔ رجائیت پسندی کا حتمی ہدف ایک درست ترین معاشرے کی تخلیق سے کم کچھ نہیں تھا۔ رسم و روایات اور چرچ کی تعلیمات ان دنوں حکومت و اختیار کا سب سے بڑا ذریعہ تھا' بعد میں یہ سخت قسم کی جانچ پرکھ کا نشانہ بنے۔ حکومت اور قانون بلکہ ہر ایک سماجی ادارے کو اپنا معقول جواز پیش کرنا پڑا' بصورت دیگر وہ متروک ہو گیا۔ افراد اور معاشرے کے مفادات نے مرکزی حیثیت اختیار کر کے خدا اور آخرت کے وعدوں کی جگہ لے لی۔

سولہویں صدی کی اصلاحات سے چھڑنے والی باہمی خونریز لڑائیوں کے کچلے ہوئے عیسائیوں کو اٹھارہویں صدی کی روشن خیالی اور لبرل ازم کے راستہ پر چلنے میں مدد ملی۔ کھلے عام چرچ کے عقائد کو چیلنج کیا گیا جو ایک ہزار سال سے غلبہ پائے ہوئے تھے۔ پروٹسٹنٹ ازم نے خدا کے ساتھ فرد کے براہِ راست ذاتی تعلق کے حوالے سے انفرادیت کی ایک قسم کو فروغ دیا جس میں چرچ کی ضرورت نہیں تھی۔ پروٹسٹنٹوں اور کیتھولیکوں کے درمیان بعض [illegible] نے قتلِ عام کا بازار گرم کیا اور دونوں فریق نڈھال ہو کر رہ گئے۔ انجام

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کار در گزر پر مبنی جنگ بندی عمل میں آئی۔ تمام تر تنازعہ کی بنیادی حقیقت نے واضح شواہد پیش کیے کہ مذہب نے علم کے لیے غیر محفوظ بنیادیں فراہم کی تھیں۔ قرون وسطیٰ سے عیسائیت نے ایک مجموعی عالمی نقطۂ نظر تشکیل دے رکھا تھا جس میں سیاسیات' قانون' اخلاقیات' اقتصادیات اور فطری مظاہر کے بارے میں تصورات شامل تھے۔ لیکن چرچ کی تعلیمات کے بارے میں شکوک وشبہات کو ایسے باقاعدہ سوال میں تبدیل نہیں کیا جا سکا تھا جو زندگی کے تمام پہلوؤں کو زیر بحث لائے۔

لیکن اس مجموعی سوال کے نتیجہ میں اخلاقی بے یقینی جیسی تباہی آئی جو آج بھی گمراہ کن میراث کی صورت میں موجود ہے۔ قرون وسطیٰ کے عقائد کے مطابق اخلاقی حق اور فطری قانون کا استنباط بائبل کے صحیفوں سے ہوسکتا تھا اور اس کی تفسیر چرچ کرتا تھا یا پھر خدا کی طرف سے انسان کو ودیعت کردہ عقل کے ذریعے ممکن تھا۔ روشن خیال فلاسفروں کو یقین تھا کہ اخلاقی حقوق اور فطری قوانین کے لیے ایک نئی سیکولر اساس انسانی فطرت کا عقل کے ذریعے مطالعہ کر کے مہیا کی جا سکتی ہے جو ان کے خیال کے مطابق آفاقی ہے۔ یہ کوشش بہت سے اسباب وعلل کے امتزاج کو لے کر آگے بڑھی۔

مغرب سے باہر کی دنیا کی کھوج جو روشن خیالی کی ہم عصر تھی' متعدد غیر متوقع رسم ورواج اور اخلاقی نظاموں سے متعارف ہوئی۔ اگرچہ اشتراک کا فقدان تھا لیکن کچھ اقدار اور روایات اگر غلط تھیں تو بقیہ یقینی طور پر درست تھیں۔ البتہ ان کو پرکھنے کا کوئی ایسا معیار موجود نہیں تھا جو ایک اخلاقی نظام کو دوسرے سے بہتر ثابت کر سکے۔ بہت سے مفکرین مغربی تہذیب کو برتر سمجھتے تھے جبکہ کچھ مفکرین کے نزدیک ''ابتدائی'' نظام مثالی تھے جو انسانی زندگی کی خالص ترین اور گم گشتہ صورت تھے۔ کچھ مفکرین کا اصرار تھا کہ اخلاقی عقائد کی ایک مشترکہ اساس معاشروں کے درمیان پائے جانے والے بظاہر اختلافات کے نیچے موجود ہے۔ لیکن ڈیوڈ ہیوم کا یادگار فلسفیانہ استدلال ''ہے'' کو ''ہونا چاہیے'' سے الگ کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ روایتی بیانات ایک مختلف معیاری قسم پر مبنی ہوتے ہیں۔ توصیفی بیانات سے ان کا استخراج نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا بے کار ثابت ہوتا ہے کہ اخلاقی روایات مشترکہ اقدار یا اخلاقیات سے پھوٹتی ہیں۔ یہ حقیقت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ ایک اخلاقی روایت وسیع طور پر زیرِعمل ہے اس بات کا بذات خود تقاضا نہیں کرتی کہ اسی کو اپنایا جائے۔ اس فلسفیانہ نکتہ کی عملی دانش اس حقیقت سے عیاں ہے کہ غلامی کا رواج بہت سے معاشروں میں مشترکہ طور پر پایا جاتا تھا جبکہ خواتین کی ثانوی حیثیت ابھی تک بہت سے معاشروں میں موجود ہے۔ ہیوم کا استدلال ایسے کسی اخلاقی نظام کو مزید ناقابل قبول قرار دیتا ہے جو محض ''موجود ہے'' کی بنیاد پر استوار ہے۔ حالانکہ اسے اس بنیاد پر ہونا چاہیے کہ ہم کیسے انسان ہیں اور ہمارا طرزِعمل کیا ہونا چاہیے۔ ایک اور بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ انسان زیادہ تر وہ کچھ کرتا ہے جو ''شر'' ہے (بظاہر اپنی فطرت کے مطابق ہے)۔ چنانچہ محض ایک انسانی فطرت کا مطالعہ اس بات کا تعین نہیں کر سکتا تھا کہ درست ترین اخلاقی رویہ کون سا ہے۔ ایک کم سے کم حقوق کا فطری قانون جو کسی انسانی کمیونٹی میں بقا کے لیے ضروری حالات کے مطابق وضع کیا گیا ہو ایک بہتر قابل عمل حکمت عملی تو ہو سکتا ہے لیکن یہ اعلیٰ تر آدرش سے محروم ہوگا جسے مشکل ہی سے اخلاقیات کا نام دیا جا سکے گا۔ ایک ایسا قانون جو انسانی فلاح و بہبود کا آدرش رکھتا ہو سب سے پہلے یہ طے کرے گا کہ انسانی فلاح و بہبود سے مراد کیا ہے۔ پھر اسے مختلف متبادل راستوں میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا ہوگا جس پر چل کر فلاح و بہبود کی منزل حاصل ہو سکے۔

روشن خیال یوٹوپیائی پراجیکٹ کو ایک شدید دھچکا رومانویت پسندوں نے پہنچایا۔ انہوں نے آفاقیت کی بنیادی خواہش اور پوسٹگی کو چیلنج کر دیا۔ ہیوم کی مدد سے عقل کے امکانات کو چیلنج کرتے ہوئے تخصیص' ارادے' تخلیقیت اور جذبے کی وکالت کی گئی۔ انہوں نے معاشروں کو بنفسہٖ مکمل قرار دیا کہ وہ اپنی الگ الگ اقدار اور غیر متناسب دنیا رکھتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے پاس اتنے ہی مکمل فلسفہ ہائے حیات ہوں جتنے معاشرے ہیں۔ جن میں ہر ایک کا جزا و سزا کا اپنا تصور ہے تو پھر ایک مکمل ترین معاشرے کے امکان کا تصور منطقی طور پر ناممکن ہے۔

ایک مطلق یا آفاقی اخلاقی اصولوں کے قیام کی روشن خیال کوشش کی ناکامی کے بعد بہت سے مفکرین ''حتمی خیر'' کی کلاسیکل تلاش سے دست کش ہو گئے۔ انہوں نے کسی ایسے ''اکلوتے خیر'' کی موجودگی کا تصور ہی ناممکن قرار دے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بالکل معدوم نہیں تو کم از کم یقینی طور پر شناخت نہیں کیا جا سکتا۔ اس منطق کا یک نتیجہ یہ نکلا کہ اخلاقیاتی تکثیریت کو تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن یہ ایسی انتہا تھی جسے بہت سے روشن خیال مفکرین ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس منطق کا ایک اور نتیجہ انیسویں صدی میں افادیت پسندی پر مبنی اخلاقیات کے نظریہ کی صورت میں ابھرا۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ ''خیر'' یا بہتری وہ ہے جس کی خواہش لوگ کریں یا جس سے مسرت حاصل کریں۔ چنانچہ اس کے مطابق معاشرے اور اس کے اداروں کی تشکیل اس طرح کی جائے کہ معاشرے میں موجود افراد کی مسرت کی مجموعی مقدار میں اضافہ اور اذیتوں میں کمی آئے۔ ایک اور ردعمل یہ ہوا کہ طریقۂ کار پر زور دیا جانے لگا۔ اس ضمن میں استدلال یہ تھا کہ اخلاقی اصولوں کے اجزا یقینی نتائج پیدا کرنے میں دھوکہ دے جاتے ہیں۔ شاید اس کے بدلے ایک ایسا سمجھوتہ شفاف طریقۂ کار پر ہو سکتا ہے جسے معاشرے کو متاثر کرنے والے فیصلوں کے وقت اپنایا جا سکتا ہے۔ لبرل ازم اس معاملے میں کتنا مؤثر اور کس طرح کا طریقۂ کار رکھتا ہے' اس کی وضاحت آگے آئے گی۔

لبرل ازم کے قلب میں موجود آزادی کو اب بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے نشاندہی کی جا چکی ہے آزادی یہ ہے کہ ایک فرد بہتری کی اپنی بصیرت پر عملدرآمد کر سکے۔ اسے چاہے یہ سمجھا جائے کہ یہ ایسا بہترین طریقہ ہے جس پر چل کر مجموعی مسرت کو زیادہ سے زیادہ ممکن بنایا جا سکتا ہے یا یہ سمجھا جائے کہ یہ ایسی ناقص صورت حال ہم پر نافذ کی گئی ہے جو اکلوتی آفاقی اخلاقیات کی نشاندہی نہ کر سکنے کے نتیجہ کا جبر ہے یا پھر ایسی درست صورت حال ہے جو زندگی کی مختلف شکلوں یا معاشروں سے وابستہ اچھائیوں پر مشتمل ہے۔ نتیجہ وہی ہے کہ لبرل ازم ایک ایسے انداز میں تعبیر ہوتا ہے جس میں اخلاقیاتی تکثیریت کو سمیٹ لیا جاتا ہے۔

اخلاقیاتی تکثیریت (Moral Pluralism) دو متبادل شکلوں میں لبرل ازم میں کام کرتی ہے اور یہ دونوں شکلیں ایک ساتھ قائم رہ سکتی ہیں۔ ابتدائی مغربی شکل ایسی اخلاقیاتی تکثیریت پر مبنی ہے جو کسی آزاد معاشرے کے افراد کے نقطۂ ہائے نظر تشکیل دیتے ہیں۔ ایک ثانوی شکل اس وقت وجود میں آتی ہے جب ایک سے زیادہ مختلف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کمیونٹیاں یا معاشرے (لبرل یا نان لبرل) ایک ہی نظام کے دائرۂ کار میں بیک وقت موجود ہوں۔ دونوں صورتوں میں لبرل ریاست اچھائی یا بہتری کے لیے موجود مختلف تصورات کے لیے غیر جانبدار رہتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ریاست کی حیثیت سے یہ کسی ایک خیر یا مذہب کو دوسروں پر نافذ کرنے کے لیے نہ تو اپناتی ہے اور نہ اس کو فروغ دیتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ان عناصر کو روکتی اور پابندی عائد کرتی ہے جو لبرل ریاست کی بقا کے لیے خطرہ بنتے ہیں۔ خیر کے لیے پائے جانے والے تصورات کو موجود رہنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ باہم مقابلے کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہیں پنپنے، ترقی پانے، تبدیل ہونے یا تحلیل ہونے دیا جاتا ہے۔ لبرل اصولوں کو مجروح نہیں کیا جاتا اور کم از کم لبرل ازم کی زیادہ تر صورتوں میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ریاست مختلف سماجی اچھائیوں کے فروغ کے لیے تعلیم یا اعانتی اقدامات کو استعمال کر رہی ہوتی ہے، جن میں آرٹ اور موسیقی شامل ہیں یا پھر نوجوانوں میں رواداری اور فرد کی خودمختاری جیسی لبرل اقدار کو فعال انداز میں راسخ کرتی ہے۔ لیکن ریاست اقدار کے کسی مخصوص سیٹ کے لیے جبر نہیں کرتی۔

بظاہر غیر جانبدارانہ موقف کا مطلب بہر حال یہ نہیں ہے کہ لبرل نظام مکمل طور پر غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ دو اہم اعتبارات سے غیر جانبدار نہیں ہوتے۔ مغرب کی لبرل حکومتیں موقف اختیار کرتی ہیں کہ غیر جانبداری ہی وہ راست اصول ہے جس پر کوئی حکومت اور نظام قانون تعمیر کیا جانا چاہیے۔ اس غیر جانبداری کو حکومتی اختیارات رکھنے والے افراد منسوخ نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا اس وقت لبرل ازم خود کو پھر سے صادر کرنے میں ناکام نہیں رہتا جب جمہوری انتخابات میں اینٹی لبرل اور متعصب گروہ کامیاب ہو کر نان لبرل حکومت تشکیل دے لیتا ہے۔ لبرل نظام اس اعتبار سے بھی غیر جانبدار نہیں ہوتے کہ شخصی حقوق کو دی جانے والی فضیلت معاشرے کی اولین اور اہم ترین سمت برقرار رکھنے کے لیے پابندیاں عائد کرتی ہے۔ ان اسباب کی بنا پر نان لبرل ذیلی گروہ جو لبرل ڈھانچوں میں متوازی سطح پر رہتے ہیں خود کو متصادم سمجھتے ہیں اور خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی اقدار شکست و ریخت کی شکار ہو جائیں گی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لبرل غیر جانبداری ریاست اور قانون کے سابقہ نکتہ ہائے نظر میں ایک انقلابی تبدیلی لاتی ہے۔ کلاسیکل یونانی نقطۂ نظر میں ریاست اور قانون کی سمت نیکی اور اجتماعی زندگی (اشرافیہ اور جنگجوؤں) کا فروغ تھی۔ قرون وسطیٰ کے نقطۂ نظر میں ریاست اور قانون کا کردار زمین پر مسیحی زندگی اور کمیونٹی کی تخلیق اور دوام تھا۔ دونوں نکتہ ہائے نظر میں قانون نیکی اور زندگی کے ایک مشترکہ طریقے (اور ایک مشترکہ مقصد) کے طاقتور تصور کا عکاس تھا۔ لبرل نقطۂ نظر کے تحت یہ ضروری نہیں ہے کہ زندگی کا ایک مشترکہ دستور ایسے معاہدے سے بالاتر ہو کیونکہ افراد کے لیے بہتر یہ ہوتا ہے کہ انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جو مقاصد وہ چاہتے ہیں' اپنے پسندیدہ طریقے سے حاصل کریں۔ اس کے برعکس ایک کمیونٹی جو مشترکہ اقدار کے تحت اپنی سالمیت رکھتی ہو' ایسے افراد کا اجتماع ہوتی ہے جو عدم مداخلت کے ایک باہمی معاہدے کے تحت اکٹھے ہوتے ہیں۔

اشتمالیت پسندی اور لبرل ازم کا موازنہ

لبرل ازم کو سمجھنے کا ایک اور طریقہ کمیونی ٹیرین ازم (اشتمالیت پسندی) کا موازنہ ہے۔ اسے یہاں نہایت سادہ اصطلاحوں میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسی کوشش کو علم سیاسیات میں اینٹی تھیسز تقابل یا تضاد کہا جاتا ہے۔ کمیونی ٹیرین ازم کا ابتدائی نقطۂ کمیونٹی ہے' فرد نہیں۔ کمیونٹی پہلے سے موجود ہوتی ہے اور اس کے ارکان (افراد) کی پیدائش واموات کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کمیونٹی ایک موجودگی یا اپنے ہونے کا اظہار رکھتی ہے جس کے نتیجہ میں محض افراد کا ایک اجتماع نہیں بلکہ ایک برتر تنظیم ابھرتی ہے۔ کمیونٹیوں کا اپنا ایک مفاد ہوتا ہے یعنی کمیونٹی کے طرز حیات کی بقا۔ اور یہ ہر فرد کے مجموعی مفادات سے مختلف اور اس سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ تہذیب' ثقافت' زبان اور تاریخ کسی کمیونٹی کا وہ گہوارہ ہوتے ہیں جس میں افراد کی پرورش کی جاتی ہے۔ افراد کی شناخت کی تشکیل اور تعین کمیونٹی میں اس کے مقام سے بنتی ہے۔ خیر یا اچھائی کے تصورات کمیونٹی اور مشترکہ طرز حیات تخلیق کرتے ہیں۔ افراد کے لیے زندگی کے معنی کمیونٹی کی مشترکہ زندگی میں اپنا کردار ادا کرنے سے بنتے ہیں ناں کہ ایک خودمختار فرد کی حیثیت سے ذاتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مفادات کی تکمیل کرنے سے۔ حقیقت میں افراد نہ تو خودمختار ہوتے ہیں اور نہ ہی ذاتی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ کمیونٹی کی مخلوق ہوتے ہیں جو انہیں پیدا کرتی' پرورش کرتی اور زندگی بھر انہیں ملفوف رکھتی ہے۔ ان کی پسند اور انتخاب سماجی سطح پر پیدا شدہ متبادلات تک محدود اور سماجی اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔ کمیونی ٹیرین تفہیم میں فضیلت افراد کی بجائے مختلف طریقوں سے کمیونٹی کو دی جاتی ہے۔

کمیونی ٹیرین نظام میں قانون کمیونٹی کی مشترکہ اقدار اور مفادات کا عکاس ہوتا ہے۔ قانون سازی کمیونٹی کی زندگی اور کلچر میں جبلی طور پر پائے جانے والے مفادات اور اقدار کی نشاندہی اور اعلان کا معاملہ ہوتی ہے۔ قانون پُرزور انداز میں غیر جانبدار نہیں ہوتا بلکہ کمیونٹی کے دستور حیات اور مفادات سے مطابقت رکھتا اور اسے نافذ کرتا ہے۔ وسیع طور پر موجود مشترکہ اقدار اور روایتی قانون کی بدولت قانون سازی کو نہ تو نمایاں کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ضخیم بنانے کی۔ تنازعات کی فیصلہ سازی ضابطہ پسندی کے تحت نہیں بلکہ اس نقطۂ نظر کے تحت کی جاتی ہے جو کمیونٹی کے مفادات کو فروغ دے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ حکومتی استبداد سے بچنے کے لیے افراد کو مختلف قسم کی آزادیاں دینے کی بجائے کمیونی ٹیرین نظام میں حکومتی اختیارات پر کسی قسم کی پابندیوں کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ ریاست افراد کے خلاف نہیں ہوتی بلکہ کمیونٹی کی ایک وسیع تر شکل ہوتی ہے جسے مشترکہ خیر کے اجتماعی حصول سے نہیں روکنا چاہیے۔

لبرل ازم اور سرمایہ داری

لبرل ازم کو اس کے مبدا اور منشا کی وجہ سے متوسط شہریوں کا سیاسی نظریہ کہا گیا۔ لاک نے اس کی جو وضاحت کی اسی کو اپنایا گیا۔ انگلستان کے شہروں میں تاجر طبقہ کو ملنے والی اہمیت بھی اس کی ہم عصر تھی۔ جس طرح پچھلے ابواب میں ذکر ہوا ہے' متوسط شہری طبقہ کو اشرافیہ کی مراعات کے خلاف ایک طویل جدوجہد میں ملوث رہنا پڑا۔ اس نے ان قوانین کی مزاحمت کی جو ان کی سرگرمیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے تھے اور انہیں کوئی حیثیت و مقام نہیں دیتے تھے۔ ان حالات میں ایک انفرادیت پسند سیاسی نظریہ جو آزادی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور تحفظ حقوق کا چمپئن تھا' متوسط شہری طبقہ کے مفادات کا آئینہ دار بن کر ابھرا۔ ان حقوق میں معاہدے اور املاک کے حقوق' خدمات اور ہنرمندی بیچنے کے حقوق لاک کے نظریہ کے مطابق شامل تھے۔ املاک کے حقوق نے ان کے سرمایہ کے ارتکاز اور فروغ کو تحفظ دیا۔ خدمات اور ہنرمندی بیچنے کے حق نے اجرتوں کو تحفظ دیا اور جاگیرداروں کی طرف سے محنت کشوں کے استحصال اور انہیں اپنا پابند بنائے رکھنے کا خاتمہ کیا۔ معاہدات کی آزادی نے حکومت کو تاجروں اور کارکنوں کے درمیان معاہدوں اور باہمی معاہدوں میں دخل اندازی سے روک دیا۔ معاہدوں کی پابندی نے لین دین کو یقینی بنا دیا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ تاجروں کو معاہدات اور املاک کے حقوق کے ذریعے اپنے متوقع منافعوں اور تجارتی لین دین کو یقینی بنانے کا راستہ مل گیا۔

اکنامک لبرل ازم کو سائنسی اعانت ایڈم سمتھ نے مہیا کی۔ اس کا استدلال تھا کہ کسی ایسی مارکیٹ میں اپنے مفادات کا تعاقب کرنے والے افراد کے لیے جو آزادانہ مبادلہ اور قیمتوں اور اجرتوں کے مقابلہ کی اجازت دیتی ہو۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خفیہ ہاتھ سب کے لیے ایک سودمند صورتحال پیدا کرتا ہے۔ افراد کو فائدہ اس لیے ہوگا کہ وہ اپنی خواہشات اور صلاحیتوں کے مطابق پیداواری اور مسرفانہ سرگرمیاں سرانجام دے سکیں گے۔ معاشرے کو فائدہ اس طرح ہوگا کہ دولت کا حجم بڑھے گا۔ صرف ایسی مصنوعات تیار کی جائیں گی جو منفعت بخش ہوں گی۔ مطلوبہ مقدار میں اور لاگت' قیمت اور معیار کے مثالی امتزاج کے ساتھ تیار ہوں گی۔ ان افراد میں تقسیم (فروخت) ہوں گی جو ان کی حقیقی قدر کرتے ہیں (اس کا اندازہ ان کی طرف سے قیمت ادا کرنے کی رضامندی سے ہوتا ہے)۔ جو چیز اس نکتہ چینی کا جواب نہیں دے سکے گی وہ ناکامی کی فطری اصلاحی پابندی کا سامنا کرے گی۔ ''فطری آزادی'' کا یہ نظام حکومت کی منصوبہ بندی سے زیادہ بہتر اور برتر ہوگا۔ کیونکہ حکومت کی پلاننگ اگر ناممکن نہیں تو غیر مستعد ہوگی اور املاک اور افراد کے معاہدوں کے فطری حقوق سے متصادم ہوگی۔ پلاننگ کا کلیدی نقص یہ ہے کہ حکومت یہ جاننے کی صلاحیت سے عاری ہوتی ہے کہ افراد کی مختلف خواہشات کا مجموعہ کیا ہے جبکہ مارکیٹ اَن گنت رضاکارانہ افرادی تبادلوں اور رابطوں کے ذریعے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسی خواہشات کا علم رکھتی ہے۔ اس کے مطابق حکومت کو قانون کا ایک ایسا فریم ورک مہیا کرنا ہوتا ہے جو املاک اور معاہدات کا تحفظ کرے۔ ایک ٹھوس مالیاتی نظام قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور آزاد مارکیٹ اور مقابلہ یقینی بنا کر خود راستے سے ہٹ جانا ہوتا ہے۔ اس تصور نے اپنی نسل کو جس قدر متاثر کیا اس کے اظہار کی شاید ضرورت نہیں۔ اس نے کاروباری آدمی کو بتایا وہ عوامی مفاد کا عنصر ہے۔ اس نے زور دیا کہ وہ دولت کے حصول میں جس قدر کم پابندیوں میں جکڑا ہوگا وہ اسی قدر زیادہ فائدہ اپنے ہم جنسوں کو پہنچا سکے گا۔ ان اقتصادی دلائل نے تاجروں کو اپنی بہتری کے حصول کے لیے ایک نیا راستہ دکھایا جو حکومت اور قوانین کے ڈھانچے کے مفاد سمیت سب کے مفاد میں آگے بڑھنے کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

لبرل ازم اور سرمایہ داری کے درمیان مذکورہ تعلق براہِ راست اور گہرا ہے۔ لبرل ازم آزادی مہیا کرتا ہے جبکہ سرمایہ داری ایک ایسا معاشی نظام ہے جو آزادانہ معاشی تبادلوں پر استوار ہوتا ہے۔ پولیٹکل لبرل ازم کی اعانت یافتہ آزادی ایک غیر مخصوص لیکن قابل قدر درجہ کا لبرل ازم پیش کرتی ہے۔ معاشرے کے افراد معمول کی ایسی سماجی' سیاسی اور معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے آسانی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ صناعی' پیداکاری' خریداری' فروخت' ارتکاز' تصرف وغیرہ ان بنیادی ''اچھائیوں'' میں سے ہیں جن کا تعاقب سرمایہ دارانہ معاشروں میں لوگ اپنی آزادیوں سے استفادہ کرتے ہوئے روزمرہ زندگی میں کرتے ہیں۔ اس طرح لبرل ازم میں مہیا کی گئی آزادی معاشی میدان میں طاقتور کردار ادا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل درست ہے کہ لبرل ازم سیاست کا ایسا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے جو مارکیٹ کے سرمایہ دارانہ معمولات کا تقاضا کرتا ہے اور اسے جائز قرار دیتا ہے۔

ایک عمومی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ پولیٹکل لبرل ازم ضروری طور پر حکومت کی طرف سے عدم مداخلت کا پابند نہیں ہوتا۔ بیسویں صدی کے کلاسیکل لبرل ازم کے سرکردہ داعیوں میں سے ایک ''ہائیک'' غیر مبہم انداز میں کہتا ہے..... ''لبرل کاز کو کچھ لبرلز کے اس اصرار سے زیادہ کسی چیز نے نقصان نہیں پہنچایا کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عدم مداخلت کے اصول کو مقدم رکھا جائے۔'' ہائیک کا استدلال ہے کہ مارکیٹ کے لیے ایک پس پردہ لیگل فریم ورک بنانے کے علاوہ حکومت کی شرکت اور دخل اندازی اس وقت ضروری ہو جاتی ہے جب مسابقت اور قیمتوں کے تعین کا میکنزم لوگوں کو اشیا اور انفراسٹرکچر مہیا کرنے میں ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ حکومت کو سڑکیں بنانے' جنگلات کے تحفظ اور آلودگی کے خاتمہ کے لیے جانے والی مداخلتوں کی طرح یہاں بھی دخل اندازی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مزید دعویٰ کرتا ہے کہ بلاشبہ ایک مخصوص (کم از کم) حد تک ہر شخص کو خوراک' پناہ' لباس' علاج معالجہ اور کام کرنے کی صلاحیت یقینی طور پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ وہ سوشل انشورنس کے ایک ریاستی سرپرستی میں قائم نظام کی وکالت کرتا ہے جو لوگوں کو قدرتی آفات سے محفوظ رکھے۔ ہم عصر قدامت پسند جو اس طرح کی قانون سازی کے حق میں نہیں یا معمولی سے اقدامات کی وکالت کرتے ہیں' وہ بھول جاتے ہیں کہ ہائیک نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ لبرل ریاست قانون کے طاقتور کردار کو بنیادی اہمیت دیتی ہے۔

ایک نتیجہ خیز انتباہ

جبر کا مخالف یا آزادی پسند فرد جو آزادی کو سب سے بڑی قدر قرار دیتا ہے ممکن ہے اس لبرل دعویٰ پر برہمی کا اظہار کرے کہ قانون' آزادی کا سب سے بڑا محافظ ہے۔ آزادی پسند دراصل قانون کو آزادی پہ ایک قدغن کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ جرمی بینتھم بذات خود آزادی پسند نہیں تھا۔ لیکن قانون کا جائزہ کھلی آنکھ سے لینے کا داعی تھا۔ وہ آزادی پہ اصرار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آزادی ایسی چیز نہیں ہے جسے کوئی وضعی قانون پیدا کرے۔ یہ قانون کے بغیر بھی پائی جاتی ہے۔ آزادی پسندوں کا خیال ہے کہ قانون کو کم از کم ایسے حالات پیدا کرنا چاہئیں جو سماجی نظم کے لیے ضروری ہیں۔ کیونکہ سماجی نظم ہی انہیں انارکسٹوں سے مختلف اور ممتاز بناتا ہے۔ قانون کو اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ آزادی اس وقت بھی موجود ہوتی ہے جب قانون خاموش ہوتا ہے۔ تھوڑے قوانین کا مطلب ہے زیادہ آزادی۔ اس نقطہ نظر سے قانون سازی جمہوری ماخذوں سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قطع نظر ہمیشہ ایک خطرہ ہوتی ہے۔ قانون کی حکمرانی قانون سازی کی خدمت کرتی ہے اور شخصی حقوق اتنے کم ہوتے ہیں کہ وہ زیادہ تحفظ مہیا نہیں کرتے۔

جدید سماجی نظریات دان لبرل معاشروں میں ایک پھیلتے ہوئے حلقہ اختیار کی بات کرتے ہیں جو ریاستی قانون کی طرف سے سماجی زندگی میں ایک عدیم النظیر مداخلت اور افراد کے معاملات میں روز افزوں پھیلتی ہوئی دخل اندازی ہے۔ اگر یہ صورت حال واقعی جنم لے رہی ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ لبرل معاشروں میں قانونی تحفظات کے باوجود کم آزادی ہے اور یہ ماضی کی مطلق العنان حکومتوں کے ادوار سے بھی کم ہے جن میں قانون سازی بہت کم ہوتی تھی اور قانون ساز ادارے کمزور یا غیر فعال ہوتے تھے۔ اس الزام کو مسترد کیا جا سکتا ہے اور کم از کم ابتدائی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جدید سرمایہ دارانہ گنجان آباد معاشروں کا موازنہ گئے دنوں کے سادہ حالات رکھنے والے معاشروں سے کرنا غیر موزوں ہے۔ لیکن بہر حال یہ نکتہ سنجیدہ غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے۔ مزید برآں اس میں ایک مخفی انتباہ بھی پایا جاتا ہے کہ نظریاتی بیانات کو جواز بنا کر کسی دھوکہ میں نہ آئیں۔ یہ آپ کو کسی کم مثالی اور زیادہ حقیقت پسندانہ طریقے سے صورت حال کو سمجھنے اور تصور میں لانے میں مدد نہیں دیں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

4

لاک، مونٹیسکیو اور وفاقیت کے مقالے

تین شاندار ابتدائی کام جو اپنے قد و قامت اور اثر انگیزی میں سب سے اونچے ہیں اور جنہوں نے لبرل نظاموں میں قانون کی حکمرانی کو ناگزیر مقام دیا وہ 1690ء میں لاک کا حکومت کا دوسرا معاہدہ، 1748ء میں مونٹیسکیو کی روح قوانین اور 88-1787ء میں وفاقیت کے مقالے (میڈی سن، ہملٹن اور جے کے تحریر کردہ) ہیں۔ اس باب میں ان تینوں اہم کاموں کا الگ الگ مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے فیصلہ کن انداز میں مغرب کی لبرل جمہوریتوں میں قانون کی حکمرانی کی جدید شکل و صورت مہیا کی۔ اس جائزے اور تفسیر کے بعد انیسویں صدی میں انگلستان میں قانون کی حکمرانی کا بھی ایک مختصر جائزہ دیا جا رہا ہے۔ انگلستان خصوصی تذکرہ کا حقدار ہے کیونکہ وہاں طویل عرصہ سے جاری قانون کی حکمرانی کی روایت موجود ہے۔ یہ لاک کا وطن تھا۔ اس نے مونٹیسکیو کے لیے سب سے بڑی مثال مہیا کی۔ اس کی سیاسی صورت نے وفاقیت کے مسودے (دی فیڈرلسٹ پیپرز) کے مصنفین کو متاثر کیا اور اس کی روایت تھی جس کی بنیاد پر ڈائسے نے قانون کی حکمرانی کے جدید زوال کے بارے میں دلائل مرتب کیے۔ ان کا ذکر اگلے باب میں ہوگا۔ یہ ایک رویہ ساز آزمائشی معاملہ تھا جو وفاقیت کے مسودوں میں طے کردہ فریم ورک سے کئی پہلوؤں میں عدم مطابقت رکھتا تھا۔ یہ مسودے متعدد ہم عصر مقبول تصورات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے منافی تھے کہ قانون کی حکمرانی کے تقاضے کیا ہیں؟ اس باب کو حتمی شکل دیتے ہوئے مسلمہ قانونی پیشہ کی موجودگی کو بھی زیر بحث لایا جائے گا۔

لیکن سب سے پہلے سترہویں صدی کے ایک قد آور سیاسی مفکر تھامس ہابس کا تذکرہ جو لبرل ازم اور قانون کی حکمرانی کے تصور کو دھندلا کرتا ہے۔ اگرچہ اس نے عمرانی معاہدہ کا تصور پیش کیا جس کو لاک نے ترقی دی۔ لیکن لبرل عناصر ہابس کو ایک پری لبرل مفکر سمجھتے ہیں۔ اس کے نظریہ کے مطابق معاہدہ عمرانی کے تحت تخلیق ہونے والا مقتدر اعلیٰ کلی اختیارات کا مالک بن جاتا ہے (اگرچہ فطری قانون کے تحت وہ ضمیر کا پابند ہوتا ہے)۔ افراد کو معاہدہ کے بعد صرف ایک حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر انہیں موت کا خطرہ ہو تو وہ مقتدر اعلیٰ کی مزاحمت کر سکتے ہیں۔

مقتدر اعلیٰ (بادشاہ یا پارلیمنٹ) ہابس کے مطابق قانونی حدود و قیود سے آزاد ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ عالم اور معاملہ فہم تصور کیا جاتا ہے۔ مطلق العنان مقتدر اعلیٰ سے کمتر حاکم کی وجہ سے ریاست کے معاملات غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں کیونکہ اختیار و اقتدار کو چیلنج کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور سماجی نظم و ضبط ناکام ہو جاتا ہے۔ نظم و ضبط صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب ہر شخص ایک حاکم مطلق کی اطاعت کرے جو کسی بھی ارضی قوت کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایسا مقتدر اعلیٰ قانونی پابندیوں کو نظر انداز کرنے پر مائل ہو جاتا ہے۔ ہابس کے مطابق یہ چیز بھی غیر منطقی ہے کہ مقتدر اعلیٰ قانون کا پابند ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ مقتدر اعلیٰ بذات خود قانون کا ماخذ ہوتا ہے۔ قانون کے خالق کو قانون کا پابند کیسے کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ تو اپنی مرضی سے قانون کو تبدیل کر سکتا ہے۔ لیکن ہابز کے نقطۂ نظر کے بالکل برعکس ایکناس کی آواز گونجتی ہے کہ..... ''وہ جو صرف اپنا پابند ہوتا ہے۔ دراصل کسی کا پابند نہیں ہوتا۔'' ہابس قانون کی حکمرانی کے خلاف ایک اور استدلال پیش کرتا ہے۔ اس کا تذکرہ جین ہمپٹن نے اس طرح کیا ہے:

''قانون پیدائشی طور پر بے اختیار ہوتا ہے۔ یہ صرف اس وقت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندگی پاتا ہے جب افراد کی طرف سے اسے سمجھا' اپنایا اور نافذ کیا جاتا ہے۔انسانوں کا وہ گروہ جسے یہ کہنے کا حتمی اختیار ہوتا ہے کہ قوانین کیا ہیں؟ انہیں کس طرح اپنایا اور کس طرح نافذ کیا جائے' انہی کو حتمی طور پر کنٹرول حاصل ہوتا ہے کہ یہ قانون حقیقت میں کیا ہیں؟ چنانچہ انسان قوانین کو کنٹرول کرتے ہیں ناں کہ اس کے برعکس قوانین انسانوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔''

ہابس قانون کی حکمرانی اور شخصی حکمرانی کے درمیان کسی مکمل قانونی تضاد کے امکان کو تاویل اور تعمیل کے وقت مسترد کرتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا ہونا چاہیے.....کوئی عبارت نہیں بلکہ فرد جو حتمی فیصلہ صادر کرسکتا ہو۔ہابس اختیارات کی تقسیم کو بھی مسترد کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح منقسم اقتدار اعلیٰ میں آویزش شروع ہو جاتی اور سماجی نظم برقرار رکھنے کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے۔

قانون کی حکمرانی کے مختلف پہلوؤں پر ہابس نے اعتراضات کا ایک انبار لگا دیا محض اس لیے کہ یہ لبرل سسٹم کا مرکزی نکتہ بننے جا رہا تھا۔

لاک کا قانون کے لیے ممتاز کردار

لاک کا پیش کردہ حکومت کا دوسرا معاہدہ لبرل تھیوری کی انتہائی مؤثر تشکیل کے لیے وسیع طور پر سراہا جاتا ہے۔اس کی متصورہ فطری ریاست ہابس سے زیادہ مہربان تھی۔ عقل وادراک سے رہنمائی لیتے ہوئے افراد اس میں مکمل آزادی اور مساوات سے بہرہ مند ہوتے اور فطری قوانین کی حکمرانی میں رہتے ہیں۔ان فطری قوانین کے مطابق ایک فرد کو یقیناً اپنا (اور اپنے مفادات کا) تحفظ کرنا چاہیے۔اس فطری آزادی کے تحت افراد اپنی بہبود کا حصول اپنی بصیرت کے مطابق ممکن بنانے میں' آزاد ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے فطری قوانین کی خلاف ورزی پر سزا دے سکے اور تلافی کا مطالبہ کر سکے۔اگرچہ لوگ عام طور پر قوانین فطرت کی پابندی کرتے ہیں لیکن خلاف ورزی ناگزیر طور پر رونما ہو کر رہتی ہے۔لیکن خلاف ورزی کرنے والوں پر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذاتی طور پر قانون نافذ کرنے کا حق مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ ایک غیر جانبدار جج کی عدم موجودگی میں تنازعات کو فریقین کے اطمینان کے مطابق فیصل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہر فریق اپنے حق میں متعصب ہوتا ہے۔ چنانچہ تنازعات متعفن ہو جاتے ہیں اور امن و سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت حال سے بچنے کے لیے افراد مل بیٹھتے ہیں تا کہ حکومت تشکیل دی جا سکے اور اسے مفاد عامہ کے لیے قوانین وضع کرنے' رائج کرنے اور نافذ کرنے کے اختیارات دیئے جا سکیں اور یہ سب کچھ اس معاشرے کے تمام افراد کی املاک کے ہر ممکن تحفظ کے لیے ہوتا ہے۔

لاک اس کی تلخیص اس طرح کرتا ہے۔

> ''اور اس طرح ہر مخصوص رکن کے ذاتی فیصلہ کو خارج کرتے ہوئے کمیونٹی منصف بن جاتی ہے اور طے شدہ رائج قوانین کی روشنی میں غیر جانبدار رہتے ہوئے اور تمام فریقین کے لیے ایک جیسے رہتے ہوئے اور ان افراد کے ذریعے جنہیں کمیونٹی نے ان قوانین پر عملدرآمد کرنے کے لیے بااختیار بنایا ہو ان تمام اختلافات کا فیصلہ کرتی ہے جو اس معاشرے کے افراد کے درمیان حقوق سے متعلق پیدا ہوتے ہیں اور ان جرائم پر سزا دیتی ہے جو اس معاشرے کے خلاف کسی رکن سے سرزد ہوتے ہیں۔ یہ سزائیں مروجہ قوانین کے مطابق ہوتی ہیں۔''

اس کے تصور ریاست میں اختیارات کی تقسیم نہایت محدود ہوتی ہے۔ محدود مقاصد کے لیے یہ اختیارات افراد سے حکومت کو تفویض ہوتے ہیں اور اگر حکومت اس ضمن میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں ناکام ہو جائے تو یہ اختیارات قابل تنسیخ ہوتے ہیں۔ وہ عدلیہ اور انتظامیہ کے درمیان مخصوص اختیارات کی تقسیم کی بات کرتا ہے لیکن عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ الگ نہیں کرتا' تا کہ حکومت کی طرف سے رائج قوانین کو مطلوبہ انداز میں نافذ کرنا یقینی بنایا جا سکے۔ اس کا استدلال ہے کہ مطلق العنان بادشاہت سول سوسائٹی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رہتی کیونکہ ایسا بادشاہ اپنے معاملات کا فیصلہ عوام سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلقات میں ایک فطری صورت میں رہتے ہوئے بذات خود کرے گا۔ انجام کار سول سوسائٹی کی رضامندی کی فطرت سے ہم آہنگی رکھتے ہوئے لاک قرار دیتا ہے کہ قانون سازی کثرت رائے سے ہونا چاہیے۔

لاک کے تصورات کے مطابق لبرل ازم کامل طور پر قانونی ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے..... ''جہاں قانون ختم ہوتا ہے..... وہاں ظلم و استبداد شروع ہو جاتا ہے.....'' وہ قانون کی حکمرانی کا موازنہ کسی دوسرے کی مرضی کی محکومی سے کرتا ہے۔ کسی حکومت کے ماتحت لوگوں کی آزادی یہ ہے کہ زندہ رہنے کے لیے ایک رائج قانون ہو جو اس معاشرے کے ہر فرد کے لیے ایک جیسا ہو اور اس قانون ساز اختیار کے تحت بنایا گیا ہو جو معاشرے نے سونپا ہو۔ ''ہر چیز میں مجھے وہاں اپنی مرضی پر چلنے کی آزادی ہو۔ جہاں قانون خاموش ہو اور میں کسی دوسرے فرد کی غیر موافق' غیر یقینی اور نامعلوم قسم کی من مانی مرضی کی محکومیت سے آزاد ہوں۔'' لاک کی ریاست میں رائج قانون کی زبردست اہمیت ہے۔

''مطلق العنان اختیار یا رائج قوانین کے بغیر حکومت کرنا نہ تو معاشرے کے مقاصد پر پورا اترتا ہے اور نہ حکومت کے۔ ان میں لوگ فطری آزادی سے دست کش نہیں ہوتے اور اگر ان کی زندگیاں' آزادیاں اور مواقع محفوظ نہ ہوں اور حقوق و ملکیت کے مبینہ قوانین کے ذریعے ان کو امن و سلامتی نہ ملے تو باہم متحد ہو جاتے ہیں کیونکہ حکومت کو میسر تمام اختیار صرف اور صرف معاشرے کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔ حکومت کو نہ تو استبدادی ہونا چاہیے اور نہ اپنی مرضی کی مالک۔ چنانچہ اس کے اختیار کو مسلمہ اور اعلان کردہ قوانین کے ذریعے استعمال ہونا چاہیے اور یہ کہ عوام کو اپنے فرائض کا علم ہونا چاہیے اور قانون کی حدود و قیود میں محفوظ و مامون رہنا چاہیے' اسی طرح حکمرانوں کو بھی اپنی حدود و قیود میں رہنا چاہیے۔

یہ ہے قانونی آزادی اور آئینی حکومت کی مختصر اور جامع تعریف۔

تاہم لاک قانون سازی کے اختیار پر کوئی خصوصی پابندی عائد نہیں کرتا وہ شخصی حقوق کے تحفظ کی واضح وکالت نہیں کرتا۔ نہ ہی وہ عدلیہ کو ایک الگ شاخ کی حیثیت سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزاد کرنے کی بات کرتا ہے چنانچہ کسی ایسے میکنزم کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہتا ہے جو عدالتی نظرثانی کا ذریعہ بن سکے اور بغاوت کے بغیر حکومت کے غیر قانونی اقدامات کو منسوخ کر سکے۔

لاک حق ملکیت کو خصوصی طور پر اہمیت دیتا ہے۔ ''دوسرے معاہدہ'' میں اس کی اہمیت کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔ ''لوگوں کو کسی دولت مشترکہ میں متحد کرنے اور انہیں کسی حکومت کے تابع کرنے کا بہترین طریقہ ان کی املاک کا تحفظ ہے۔'' اگرچہ وہ املاک کا لفظ وسیع تر معنوں میں استعمال کرتا ہے اور اس میں زندگی اور آزادی کو شامل کرتا ہے اور اس مفہوم میں کہ افراد اپنی ذات کے مالک ہوتے ہیں لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ املاک سے مراد منقولہ و غیر منقولہ اثاثے ہیں۔ یوں لاک کی ریاست جائیداد کے مالکان کا ایک معاشرہ ہے۔

یہ بات ایک متعلقہ نکتہ کی طرف لے جاتی ہے۔ اگرچہ وہ وسیع طور پر ''عوام'' اور ''آزاد لوگوں'' کی طرف سے لکھتا ہے اور اس کا ایمان ہے کہ انسان عقل و شعور کی جبلی صلاحیت رکھتا ہے لیکن وہ اس ضمن میں کچھ تحفظات رکھتا ہے۔ مثلاً اس کا کہنا ہے کہ املاک سے محروم محنت کش طبقہ عقل و شعور سے عاری ہوتا ہے۔ لیوسٹراس نے لاک کی مساوات اور اس کے جائیداد سے متعلق نقطۂ نظر کا اس طرح جائزہ لیا ہے۔

> ''مساوات' لاک کے خیال میں سول سوسائٹی میں بے میل اور متضاد ہے۔ تمام لوگوں کی برابری ذاتی بقا کے حق کے حوالے سے زیادہ عقلمند لوگوں کے خصوصی حق کو سلب نہیں کرتی۔ اس کے برعکس ان کے خصوصی حق کا استعمال سب کی ذاتی بقا اور مسرت کا باعث بنتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ چونکہ ذاتی بقا اور مسرت املاک کا تقاضا کرتی ہے۔ چنانچہ معاشرے کے صاحب املاک ارکان کا تحفظ قلاش لوگوں کے مطالبات کے مقابلے میں یا جفاکشوں اور صاحبان عقل و خرد کا تحفظ کاہل اور جھگڑالو لوگوں کے خلاف عوامی مسرت یا عمومی خیر کے لیے ضروری ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسے لوگ جنہیں حکمرانی کے مقاصد کے لیے چنا جاتا تھا' صاحبان املاک ہوتے تھے۔ جس جمہوریت کی وکالت لاک کرتا ہے اور قانون سازی کے لیے جس اکثریت کی رضامندی کی وہ بات کرتا ہے وہ جائیداد کے مالک ہیں۔ اس زمانے میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔ انگلستان کی مجموعی آبادی کا یہ صرف تین فیصد تھے۔ لاک کا مفروضہ تھا کہ سول سوسائٹی کے مکمل ارکان صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو جائیداد کے مالک ہوں۔ وہ انہی لوگوں کی اکثریت کی بات کرتا ہے۔ اس سے وضاحت ہوتی ہے کہ لاک نے شخصی حقوق کے براہِ راست تحفظ کو کیوں اہمیت نہیں دی۔ چونکہ مطلوبہ رضامندی صاحبان املاک کی اکثریت کی درکار تھی چنانچہ اس کے نزدیک ہر ایک کے حقوق کا یہی تحفظ کافی تھا۔ اس لیے کہ اس کے خیال میں وہ سب جن کو مشاورت میں شامل ہونے کا حق ہے' عوامی بہبود کے ایک تصور پر متفق تھے یعنی انجام کار قومی دولت میں اضافہ کرنا۔

ان ابتدائی دعوؤں پر بہت سی بحث ہو چکی ہے کہ لبرل ازم دراصل متوسط شہری طبقے کا سیاسی نظریہ تھا۔ لاک کا نظریہ املاک آج براہِ راست قابل فہم ہے اگر اسے ''سرمایہ داری کی روح کے کلاسیکل تصور کے طور پر پیش نظر رکھا جائے۔'' اس نے جو نظام پیش کیا اگر اسے اس کی بنیادوں سے محروم کر دیا جائے اور غیر فیاضانہ تاویل کی جائے تو یہ ایسا نظام ہے جو صاحب ثروت لوگوں کی تخلیق کردہ قانون کی بالادستی سے متصف ہے اور ان کی املاک کے تحفظ کو یقینی بناتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کا ایک اور بلند قامت لبرل مفکر ایڈم سمتھ لکھتا ہے:

> ''قوانین اور حکومت کو اس تناظر میں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر معاملہ میں دیکھا جائے تو یہ امتزاج ہے امیر آدمی کی طرف سے غریب آدمی کو کچلنے اور اپنے آپ کو اشیاء کی اس نابرابری میں محفوظ کرنے کا جو بصورت دیگر غریبوں کے حملوں کے نتیجہ میں تباہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اگر غریبوں کو حکومت نہیں روکتی تو وہ بہت جلد دوسروں کو کھلے تشدد کے ذریعے اپنے جیسا بنا دیں گے۔''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدید کمیونزم کا بانی کارل مارکس جو سیاسی معاشی طیف میں سمتھ کے بالمقابل دوسرے کنارے پر کھڑا ہے' اس نے بھی یہ نکتہ اپنی کڑی تنقید کا نشانہ نہیں بنایا۔ مارکس لبرل ریاست اور طریقۂ کار کے قانون کو متوسط شہری طبقہ کے املاک کے مفادات کے حق میں استعمال کرنے کا الزام عائد کرتا ہے..... تمہاری قانون سازی دراصل تمہارے طبقہ کے ارادوں کو سب پہ مسلط کیے جانے والے قوانین میں تبدیل کرنے کا نام ہے۔ مارکس کا ساتھی فریڈرک اینگلس وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: جب ریاست طبقاتی منافرت کو روکنے کی ضرورت کے لیے اٹھتی ہے تو وہ دراصل طبقات کے درمیان تصادم کے دوران اُٹھتی ہے۔ یہ عام طور پر انتہائی طاقتور اور معاشی طور پر حکمران طبقہ کی ریاست ہوتی ہے۔ یہ طبقہ اپنے ذرائع کی بدولت حکمران سیاسی طبقہ بن جاتا ہے اور پھر نئے ذرائع حاصل کر کے پسے ہوئے طبقے کو دباتا اور ان کا مزید استحصال کرتا ہے۔

اس روشنی میں دیکھا جائے تو لبرل قانون کی حکمرانی بنفسہٖ بہت کم کشش رکھتی ہے (کم از کم غیر اشرافیہ کے لیے)۔ لیکن اس بظاہر جانبداری کو صاحب ثروت افراد کے لیے سمجھنا بہرحال ایک غلطی ہوگی اور کم از کم ابتدا میں ایسا سمجھنا غلطی ہوگی کہ یہ لبرل ازم یا قانون کی حکمرانی کو مسترد کرنے یا املاک کی مذمت کرنے کے لیے معقول جواز ہے۔ لبرل اس کے دفاع میں دلیل دیتے ہیں کہ قانون تو درحقیقت غیر جانبدار اور طبقاتی کشمکش سے بالاتر ہوتا ہے اور اس سے افراد اور معاشرہ خوشحال ہوتے ہیں کیونکہ لبرل ازم کا املاک کا محافظ ہونا دولت اور آزادی کو فروغ دیتا ہے۔ اس کی وضاحت آگے چل کر کی جائے گی۔ یہ سب مشاہدات لاک کے غیر معمولی ورثہ کو غیر اہم نہیں بناتے۔ جو دلائل اور نظریات اس نے پیش کیے انہیں دوسرے مفکرین نے بنیاد بنایا اور شخصی آزادی کے مفاد میں لبرل ازم اور قانون کی حکمرانی کے تصور کو تقویت دی۔ البتہ اس کی ہم سری صرف مونٹیسکیو نے کی۔ جو لبرل سسٹم تشکیل دینے میں اس نے مدد دی وہ نہ تو اس کی تفہیم کا اسیر تھا اور نہ ہی اس کے دور کے حالات کا۔ یہ مشاہدات بہرحال تجویز کرتے ہیں کہ اس کو بہرطور زیر غور لانا چاہیے' چاہے قانون کی حکمرانی اور لبرل ازم سے حاصل ہونے والے تمام تر فوائد محض معاشرے میں املاک کی تقسیم تک ہی کیوں نہ محدود ہوں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مونٹیسکیو کا حصہ

مونٹیسکیو آزادی کی بحث کا آغاز اس مشاہدے کے ساتھ کرتا ہے کہ اسے بہت سے معنی اور مفاہیم دیئے گئے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتا ہے جمہوریت کے ساتھ آزادی کو برابری دینا ایک غلطی ہے جس میں لوگوں کے اختیار کو ان کی آزادی کے ساتھ گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں آزادی کا مطلب یہ استحقاق نہیں ہے کہ جس کا جو جی چاہے کرتا پھرے۔ کیونکہ اس طرح دوسرے بھی یہی کچھ کریں گے اور ہر ایک مسلسل ایک خطرے میں رہے گا ہم میں سے ہر ایک کو اس وقت آزادی میسر ہوتی ہے جب سب لوگ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے گریزاں رہیں۔ یہ گریز قانون کا نفاذ ہی ممکن بناتا ہے۔ اس طرح قانون ایک ایسے محفوظ عمل کا امکان تخلیق کرتا ہے جس کو افراد اپنی خوشی کے لیے سرانجام دیتے ہیں۔ ''آزادی کا مطلب ہر وہ کام کرنے کا حق ہے جس کی اجازت قانون دیتا ہے۔'' یہ ایک مرتبہ پھر قانون آزادی کی کلاسیکل تعریف ہے۔ مونٹیسکیو آزادی کی شناخت ایسی زندگی کو بناتا ہے جو قانون کی حکمرانی کے تحت گزاری جائے۔

لیکن قانون آزادی کی بجائے مکمل آزادی کے تحفظ کے لیے اور بہت کچھ ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ قوانین سخت اور مشکل بھی ہو سکتے ہیں جو قابل اجازت سرگرمیوں کو محدود بناتے ہوں۔ مونٹیسکیو کا کہنا ہے کہ آزادی اس وقت وجود میں آتی ہے جب لوگ استبداد سے محفوظ ہوں۔ اس کا مشاہدہ ہے کہ جمہوری نظام بھی اپنی فطرت میں آزاد نہیں ہوتے اور بادشاہت یا اشرافیہ کی حکومت کی طرح پابندیاں نافذ کرنے میں پیچھے نہیں ہوتے۔ ایک اعتدال پسند حکومت عظیم تر آزادی مہیا کرتی ہے۔ بے لگام ہونے سے روکنے کے لیے حکومت کی تشکیل ایسے انداز میں ہونی چاہیے کہ اختیار ہی اختیار کو قابو میں رکھے۔ وہ اس کا علاج اختیارات کی تقسیم میں دیکھتا ہے۔

> ''جب مقننہ اور انتظامیہ کے اختیارات ایک ہی فرد میں جمع ہوں یا ایک ہی ادارے میں تو پھر آزادی کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔ کیونکہ خدشات موجود رہیں گے کہ کہیں یہ فرد (بادشاہ) یا ادارہ (سینٹ) استبدادی قوانین

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وضع کر کے انہیں استبدادی انداز میں نافذ نہ کر دے۔

اور پھر ایسی صورت میں بھی آزادی نہیں ہوگی اگر عدلیہ کے اختیارات مقننہ اور انتظامیہ سے الگ نہ ہوں۔ اگر یہ مقننہ میں شامل ہوگی تو پھر رعایا کی زندگی اور آزادی من مانے کنٹرول میں ہوگی کیونکہ جج ہی قانون ساز بھی ہوگا۔ اور اگر یہ انتظامیہ کا حصہ ہوگی تو پھر جج جبر و استبداد سے کام لے گا۔

ہر چیز کی ایک حد اور انتہا ہونا چاہیے۔ اگر ایک ہی فرد یا ایک ہی ادارہ (چاہے وہ اشراف پر مشتمل ہو یا عام لوگوں پر) بیک وقت تینوں شعبوں کے اختیارات استعمال کرے گا۔ یعنی قوانین وضع کرے گا۔ انہیں نافذ کرے گا اور عوام کی اطاعت چاہے گا تو صورت حال الجھ جائے گی۔

مونٹیسکیو کی سکیم میں آزاد عدلیہ مرکزی نکتہ ہے۔ ''یہ نظریہ عدالتی دیانتداری اور عوامی اعتماد یقینی بنانے کے لیے نہیں بلکہ انتظامیہ اور اس کے بے شمار ایجنٹوں کو عدلیہ پر اپنے اختیارات' مفادات اور اذیت رساں دباؤ ڈالنے سے روکنے کے لیے ہے۔ اس طرح مجسٹریٹ کو شہریوں کا انتہائی ضروری اور انتہائی پسندیدہ محافظ سمجھا جا سکتا ہے۔ عدلیہ براہِ راست حکومت' قانون اور افراد کے درمیان نکتہ تصادم ہے۔ چنانچہ یہ حکومتوں کے غیر قانونی اقدامات کے خلاف بہترین رکاوٹ ہے۔ مونٹیسکیو تجویز پیش کرتا ہے کہ ان کے اختیارات کو بے قابو ہونے سے روکنے کے لیے ججوں (اور جیوریوں) کا انتخاب لوگوں سے اور عارضی طور پر ہونا چاہیے۔ وہ اصرار کرتا ہے کہ فیصلے سختی کے ساتھ قانون کے مطابق ہونے چاہئیں۔ اگر فیصلے جج کی ذاتی رائے پر مبنی ہوں گے تو پھر اس معاشرے میں رہنے والے لوگوں کو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی نوعیت کا علم ہی نہیں ہوگا۔

مونٹیسکیو پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے کہ انگلش کلچر اور سوسائٹی لبرل لیگل سسٹم کا دوسرا روپ ہے۔ انگلش طرز حیات کے مرکزی خدوخال اور آئین کا بڑا مقصد تجارت کی آزادانہ سرگرمیاں ہیں۔ وہ انگریزوں کو بے قابو' نفرت' رشک' حسد اور عزت و

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دولت کی حرص کے جذبات سے لبریز قرار دیتا ہے۔ انگریز اپنی خود مختاری پہ بہت زور دیتے ہیں۔ وہ زیادہ منفعت کے لیے پرانے دوستوں کو چھوڑ کر نئے اتحادی بنا لیتے اور یہ سب کچھ بہت آسانی سے کر لیتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو کسی قیمت پر فروخت کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی عزت دولت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ ہر ایک مخصوص ذہنیت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ سب لوگ خود غرضی کی دوڑ میں مصروف رہتے ہیں۔ کمیونٹی کی بہبود کی کوئی سمت نہ رکھنے کے باوجود اسے نظر انداز نہیں کیا جاتا کیونکہ ہر فرد ایک مشترکہ سیاسی فریم ورک میں رہتے ہوئے کام کرتا ہے جو سب لوگوں کو اپنے مقاصد حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اسے جاری رکھنے میں ان کا انفرادی اور مشترکہ مفاد پایا جاتا ہے۔ مونٹیسکیو کے خاکہ میں انگریز انتہائی انہماک کے ساتھ اس مہم جوئی میں مصروف رہتے ہیں کہ حکومتی مناصب حاصل کر کے دوسروں کو دبا سکیں۔ تاہم وہ ایسی قانون سازی کے مواقع نہیں گنواتے جو ان کے معاشی مفادات کو فروغ دے سکے۔

یہ متوسط شہریوں کا کلچر ہے۔ کم و بیش ہر پہلو سے یہ معاشرہ ایسے معاشرے کے کلاسیکل تصور کے برعکس تھا جو نیکی اور کمیونٹی کے مفادات کو اپنی منزل بناتا ہے۔ لیکن مونٹیسکیو اس کو حقارت سے نہیں دیکھتا۔ ''تجارت کی روح فطری طور پر کفایت شعاری' کم خرچ' اعتدال' محنت' دانشمندی' خاموشی (پُر امن انداز) ترتیب اور اصول و ضابطہ کا تقاضا کرتی ہے۔ اس چیز نے قانون کے لیے ایک کلچرل پس منظر مہیا کیا جس نے انگلستان کے شہریوں کی آزادی میں اضافہ کیا۔ قانون سازی نے ان کے لین دین کو تحفظ دیا' معاہدوں پر عملدرآمد یقینی بنا۔ ان کی املاک کو تحفظ ملا۔ ویسے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ مونٹیسکیو کا خیال ہے کہ ایک تاجرانہ کلچر کو زیادہ آزاد کلچر ہونا چاہیے۔ اگرچہ ایک پورا طرز حیات منتقل نہیں ہو سکتا لیکن تجارت کو منتقل کیا جا سکتا ہے اور اس امکان میں ہی مونٹیسکیو نے آزادی کے پھیلاؤ اور اضافہ کو دوسرے معاشروں میں ممکن دیکھا۔

مؤرخین میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ مونٹیسکیو نے انگلستان میں اختیارات کی تقسیم کی حقیقی حدود کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ چنانچہ اس نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلش کلچر کے بارے میں اس کا خاکہ چیلنج کر دیا گیا کیونکہ وہ نیکی اور احترام

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکا اور اجتماعی بہبود کے لیے موجود افراد کی سمت کا مطالعہ نہیں کر سکا۔ لیکن ان باتوں سے قطع نظر اختیارات کی تقسیم کا اس کا نظریہ اور قانون کی حکمرانی کے لیے عدلیہ کی آزادی پر اس کا اصرار، قانونی آزادی کے لیے اس کا بیان اور اس کی یہ بصیرت کہ اردگرد کے کلچر اور قانون کے درمیان ایک لازمی تعلق ہوتا ہے۔ سب کچھ نہایت اہم ہے۔ ابھی حال ہی میں اس کے اور لاک کے نظریات کا اثر ریاست ہائے متحدہ کا آئین بنانے والوں پر بہت گہرا نظر آیا ہے۔

وفاقیت کے مقالے (The Federalist Papers)

وفاقیت کے مقالے لبرل ازم کے کلاسیک ہیں۔ انہیں الیگزینڈر ہملٹن، جیمز میڈی سن اور جان جے نے تحریر کیا۔ یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے موجودہ آئین کو اپنانے کے لیے وکالت تھی۔ لیکن یہ سیاسی نظریہ کا ایک اہم کام تھا جس کا مقصد لبرل نظریات دانوں کے خیالات کو ایک فعال حکومتی ڈھانچے اور اداروں کی شکل میں ڈھالنا تھا۔ میڈی سن نے بنیادی گومگو کی حالت ختم کرنے میں مدد دی جو امریکی آئین سازوں کو درپیش تھی۔

> ''عوامی بہبود اور نجی حقوق کو اکثریت کے خطرہ سے محفوظ کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ عوامی حکومت کی شکل اور روح کو محفوظ کرنا ہمارا عظیم مقصد ہے جس کی طرف ہماری تحقیق و تفتیش کا رُخ ہے۔''

میڈی سن اور ہملٹن دونوں نے اپنی متعدد تحریروں میں اس خطرے کا کھلا اظہار کیا جو جمہوریت سے معاہدے اور املاک کے حقوق کو لاحق تھے اور ان اندیشوں کا ذکر کیا جو ریاستی قانون سازی میں حالیہ واقعات نے پیدا کیے ہیں۔ جمہوریتوں میں ناجائز ہتھکنڈوں کے تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے میڈی سن نے لکھا..... ''چنانچہ یہ (براہِ راست) جمہوریتیں ہیں جو خلفشار اور تنازعات کی تماشائی رہی ہیں۔ یہ ہمیشہ سے نجی تحفظ یا حق ملکیت کے معاملے میں متضاد اور ہم آہنگی سے محروم رہی ہیں۔ عمومی طور پر ان کی زندگی مختصر رہی ہے کیونکہ یہ اپنے انجام میں ہمیشہ ہنگامہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔'' ان مفکرین

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا خیال تھا کہ جمہوریت کی نام نہاد حکومت خود اختیاری کوئی افسانوی سی چیز ہے جس میں کچھ لوگوں کی دوسروں پہ بالادستی ایک ادارہ کی صورت اختیار کر جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو حکمرانی کرتے ہیں ضروری طور پر ویسے نہیں ہو سکتے جن پر حکمرانی کی جاتی ہے اور جمہوری خود اختیاری حکومت ایسی حکومت نہیں ہوتی جسے ہر ایک کی حکومت اس کے ذریعہ کہا جائے بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہلا سکتی ہے کہ..... ہر ایک کی حکومت بقیہ سب کے ذریعے۔ جب معاشرے میں گروہ پائے جاتے ہیں تو عملی طور پر جمہوریت ایسے لوگوں کی حکمرانی ہو سکتی ہے جو اکثریت میں ہوں یا دوسرے چھوٹے گروپوں سے زیادہ منظم اور زیادہ طاقتور ہوں۔

ان اندیشوں کے باوجود وفاقیت کے مقالوں نے یہ سوال نہ اٹھایا کہ حکومت کو بہر حال جمہوری ہونا چاہیے۔ مذکورہ اندیشوں کو شخصی آزادیوں کے تحفظ کے لیے ایسے تعمیری سانچوں میں ڈھال دیا گیا جو جمہوریت کو کنٹرول کرنے کے ذرائع مہیا کرتے ہیں۔ تین طرح کے میکنزم کی نشاندہی کی گئی۔ سب سے پہلے نمائندہ جمہوریت (براہ راست جمہوریت نہیں) جو عوامی نمائندوں کو اجازت دے گی کہ قانون سازی کرتے ہوئے اپنی عقل و دانش اور غور فکر کو استعمال میں لائیں۔ ان میلانات کی مزاحمت کریں جو براہِ راست جمہوریت کو متزلزل کر دیتے ہیں۔ دوسرے دو قسم کی تقسیم وجود میں لائی جائے جو اختیارات کو اختیارات کے ذریعے پابند رکھے۔ یہ عمودی قسم کی اختیارات کی تقسیم ہو جو حکومت کو ریاست سے الگ رکھے تاکہ حکومت اپنے اختیارات میں بے قابو نہ ہو جائے۔ اسی طرح ایک تقسیم افقی ہو جس میں مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کا الگ الگ رکھا جائے۔ مزید ذیلی تقسیم میں مقننہ کی شاخ میں ہو۔ اس عوامی نمائندوں پر مشتمل ادارہ میں ارکان مختلف طریقوں سے مختلف دورانیوں کے لیے منتخب ہوں۔ اس تقسیم کے پیچھے کارفرما تصور کا مقصد حکومتی مشینری پر کسی مخصوص گروہ کے قبضہ کو ناممکن بنانا ہے تاکہ وہ دوسرے لوگوں کو اپنے جبر و استبداد کا نشانہ نہ بنا سکے۔ معاشرہ بذات خود بہت سے حصوں میں مفادات میں اور شہریوں کے طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے اور افراد یا اقلیت کے حقوق اکثریت کے مفادات کے امتزاج سے کسی حد تک خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرا میکنزم قانون سازی پہ عدالتی نظر ثانی کا تھا جسے ہملٹن نے اس طرح بیان کیا:

''ایک محدود آئین میں جس سے میری مراد ایسا آئین ہے جو قانون سازوں کو مخصوص استثنا مہیا کرتا ہے..... اس قسم کی حدود و قیود عدالت ہائے انصاف کے علاوہ کسی اور ذریعے سے زیر عمل نہیں لائی جا سکتیں جن کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ آئین میں درج نکات سے متصادم اقدامات کو غیر قانونی قرار دیں۔ اس کے بغیر مخصوص حقوق یا مراعات کے تحفظات بے معنی ہوتے ہیں۔

ہملٹن مسلمہ عدالتی نظر ثانی پہ منطق کا نفاذ کرتا ہے۔ 'ایک آئین ہی ایک بنیادی قانون ہوتا ہے۔'' آئین کی بالادستی اس وقت بے اثر ہو جاتی ہے جب متصادم قانون سازی کو ناجائز نہ قرار دیا جا سکے۔ بصورت دیگر عمومی قانون سازی آئینی پابندیوں کو بریت کے ساتھ روند دیتی ہے۔ یہ استدلال بذات خود تعین نہیں کرتا کہ کون یا کون سا ادارہ کسی قانون کو ناجائز یا غیر قانونی قرار دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس کردار کے لیے عدالت کو نامزد کرتے ہوئے ہملٹن دانشمندانہ استدلال پیش کرتا ہے کہ عدلیہ کمزور ترین شاخ ہے کیونکہ اس کے پاس نہ فوج ہوتی ہے اور نہ دولت۔ یہ دوسروں کے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں کرتی اور مزید برآں قوانین کی تفسیر کا درست ترین اور مخصوص ذریعہ عدالتیں ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ وفاقیت کے مقالے مسودہ حقوق کی وکالت نہیں کرتے۔ چند ایک متفرق تحفظات البتہ آئین کے لیے کھلے طور پر پیش کیے گئے تھے جن میں متعلق بہ ماضی قوانین کی ممانعت' شہری حقوق یا وراثت سے محرومی اور معاہدات کے نقصانات کا مسودہ اور پروانہ حاضری ملزم وغیرہ شامل تھے۔ لیکن محفوظ حقوق کی کوئی واضح فہرست نہیں دی گئی تھی۔ ہملٹن کا استدلال ہے کہ مسودہ حقوق غیر ضروری اور شاید خطرناک تھا۔ حکومت کے پاس محدود اختیارات تھے بلکہ پورا آئین شخصی حقوق کے تحفظ کو یقینی بناتا تھا۔ کھلے تحفظ سمیت اس بات کا اظہار ضروری تھا کہ حکومت کے پاس بصورت دیگر ایسے اختیارات ہیں۔ ہملٹن کی مخالفت کے باوجود ایک مسودہ حقوق جو پہلے سے بہت سی ریاستوں کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئین میں شامل تھا۔ بہت جلد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آئین میں ترمیم کے ساتھ شامل کرلیا گیا۔

ایک تحریری آئین' جمہوری انتخابات' بظاہر واضح ترین شخصی حقوق' اختیارات کی تقسیم اور قانون سازی کی عدالتی نظرثانی کے بارے میں آج سمجھا جاتا ہے کہ یہ لبرل ازم اور قانون کی حکمرانی کے لیے لازمی ہیں۔ چیف جسٹس جان مارشل نے جب دیکھا کہ عدالتی نظرثانی آئینی تقاضا ہے' حالانکہ آئین میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں تو اس نے قرار دیا کہ ''آئین .....قوانین کی حکومت کو تحفظ دیتا ہے' افراد کی حکومت کو نہیں۔'' ایک تحریری آئین قانون سازوں پر قانونی کنٹرول قائم کرتا ہے۔ اگرچہ آئین کو ترامیم کے ذریعے تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن ایسا کرنے کے لیے بڑی بڑی رکاوٹوں پر قابو پانے کا مطلب ہے کہ عمومی قانون سازی قانونی حدود کے اندر عمل میں آتی ہے۔ عدالتی نظرثانی ایسا میکنزم مہیا کرتی ہے جس کے ذریعے یہ قانونی بندش مؤثر بنائی جاتی ہے۔ عدلیہ کو قانون کا ہاتف غیبی قرار دینے کا مطلب ہے کہ قانون بذات خود بولتا ہے۔ جدید لبرل جمہوریتوں میں متحد کرنے والا آئین وہ کردار اپنا چکا ہے جو ماضی میں کلاسیکل یونانی' رومن اور قرون وسطیٰ کے ادوار میں خدائی یا قدرتی قانون یا پھر قدیم ضابطے یا روایتی قانون مقتدر اعلیٰ پر قانونی پابندیاں عائد کرکے ادا کیا کرتا تھا۔

انگلستان کی مثال

اپنی تاریخ کے بیشتر حصہ میں ..... کم از کم یورپی یونین میں داخلہ اور یورپین کنونشن آن ہیومن رائٹس میں شمولیت سے پہلے انگلستان وہ بہت سے خدوخال نہیں رکھتا تھا جن کا ابھی ذکر ہوا۔ اس کے پاس کوئی تحریری آئین نہیں تھا۔ شخصی حقوق کا کوئی غیر مبہم مسودہ نہیں رکھتا تھا۔ (جدید مفہوم میں) اور نہ ہی اس کے پاس عدالتی نظرثانی کا کوئی معمول تھا۔ اس کے باوجود یہ لبرل ازم اور قانون کی حکمرانی کا تسلیم شدہ پیدائشی وطن ہے۔ انگلستان کی مثال کی مختصر سی تحقیق و تفتیش قانون کی حکمرانی کے سماجی تعلق کے لیے بصیرت مہیا کرتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کئی صدیوں تک عام رواجی قانون کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ مقتدر قانون سازوں پر قانونی حدود نافذ کرتا ہے۔ اس تفہیم کے مطابق قانون بنایا نہیں گیا بلکہ وارد ہوا تھا۔ انگریز قانون دانوں کے مطابق رواجی قانون ازمنہ قدیم سے رسم ورواج کی پیداوار تھا اور ان قانونی اصولوں پہ ہونے والے کام کی نمائندگی کرتا تھا جو ججوں نے عقل و شعور کے اطلاق سے کیا۔ یہ بات اپنی جگہ قابل ذکر ہے کہ مذکورہ دعویٰ دیومالائی ہے۔ اسے کئی بار دہرایا گیا اور تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ لیگل فریم ورک تمام حکومتی رویوں پر نافذ کیا گیا۔ یہاں تک کہ انگلستان کی خانہ جنگی (جس نے ہابس کو متاثر کیا) اور عظیم انقلاب (جس نے لاک کو متاثر کیا) کے حامی ومخالف دونوں طرح کے بیانات سترہویں صدی کے وسط اور اواخر میں جن دلائل سے لبریز تھے وہ رواجی قانون سے اخذ کردہ تھے۔ ان دنوں سرکاری اور نجی قانون میں کوئی واضح تفریق نہیں تھی۔ رواجی قانون کے اصول مثلاً معاہدہ' بھروسا اور نقصان کی ذمہ داری یکساں طور پر ان اقدامات پہ نافذ ہوتے تھے جو شہریوں کے درمیان اور شہریوں اور حکومتی عمال کے درمیان عمل میں آتے تھے۔ اس تفہیم کا سنگ بنیاد عام قوانین کے تحت عام عدالتوں میں حکومتی عمال کا احتساب تھا۔

ایک آئین کسی حکومت کے بنیادی اختیارات اور حدود اور حکومت اور شہریوں کے درمیان تعلقات تشکیل دیتا ہے۔ اس اعتبار سے انگلستان میں صدیوں سے غیر تحریری آئین رائج ہے جو میگنا کارٹا جیسی معتبر خیز دستاویزات اور ایکٹ آف سیٹلمنٹ (بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان تعلق) دی سیپٹینل ایکٹ (پارلیمنٹ کی مدت) اور ہیبیا کارپس ایکٹ (پروانہ حاضری ملزم) اور عمومی قوانین کے مجموعہ جیسی کلیدی قانون سازی پر مشتمل ہے۔ یہ سب کچھ قانون اور حکومت کے بارے میں رسوم ورواج اور روایتی تفہیم کا نتیجہ ہے۔ یہ آئین اس مفہوم میں امریکہ کے تحریری آئین کے عملاً مساوی ہے کہ یہ قانون سازوں پہ حدود و قیود نافذ کرتا ہے۔ ڈاکٹر بونہم کے کیس میں کوک کا فیصلہ اس تفہیم کی تصدیق کرتا ہے۔ اس نے قرار دیا تھا کہ رواجی قانون پارلیمنٹ کے اقدامات کو کنٹرول کرے گا اور بعض اوقات انہیں کالعدم قرار دے گا۔ بنیادی تصور یہ تھا کہ رواجی قانون' نجی قوانین کا ایک مجموعہ قانونی اصولوں کی عکاسی کرتے ہوئے بنیادی لیگل فریم ورک قائم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے قانون سازی رواجی قانون کی سالمیت اور پیوستگی کو خطرہ لاحق کرتی ہے۔ چنانچہ رواجی قانون کی اعانت میں قانون سازی کو سختی کے ساتھ ججوں کی تاویل کا محتاج بنا دیا گیا تھا۔

انیسویں صدی میں جرمی بینتھم اور دیگر اصلاح پسندوں کے زیر اثر انگلستان میں قانون کے لیے رویوں کو تبدیل کر دیا گیا اور یہ عمومی تبدیلی روشن خیالی سے متاثرہ خیالات غالب آنے کے بعد ممکن ہوئی۔ قانون کو مقتدرہ مقننہ کی مرضی کے نتیجہ کی حیثیت میں دیکھا جانے لگا۔ اس نظریہ کو ہابس اور جان آسٹن نے لیگل پازیٹوازم (قانونی ثبوتیت پسندی) کا نام دیا۔ یہ موجود سماجی مقاصد کی تکمیل کے لیے تھا۔ ''قانون بنایا گیا تھا..... وارد نہیں ہوا تھا.....'' اس کی افادیت رسم و رواج کے ورثہ کے علاوہ بھی اہمیت رکھتی تھی۔ یہ قانون کا ایک ممد و معاون نقطۂ نظر ہے اور اس نقطۂ نظر کے برعکس ہے کہ قانون غیر متبدل قانونی اصولوں کے مجموعہ کا عکاس ہے جو کسی قوم یا کلچر سے ظہور پاتے ہیں۔ پارلیمانی اقتدار اعلیٰ اور اس کا اختیار لاک کے استدلال میں عوام تفویض کرتے ہیں۔ یہ تصور آج بھی موجود ہے جبکہ قانون سازی کی عدالتی نظر ثانی کو مسترد کیا جا چکا ہے اس بات کا کوئی جواز نہیں تھا کہ قانون سازی میں ظاہر کی گئی عوامی منشا کو باطل قرار دینے کا اختیار ججوں کے پاس ہو۔ رواجی قانون کا کوئی ساجز و عمومی قانون سازی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے جس طرح کوئی بھی بنیادی قانونی نوشتہ بشمول میگنا کارٹا یا کوئی بھی آئینی دفعہ۔ چنانچہ پارلیمانی اقتدار اعلیٰ کسی شک و شبہ کے بغیر قانونی حقیقت ہے۔

یوں انگلستان کے پاس اس اعتبار سے ایک آئین تھا جس میں حکومت کا ایک بنیادی ڈھانچہ پایا جاتا تھا اور شہریوں کے قانونی حقوق اور آزادیاں تھیں۔ البتہ ایسا آئین نہیں تھا جو ایک تحریری دستاویز میں محدود ہو' عمومی قانون سازی پر برتری رکھتا ہو اور کسی عدالتی نظر ثانی کا تحفظ یافتہ ہو۔ جسٹس مارشل کی طرف سے فیصل کردہ قانون کی حکمرانی کا تصور عمومی فہم میں قانون کی ماتحت حکومت ہے۔ یہ آج بھی موجود ہے حالانکہ اس میں وہ خدوخال مکمل طور پر غائب ہیں جنہیں اس ضمن میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔

مونٹیسکیو کے خیالات کی روشنی میں ایک وضاحت ایسی چیز کی طرف اشارہ کرتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جو صدیوں کی مسافت نے انگلش کلچر اور معاشرہ میں بہت گہری اتار دی ہے یعنی وسیع طور پر پایا جانے والا مشترکہ عقیدہ اور وابستگی کا عزم کہ عوام اور حکومتی عمال سختی سے پابند ہیں اور یہ کہ حکومت قانون کے ایک محدود فریم ورک میں کام کرے گی۔ چنانچہ وہاں ہمیشہ قانون نے حکمرانی کی۔ قانون کی حکمرانی کا وجود اس لیے برقرار رہا کہ قانون کی حکمرانی کے عقیدہ کو وسیع طور پر اور غیر مشروط قبولیت حاصل تھی۔ متعدد بنیادی قوانین نا قابل تنسیخ تھے اور حکومت پر اس کی قانونی پابندی عائد تھی۔ چنانچہ اس قدیم معمہ کا جواب کہ قانون کس طرح خود کو پابند کر سکتا ہے یہ ہے کہ قانون بذات خود ایسا نہیں کرتا بلکہ قانون کے لیے رویئے یہ پابندی مرتب کرتے ہیں۔

ہائیک کا کہنا ہے کہ قانون کی حکمرانی بذات خود ایک قانونی اصول نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی تصور ہے۔ ''یہ صرف اس وقت مؤثر ہوتا ہے جب قانون ساز خود کو اس کا پابند محسوس کرتے ہیں۔ کسی جمہوری نظام میں اس کا مطلب ہے کہ یہ اس وقت تک عملی صورت اختیار نہیں کرے گا جب تک یہ کمیونٹی کی اخلاقی روایت کا حصہ نہیں بنتا۔ یعنی ایک مشترکہ رواجی تصور جو غیر مشروط طور پر اکثریت قبول کرے گی۔ قانون کی حکمرانی کا ایک اور سرکردہ علمبردار ڈائسے ان پابندیوں کو قانون سازوں پہ سیاسی یا اخلاقی حیثیت سے نافذ کرتا ہے قانونی حیثیت سے نہیں۔ تاہم امتیازی وصف یہی ہے کہ لامحدود قانون ساز بھی ایک لیگل فریم ورک کا پابند رہتا ہے جسے آسانی کے ساتھ نہ تو تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے۔ یسعیاہ برلن کا مشاہدہ ہے کہ ''جو چیز برطانیہ عظمیٰ کو موازنتہً آزاد بناتی ہے وہ حقیقت یہ ہے کہ اس نظری اعتبار سے قادر مطلق ہستی کو روایت یا رائے ایسا طرز عمل اپنانے سے روکتی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ اختیار پر پابندیوں کی شکل نہیں چاہے یہ پابندیاں قانونی ہوں' اخلاقی یا آئینی بلکہ ان کا مؤثر ہونا اہم ہے۔

قانون کا پیشہ

اگرچہ لبرل نظریات دانوں نے مفصل توجہ بہت کم دی ہے لیکن تمام لبرل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلاسفروں نے ایک طاقتور قانونی روایت کی موجودگی کو قانون کی حکمرانی کی بنیادی شرط قرار دیا ہے' الیکس ڈی ٹوک ایول کا کلاسیکل مطالعہ..... ڈیموکریسی ان امریکہ..... جو ریاست ہائے متحدہ کی آزادی کے پچاس سال بعد شائع ہوا' جمہوریت کی طرف سے عوامی استبداد کے خطرے پر زور دیتا ہے۔ٹوک ایول کا کہنا ہے کہ اس خطرے کا سدباب قانون پیشہ ہے۔مخصوص علم کی تفصیلات سے آگاہی کی بدولت جو معقولیت اور قانونی اقدار کی سمت میں رہتی ہے' وکلاء ایک قابل بھروسا سماجی قوت ہوتے ہیں۔اس نے لکھا ہے..... ایسے افراد جنہوں نے قانون کا خصوصی مطالعہ کیا ہو' اس پیشہ سے درج ذیل اوصاف حاصل کرتے ہیں جن میں نظم وضبط کی مخصوص عادات' آداب کا ایک ذوق اور خیالات کے باقاعدہ تعلق کے لیے ایک قسم کا جبلی احترام جو فطری طور پر انہیں انقلابی میلانات اور اکثریت کے بے رحمانہ جذبات کا دشمن بناتا ہے' شامل ہیں۔ڈی ٹوک ایول نے ججوں اور منتخب قانون سازوں کی حیثیت سے قانون سازی کو قانونی پیشہ کی طرف سے معتدل بنانے کے اثرات کو اہم گردانا ہے۔اسے یقین تھا کہ امریکی معاشرے میں متعدد نجی اور سیاسی تنازعات قانونی میدان میں آکر حل ہو جائیں گے۔

دیگر نظریات دانوں نے بھی قانون کے پیشہ ورانہ کلچر کے تعلق کو تسلیم کیا ہے۔ مثلاً جوڈتھ شکلار نے لکھا: قانون پسندی ہی سب سے بڑھ کر قانونی پیشہ کا باعمل نقطۂ نظر ہے۔قانون کو ایک دانش مند وجود سمجھنے کا رجحان اخلاقیات اور سیاسیات سے مختلف اور قابل فہم ہے۔اس کی جڑیں قانونی پیشہ کی اپنی سرگرمیوں میں بہت گہری ہیں اور یہی ہمارے عدالتی اداروں اور طریقۂ کار کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔

یہ کردار نگاری تجویز کرتی ہے کہ اگر قانون کی حکمرانی کو مؤثر طریقے سے کام کرنا ہے۔بالخصوص اس اہم نکتہ کو کہ ججوں کو قانون کی پیروی کے لیے وقف ہونا ہے تو پھر ان لوگوں میں مخصوص رویئے اور رجحانات موجود ہونا ضروری ہیں جو قانون میں تربیت اور مہارت رکھتے ہیں۔اگر وکلاء عمومی طور پر اس فہم سے لبریز نہ ہوں کہ ان کا خصوصی فریضہ اور ذمہ داری قانون سے وفاداری ہے تو ججوں کو ایسا ضرور ہونا چاہیے۔

نظریات دان بہرحال متنبہ کرتے ہیں کہ قانون کے پیشہ کے اپنے مفادات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے ہیں (ذاتی اور گروہی) جو اس کی قانون گوئی کو متاثر کرتے ہیں۔ بیلتھم وکلا کی گوشمالی کرتا ہے کہ وہ اجتماعی طور پر دھوکہ دہی کی مہم میں شریک ہو جاتے ہیں جس کا مقصد لوگوں کی جیبوں سے زیادہ سے زیادہ پیسہ نکلوانا ہوتا ہے۔ سماجیات کا ماہر میکس ویبر کہتا ہے کہ قانون کے پیشہ کے مالی مفادات انگلش عدالتوں کو رواجی قوانین کے تحفظ کے نام پر قانون سازی کی تباہی کی طرف لے گئے اور یہ سب کچھ قانونی اصلاحات کے پردہ میں ہوا۔ قانون کو مبہم، گمنام اور ناقابل رسائی بنا دیا گیا۔ یہ عوامل قانون کی حکمرانی کے بالمقابل عسکریت پسندی کا مظہر تھے چنانچہ وکلا عام لوگوں اور قانون کے درمیان ناگزیر ثالث اور سہولت پیدا کرنے والے عناصر بن گئے۔ یہ تشویشناک صورت حال دیگر پریشانیوں کے علاوہ ہے جن کا ذکر بعد کے باب میں کیا جا رہا ہے۔ یعنی قانون کا پیشہ اشرافیہ کے مفادات کی نگہبانی کرتا ہے جو انہیں ان آقاؤں کے مفادات میں قانون کو موڑنے کے بدلے میں زبردست منفعت بخشتا ہے۔

چنانچہ قانون کا پیشہ قانون کی حکمرانی کے عقیدہ میں پایا جاتا ہے۔ ہم عصر معاشروں میں افراد کو قانون کی تربیت دی جاتی ہے جو قانونی سرگرمیوں میں اجارہ داری رکھنے والی سماجی قوت بن جاتے ہیں۔ لبرل نظریات دان متفقہ طور پر ایک آزاد اور غیر جانبدار عدلیہ کو قانون کی حکمرانی کے حتمی محافظ کی حیثیت سے خصوصی مقام دیتے ہیں۔ کیونکہ قانون کی حکمرانی اس گروپ کی طرف سے قانونی اقدار کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن یہ صورت حال قانون کے پیشے اور بالخصوص ججوں کو قانون کی حکمرانی کے انہدام کا ذریعہ بنا سکتی ہے۔

❖....❖....❖

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

5

قدامت پسندوں کا انتباہ

انیسویں صدی کے اواخر میں نظریات دانوں کی طرف شروع کیا جانے والا انتباہ بیسویں صدی کے اواخر میں بلند آہنگ ہوگیا کہ قانون کی حکمرانی کو زوال آ رہا ہے۔ یہ ایک عجیب بے ہنگم پیراڈاکس ہے کہ قانون کی حکمرانی کے لیے موجودہ بے مثال مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس بات پر مفکرین میں اتفاق پایا جاتا ہے کہ مغرب میں یہ انحطاط پذیر ہے۔ سیاسی طیف کے دائیں بائیں پائے جانے والے دونوں نظریات دان اس تشخیص پر متفق ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دائیں بازو والے اس کا ماتم کر رہے ہیں جبکہ بائیں بازو والے اس پر مسرور ہیں۔ یہ درست ہے کہ قانون کی حکمرانی کو بہت سی سیاسی اور معاشی بیماریوں کے لیے وسیع طور پر اکسیر تجویز کیا جاتا ہے لیکن یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ آخر اس زوال کی نوعیت اور اسباب کیا ہیں چنانچہ سیاسی دائیں بازو کے دلائل کو اس باب میں زیر بحث لایا جائے گا۔

لبرل ازم بمقابلہ سوشلزم

زیر مشاہدہ زوال کا براہ راست تعلق اس شدید قسم کے نظریاتی تصادم سے ہے جو گذشتہ ڈیڑھ سو برس سے لبرل ازم اور سوشلزم کے درمیان جاری ہے۔ انیسویں صدی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے وسط کا انگلستان کلاسیکل لبرل ازم کا نکتہ عروج تھا۔ ایک فری مارکیٹ پراڈکشن ڈسٹری بیوشن' اشیا کے تبادلے اور خدمات کے حوالے سے پوری طاقت کے ساتھ موجود تھی جبکہ حکومت کی مداخلت نسبتاً محدود تھی۔ مورخ ایرک ہوبس بان کے مطابق معاشی ترقی کا انجن اس عرصہ کے دوران ریلوے کی ترقی تھا۔ اس نے سٹیل کی پیداوار میں اضافہ کیا (تاکہ ریلوے لائنیں اور بوگیاں بنائی جاسکیں) کوئلے کی کان کنی میں اضافہ ہوا (تاکہ ریلوے انجنوں کو ایندھن مل سکے) اس نے مشین سازی اور انجینئرنگ کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے سرمایہ کاری کے لیے نئے مالیاتی طریقے تخلیق کیے (تاکہ نئے پراجیکٹس زیر عمل آسکیں) اس کے نتیجہ میں بننے والے ریل نیٹ ورک نے انسانوں اور چیزوں کی نقل وحمل میں انقلاب برپا کردیا۔ بالخصوص کاٹن اور ٹیکسٹائل کے شعبہ کو آسانی میسر آئی۔ اشیا کی ترسیل زیادہ سے زیادہ مقدار میں ہونے لگی جبکہ نقل وحمل کے اخراجات کم ہوگئے۔ تجارت کے لیے نئی منڈیاں وجود میں آگئیں۔ مصنوعات بنانے والے شہروں میں وسعت آگئی۔ ملازمتوں کے نئے مواقع پیدا ہوئے جس نے آبادی کو دیہات سے شہروں میں منتقل کردیا۔ (اس کے ساتھ ساتھ شرح آبادی میں اضافہ ہوا۔) بڑی تعداد میں اجنبی (نووارد) شہروں میں آگئے اس سے کمیونٹی اور خاندانوں کے ڈھانچے تبدیل ہوگئے۔ ان تمام واقعات نے کئی اور کثیر جہتی نتائج مرتب کیے۔

تجارتی سرگرمیوں کی اس وسعت نے اپنے ثمرات غیر مساوی انداز میں پھیلائے کچھ صنعتی تاجروں کے لیے بے پناہ دولت تخلیق ہوئی۔ کامیاب تاجروں اور کاروباری افراد پر مشتمل بالائی متوسط طبقہ کے لیے دولت نے آسانیاں پیدا کیں۔ ان کے پیشہ ور مددگاروں مثلاً بینکاروں اور وکلا کو آسودگی ملی۔ کچھ لوگوں کو نسبتاً کم آسودگی ملی لیکن پھر بھی دولت کی تقسیم میں انکا حصہ موجود تھا۔ ان میں بڑھتی ہوئی تعداد میں ملازمین' اساتذہ' سٹور کلرک اور خدمات کے شعبہ سے متعلق دیگر افراد شامل تھے۔ سٹیل ملز' ٹیکسٹائل فیکٹریوں اور کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کے حصہ میں دولت تو نہ آئی لیکن انہیں پیٹ بھرنے کے لیے کھانا اور سر چھپانے کے لیے جھونپڑیاں مل گئیں۔ اس عرصہ کے دوران انگلستان میں دولت کی مقدار میں عدیم المثال اضافہ ہوا۔ اس کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برعکس بقیہ یورپ اور امریکہ میں نسبتاً کم مقدار میں لیکن دولت کی ریل پیل بہرحال ہوئی۔ صنعتوں کو عروج حاصل ہوا لیکن صنعتوں کو چلانے والوں کو جن میں محنت کش مرد عورتیں بوڑھے اور بچے سبھی شامل تھے نہایت اذیت ناک صورتحال کا سامنا تھا۔ انہیں سخت محنت کرنا پڑتی چاہے وہ بیمار ہوتے' صنعتی کارخانوں اور کانوں میں حادثات کے شکار ہوتے۔ بصورت دیگر انہیں کام سے نکال دیئے جانے کا خطرہ رہتا تھا۔ اس دور میں متوسط شہری طبقہ زندگی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ سماجی' معاشی اور سیاسی امور میں وہ غیر معمولی اثر ورسوخ کا مالک بن گیا۔

> ''وہ لوگ سرمایہ داری' مسابقت کے نجی کاروبار' ٹیکنالوجی' سائنس اور عقل وشعور میں ایمان رکھتے تھے۔ ان کا ایمان ترقی میں' ایک محدود قسم کی نمائندہ حکومت اور محدود قسم کے شہری حقوق اور آزادیوں میں تھا لیکن صرف اس وقت تک جب تک یہ سب کچھ قانون کی حکمرانی سے ہم آہنگ رہے اور اس طرح کا نظم وضبط ہو جس میں غریب اپنی جگہ پر رہے۔''

انگلستان ایک وسیع وعریض نوآبادیاتی سلطنت کے ساتھ دنیا پر اقتصادی اور سیاسی غلبہ رکھتا تھا۔ مزید برآں اس کے شہری دنیا کے بقیہ انسانوں سے زیادہ دولت اور آزادی سے لطف اندوز ہو رہے تھے البتہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں لوگ آزادی کے مقابلہ میں ان کے ہم پلہ اور دولت کے معاملہ میں تیزی سے ان کے برابر آ رہے تھے۔ یہ کامیابی بنفسہٖ ایک بڑا ثبوت تھی کہ لبرل ازم معاشی اور سیاسی دونوں حوالوں سے ایک درست نظریہ ہے۔

لبرل ازم کو اپنے شباب کی جلوہ آرائی کا موقعہ بڑی مشکل سے ابھی ملا ہی تھا کہ اس پر تاریکی کے سائے پڑنا شروع ہو گئے۔ ابتدا میں بتدریج اور پھر صدی کے آخری حصہ میں نہایت تیز رفتار سے۔ ان دو عوامل کا بالخصوص ذکر کیا جائے گا جنہوں نے لبرل ازم کو پسپائی پر مجبور کیا۔ دونوں کی نشاندہی اس وقت کے لبرل نظریہ دان جان سٹوارٹ مل نے کی۔ ان کی وجہ سے سوشلزم نے سنجیدگی کے ساتھ لوگوں کی توجہ حاصل کر لی۔ پہلا عامل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمیشہ سے غیر محفوظ رہنے والے محنت کشوں کی ایک بڑی تعداد تھی جو نفرت انگیز اور اذیت ناک حالات میں روزانہ غیر محدود وقت تک جسم و جان شل کر دینے والا کام کرتی تھی۔ وہ اپنی تباہ حال صحت اور نڈھال جسموں کے ساتھ گنجان آباد جھونپڑوں اور گندے مکانوں میں رہتے جہاں صحت و صفائی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ان کی اکثریت اپنی زندگی میں تھوڑی سی فرحت لانے کے لیے شراب کی عادی تھی۔ پر مشقت زندگی' ناقص خوراک اور شراب انہیں قبل از وقت بوڑھا اور پھر راہیٔ ملک عدم بنانے لگی۔ ان کی محنت کا معاوضہ نہایت قلیل ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو اتنا کم ہوتا تھا کہ وہ نہ تو کرائے کی چھت کے نیچے سو سکتے تھے اور نہ ہی اس قدر رہوتا تھا کہ وہ اتنی روٹی خرید سکیں جو انہیں اگلے روز کام پر جانے کے قابل بنانے والی غذائیت مہیا کر سکے۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ کارل مارکس اور اینگلز بھی ان دنوں انگلستان میں تھے جب انہوں نے محنت اور سرمایہ داری میں اجنبیت کے نظریہ پر کام کیا۔ محنت کشوں کا استحصال براہ راست ان کے مشاہدہ میں تھا۔ بہر حال آگے چل کر سماجی مبصرین کو محسوس ہوا کہ اقتدار و اختیار محض چند ہاتھوں میں نہیں بہت سے افراد کے پاس ہونا چاہیے اور یہ کہ عوام الناس اپنی ناقابل برداشت حالت پر ہمیشہ خاموش نہیں رہیں گے۔ محنت کشوں کو جس بات نے بالخصوص برہم کیا وہ واضح قسم کا تفاوت تھا جو ان کی زندگیوں اور ان لوگوں کی زندگیوں میں پایا جاتا تھا جو ان کے پڑوس یعنی شہروں میں ایک بہتر ماحول میں محنت کشوں کے خون پسینے سے پیدا ہونے والی دولت کے مزے لے رہے تھے۔ لبرل ازم کو اپنی راہ سے بھٹکانے والا کیپٹل ازم محض سنگدل ہی نہیں ناانصاف بھی تھا۔ اس سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے یعنی سرمایہ دار محنت کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے چنانچہ وہ سب سے کم حقدار تھے۔ مزید برآں یہ کہ لبرل معاشی نظام اخلاقی طور پر دیوالیہ پن کا شکار' مخالفین کو برہم کرنے والا اور روحانی طور پر مفلس' بے ہمت' خود غرض اور سماج دشمن نقطۂ نظر پر مبنی تھا۔ جو انجام کار معاشرے کے بندھن توڑ دیتا ہے۔ ''یہ انفرادیت پسندی کا اصول ہے کہ اپنے لیے سب کا مقابلہ کرو۔'' یہ مفادات کی ہم آہنگی کے لیے نہیں مفادات کی مخالفت پر مبنی ہے اور اس کے تحت ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی جگہ جدوجہد کر کے بنائے۔ دوسروں کو دھکا دے کر آگے نکل جائے یا دوسروں کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرف سے پیچھے دھکیلا جا تا رہے۔ 1870ء اور 1880ء کے عشروں میں بالآخر محنت کش اپنی طویل نیند سے بیدار ہوئے اور منظم ہونے لگے۔ پورے یورپ میں ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔

دوسرا عامل حق رائے دہی کا پھیلاؤ تھا۔ اپنے بلند بانگ دعووں کے باوجود جمہوریت کی عملی شکل یورپ میں یہ تھی کہ ووٹ کا اختیار صرف اشرافیہ کے پاس تھا۔ ایک ایسا استحقاق جس کا تحفظ وہ بڑی شدومد سے کرتے تھے۔ لبرل جمہوری نظریہ میں شخصی مساوات کا تصور موجود تھا۔ جس نے بتدریج حق رائے دہی کو وسعت دی۔ ابتدا میں یہ حق جائیداد کی شرط کو نرم کر کے اور پھر جائیداد سے محروم اجرت پر کام کرنے والوں کو بھی دے دیا گیا۔ جبکہ آخر میں (بیسویں صدی کے آغاز میں) عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق دار قرار دے دیا گیا۔ اسٹوارٹ مل نے حق رائے دہی کی وسعت کے نتائج کی پیش گوئی کر دی تھی جس سے موجود خوف وخدشات کی کڑواہٹ پھیل گئی۔

''حق رائے دہی کی وسعت (ریفارم ایکٹ آف 1867ء) نے محنت کش طبقہ کو مستقل طور پر یہ استحقاق دے دیا ہے۔ یہ حقیقت قانون سے نابلد افراد کو بھی معلوم ہے کہ محنت کش طبقات بھی سیاسی مقاصد رکھتے ہیں۔ جو انہیں محنت کش طبقہ ہونے کا شدید احساس بخشتے ہیں۔ وہ غلط یا درست طور پر سمجھتے ہیں کہ دیگر طاقتور طبقات کے مفادات اور خیالات ان کے مفادات وخیالات کے خلاف ہیں۔ اپنے مقاصد کے حصول میں چاہے وہ اس وقت کسی بھی وجہ سے فعال نہ ہوں۔ یہ بات اسی طرح یقینی ہے جس طرح سیاست میں کوئی بھی اور چیز یقینی ہو سکتی ہے کہ وہ بہت جلد ایسے ذرائع تلاش کر لیں گے جو ان کے مجموعی حق رائے دہی کے اختیار کو اپنے اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے مؤثر ذریعہ بنا دیں گے۔''

انیسویں صدی کے آخری ربع میں آنے والی عظیم کساد بازاری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی معاشی اور سماجی اکھاڑ پچھاڑ کے بعد اصلاحات کا ایک سلسلہ عمل میں آیا جس کا مقصد محنت کش مفلسوں کی حالت زار میں بہتری لانا تھا۔ ''چھوٹے لوگوں'' کی طرف سے سرمایہ داروں سے تحفظ کا مطالبہ سوشل سیکورٹی' بے روزگاری کے خلاف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرکاری اقدامات اور کارکنوں کے لیے کم سے کم اجرت کا تعین پرشور اور مؤثر احتجاج میں تبدیل ہوگیا۔ انگلستان میں اور پھر بتدریج یورپ میں ہر جگہ حکومتوں نے فلاحی اقدامات شروع کر دیئے جن میں کام کے دورانیے کم کر دیئے' اولڈ ایج پنشنز کا اہتمام کیا' ہیلتھ انشورنس کا انتظام کیا' کارکنوں کو حادثات کی صورت میں معاوضہ طے کر دیا اور سکولوں میں تعلیم کے ساتھ بچوں کو کھانا فراہم کیا جانے لگا۔ ان پروگراموں پر عملدرآمد کے لیے سرکاری ادارے قائم ہوتے۔ کلاسیکل لبرل ازم نے سوشل ویلفیئر ریاست کے قیام کا رستہ ہموار کر دیا۔

سوشل ویلفیئر کے اقدامات کی مزاحمت کئی شکلوں میں ہوئی۔ البتہ ایک نکتہ پر قدامت پسندوں نے شدومد کے ساتھ زور دیا کہ ان اقدامات نے قانون کی حکمرانی کو برے انجام سے دوچار کر دیا ہے۔ وہ نہایت بااثر نظریات دان جنہوں نے اس بحث کو ہوا دی۔ ان میں سے ایک انگلستان کا آئینی ماہر اے وی ڈائسے اور دوسرا آسٹروی انگریز سیاسی نظریہ دان فریڈرک ہائیک تھا۔ ہائیک طویل عرصہ تک امریکہ میں مقیم رہا اور معاشیات میں نوبل انعام یافتہ تھا۔

ڈائسے کی مہمیز

ایک سیاسی تصور کی حیثیت سے قانون کی حکمرانی کو بہت زیادہ نظرانداز کیا گیا تھا۔ اسے قابل بحث سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ 1888ء میں ڈائسے کی کتاب Introduction to the study of the law of the constitution شائع ہوئی جس میں کسی لبرل جمہوری نظام میں قانون کی حکمرانی کی پہلی جدید تشکیل اور تجزیہ شامل تھا۔

ڈائسے نے قانون کی حکمرانی کی وضاحت تین تہہ دار پہلوؤں کی اصطلاحوں میں کی۔ اس کا پہلا اور مرکزی نکتہ یہ ہے کہ..... کوئی فرد اس وقت تک قابل سزا نہیں اور نہ ہی قانونی طور پر جسمانی یا مالی تعزیر کا مستوجب ہوگا جب تک ریاست کے مروجہ عمومی قانون کے تحت کسی عدالت انصاف میں قانون شکنی کا مرتکب نہ قرار دیا جائے۔ اس مفہوم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں قانون کی حکمرانی ہر اس نظام حکومت سے متصادم ہے جو وسیع تر اختیارات' مطلق العنانی یا پابندی کے امتیازی اختیارات رکھنے والے افراد چلاتے ہیں۔ تین قابل امتیاز تصورات ان مشاہدات سے مرکب صورت میں ابھرتے ہیں۔ اس کے تبصرے اس تصور کو مرکز بناتے ہیں کہ پہلے سے موجود قانون کے بغیر کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی لیکن پھر وہ خود ہی ایک الگ نکتہ اٹھاتا ہے کہ عام عدالتیں ہی وہ مناسب ادارہ ہیں جن میں مقدمات کی سماعت ہونا چاہیے۔ بدنام زمانہ سٹار چیمبر مقدمہ نے انگلستان میں خصوصی عدالتی ٹربیونلز میں اختیارات کے بے جا استعمال کی قوت کے بارے میں تاریخی انتباہ کا کام کیا۔ ''انگلستان میں قانون کی حکمرانی عام عدالتوں میں سماعت کے اختیار نے قائم کی ہے۔ یہ دراصل ججوں کی حکمرانی ہے۔ ڈائسے مزید نکتہ سنجی کرتا ہے کہ حکومتی عمال کی طرف سے امتیازی اختیارات کا استعمال کسی فرد پہ پابندیاں نافذ کرنے کے لیے' قانون کی حکمرانی سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ڈائسے کا کہنا ہے کہ امتیاز اور قانون دو متضاد چیزیں ہیں۔ جج محض ایک بھونپو کی طرح ہے جو اعلان کرتا ہے کہ قانون کا تقاضا کیا ہے۔ عدالتی اختیار' قانون کی طاقت سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس' جسٹس مارشل نے تبصرہ کرتے ہوئے اسی تصور کی تائید میں مزید لکھا تھا کہ عدالتیں تو محض قانون کے آلات ہوتی ہیں اور اپنی مرضی نافذ نہیں کر سکتیں۔

قانون کی حکمرانی کا دوسرا پہلو' ڈائسے کے مطابق یہ ہے کہ عام قانون کے سامنے سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس کا بنیادی اندیشہ یہ تھا کہ حکومتی عمال (با استثنا بادشاہ) کو خصوصی تحفظات اور امتیازی استحقاق یا مراعات حاصل نہیں ہونے چاہئیں اور یہ کہ ان کو سرکاری طرز عمل پر عام عدالتوں میں قابل مواخذہ ہونا چاہیے اور یہ کہ اس سلسلے میں کسی کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہونا چاہیے۔

ڈائسے کا تیسرا پہلو قانون کی حکمرانی کے ذریعہ کی وضاحت سے کم تر ایک الگ عنصر ہے جسے اس نے عام عدالتوں کے دائرہ اختیار پر اپنے اصرار کی بنیاد بنایا ہے۔ وہ قانون کی حکمرانی کو ان عدالتی فیصلوں کی کلیت کی پیداوار قرار دیتا ہے جو عدالتوں میں عام افراد کی طرف سے حقوق کے تعین کے لیے لائے گئے مقدمات پر سنائے جائیں۔ ڈائسے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زور دیتا ہے کہ انگلش آئین انہی خدوخال کی وجہ سے قانون کی حکمرانی سے متصف ہے مثلاً وہ دلیل دیتا ہے کہ انگلستان میں دوسرے ملکوں کے برعکس ایک آزاد پریس ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پریس پر پابندیاں ایسے اقدامات ہیں جنہیں جج اور عام عدالتیں زیر سماعت لاسکتی ہیں چنانچہ وہ براہ راست حکومت کے کنٹرول میں نہیں۔ اس کی محفوظ اور قابل قدر نوعیت جو عام عدالتوں میں کیے جانے والے فیصلوں سے روزانہ نئی زندگی پاتی ہے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈائسے اسے رواجی قانون کی روایت قرار دیتا ہے۔ اس کی کلیت کی وجہ سے آزادی کے لیے تحریری آئین کی بجائے اسے زیادہ محفوظ بنیاد سمجھتا ہے کیونکہ اسے صرف کسی مکمل انقلاب کے ناپسندیدہ واقعہ کے ذریعے ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس استدلال کے ذریعے ڈائسے شہریوں کے تحفظ کے لیے سرکاری قانون کی بجائے نجی قانون کی حمایت کرتا ہے۔

اپنی کتاب کے نویں ایڈیشن کے دیباچہ میں پہلے ایڈیشن کے بعد گزرنے والے تین عشروں کے دوران آنے والی تبدیلیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے ڈائسے شکایت کرتا ہے..... ''قانون کی حکمرانی کے قدیم تقدس کو انگلستان میں گذشتہ تیس برسوں کے دوران نمایاں زوال آیا ہے۔ اس دعوے کی صداقت نہ صرف قانون سازی سے ثابت ہوتی ہے بلکہ اس عدم اعتماد کی موجودگی سے بھی ثابت ہوتی ہے جو کئی طبقات میں قانون اور ججوں کے بارے میں پایا جاتا ہے اور ان غیر قانونی طریقوں کے استعمال سے ہوتی ہے جو سماجی اور سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے بروئے کار لائے جارہے ہیں۔ ڈائسے کی برہمی کا خصوصی نشانہ قانون کی حکمرانی کو لاحق یہ سنگین خطرہ تھا کہ ترقی پذیر سوشل ویلفیئر ریاست میں انتظامی اقدامات کو نظر ثانی سے خارج کیا جارہا تھا بلکہ یہ تشویش بھی تھی کہ عدالتیں ایسی نظر ثانی کے لیے موزوں نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ اقدامات میں پالیسی' انتظام' مہارت اور استعداد کار جیسے امور ملوث تھے جو اپنی نوعیت میں قانونی نہیں تھے۔

انتظامی ایجنسیاں اس قانون سازی کے ذریعے تخلیق کی جارہی تھیں (اور اب بھی کی جاتی ہیں) جو مخصوص انداز میں ایجنسی اہل کاروں کو وسائل اور وسیع تر اختیارات سونپتی ہیں تاکہ پالیسی کو نافذ العمل کیا جائے یا کوئی سوشل پروگرام زیر عمل لایا جائے۔ ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختیارات میں عموماً قواعد وضوابط جاری کرنا' احکامات کو مربوط بنانا' اقدامات کو مؤثر بنانا اور افراد کے تنازعات میں فیصلے کرنا شامل ہوتا ہے چنانچہ وہ امتیازی فیصلے کرتے ہیں اور مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ کے اختیارات ایک ادارے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ لوکل گورنمنٹ بورڈ' دی بورڈ آف ٹریڈ' دی بورڈ آف ایجوکیشن' لینڈ کمشنرز' کمشنرز آف ریونیو' کمشنرز آف انشورنس اور دیگر ایجنسیاں وسیع تر وزارتوں کے ساتھ روزمرہ سماجی زندگی میں بڑھتی ہوئی دخل اندازی کی مرتکب ہو رہی ہیں۔ افراد پر مرتب ہونے والے بیشتر نتائج عام عدالتوں میں نظر ثانی کا حق نہیں رکھتے۔ انجام کار حکومتی اقدامات کا حلقہ مؤثر قانونی پابندیوں کے بغیر وسیع تر ہو گیا۔

اس تشویش میں صرف ڈائسے ہی مبتلا نہیں تھا۔ ایک اور چوکنا مبصر 1914ء میں لکھتا ہے۔ ''قانون کی حکمرانی کی موت اب دیانتدار مبصرین کو نوشتہ دیوار محسوس ہوتی ہے۔''

> ''مختصر الفاظ میں صورت یہ ہے کہ ہمارے انتظامی محکمے محض منتظم نہیں..... قانون ساز بھی ہیں اور اب تو وہ زیادہ سے زیادہ عدالتی فرائض سرانجام دینے پر مائل ہیں۔ انتظامی محکموں کی طرف سے عدالتی فرائض کی انجام دہی ہی ہے جو اکثر و بیشتر قانونی مسائل کو عدالتی اختیار سے خارج کر رہی ہے۔ یہ عمل بہت سے مفکرین کی نظر میں قانون کی حکمرانی سے فرار ہے اور یوں اپنے جوہر میں غلط اور شر انگیز ہے۔''

ان سوالات سے قطع نظر کہ آیا ڈائسے کا تجزیہ درست تھا یا نہیں شکوک وشبہات تو بہرحال ابھرے اور اس کی تفہیم کی اصطلاحوں میں سوشل ویلفیئر سٹیٹ اور اس کے انتظامی اداروں کی طرف سے فرد کی آزادی اور قانون کی حکمرانی کو درپیش خطرہ نمایاں ہو کر سامنے آیا..... بہت سے دوسرے لوگ بھی اس بات سے متفق ہیں۔

ہائیک کی تفصیل

ہائیک کی تفصیل وتاویل میں جانے سے پہلے قانون کی حکمرانی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر موضوع بحث بنانا ضروری ہے۔ ڈائسے کے پچاس سال بعد ہائیک نے اسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نقطہ کو مزید غلط استدلال کے ساتھ پیش کیا۔ اپنے دور کی کلاسیک تصنیف The Road to serfdom' جو 1944ء میں شائع ہوئی' میں ہائیک قانون کی حکمرانی کو آزادی کا سنگ بنیاد قرار دیتا ہے۔ ڈائسے کی مشابہت میں ہائیک بھی ''خودمختارانہ انتظامی استبداد کی وسعت اور برطانوی آزادی..... قانون کی حکمرانی..... کی بتدریج تباہی کے درمیان ایک تعلق دیکھتا ہے۔

ہائیک قانون کی حکمرانی کی ایک جامع اور انتہائی مؤثر تعریف متعین کرتا ہے۔ ''تمام تکنیکی باریکیوں سے قطع نظر..... اس کا مطلب ہے کہ حکومت اپنے تمام تر اقدامات میں ان قوانین کی پابند ہے جو پہلے سے طے شدہ اور اعلان شدہ ہیں۔ قوانین جو یہ پیش بینی یقین کے ساتھ ممکن بناتے ہیں کہ کس طرح مقتدر اعلیٰ مخصوص حالات میں اپنے استبدادی اختیارات استعمال کرتا ہے اور اس علم کی بنیاد پر اپنے امور کی منصوبہ بندی کرتا ہے..... ''قانونی آزادی کا یہی تصور ہے۔ قانون کی حکمرانی اسی فہم میں آزادی کو فروغ دینے کے لیے افراد کو اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنی ان سرگرمیوں کی وسعت سے باخبر رہیں جو قانون کے تحت ممنوعہ نہیں اور جن کو وہ حکومت کے استبداد کی زد میں آئے بغیر آزادی سے اور اپنی مرضی سے جاری رکھ سکتے ہیں۔ مجاز طرز عمل کی حدود کا پہلے سے علم اس آزادی کا کلیدی عنصر ہے۔

ہائیک کے مطابق قانون کی حکمرانی کے تمام نظام تین صفات رکھتے ہیں۔ قوانین لازمی طور پر عمومی ہوتے ہیں۔ مساوی اور یقینی ہوتے ہیں۔ عمومیت تقاضا کرتی ہے کہ قانون پہلے سے تجریدی اصطلاحوں میں وضع ہو اور اس کا نشانہ کوئی خاص فرد نہ ہو۔ اس کے بعد قانون کسی استثنیٰ کے بغیر ہر اس فرد پر لاگو ہوتا ہے جس کا طرز عمل اطلاق کی مبینہ شرائط کے ماتحت ہو۔ اس صفت کی وضاحت کرتے ہوئے ہائیک' روسو کی عمومیت کے بیان کا حوالہ دیتا ہے۔ ''جب میں یہ کہتا ہوں کہ قانون کا میدان ہمیشہ عمومی ہوتا ہے تو میرا مطلب ہوتا ہے کہ قانون تمام لوگوں کو اجتماعی طور پر زیر غور لاتا اور تمام اعمال کو تجریدی طور پر دیکھتا ہے یہ کسی فرد اور کسی مخصوص عمل کو الگ سے زیر غور نہیں رکھتا۔ ہائیک مزید کہتا ہے کہ مقننہ اور عدلیہ کے درمیان اختیارات کی علیحدگی عملاً عمومیت کا تفویض کردہ اختیار

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتی ہے کیونکہ صرف اسی صورت میں قانون تجریدی اصطلاحوں میں پہلے سے وضع ہو کر کسی خاص فرد پر نافذ ہو سکتا ہے۔ اس طرح مقننہ اور عدلیہ کی علیحدگی قانون کی حکمرانی کے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مساوات چاہتی ہے کہ قوانین کا اطلاق سب پر کسی من مانے امتیاز کے بغیر ہو۔ جب امتیازات موجود ہوتے ہیں (مثلاً مسلح افواج میں مردوں کو جبری طور پر بھرتی کیا جاتا ہے لیکن عورتوں کو نہیں) تو ہائیک کا کہنا ہے کہ ان کو جائز بنانے کے لیے ایسے لوگوں کی اکثریت سے منظور کرایا جانا چاہیے جو مختلف سلوک کا نشانہ بنتے ہیں۔ یقین کا تقاضا ہے کہ جو لوگ قانون کے احاطہ اثر میں آتے ہیں انہیں وہ پورے بھروسہ کے ساتھ یہ جاننے یا سمجھنے کے قابل ہوں کہ کون سے قانونی ضابطے ان کے طرز عمل کے نگران ہوں گے اور کس طرح ان ضابطوں کی تاویل اور تطبیق کی جائے گی۔ سمجھنے کی صلاحیت اس تقدیمی علم کا ضروری پہلو ہے جو آزادی نقل و حرکت کو ممکن بناتا ہے۔

ہائیک تسلیم کرتا ہے کہ کسی بھی قانونی نظام کے لیے ان تینوں خوبیوں کا درست ترین حصول مشکل ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ انہیں بلاشبہ زیادہ سے زیادہ اس کے قریب ہونا چاہیے۔ قانون کی حکمرانی کے یہ تینوں پہلو آزادی کو اس طرح محفوظ کرتے ہیں کہ جب ہم قانون کی اطاعت کرتے ہیں بالکل اسی مفہوم میں جس طرح اس کا تقاضا ہے تو ہم کسی دوسرے فرد کی مرضی کے تابع نہیں ہوتے بلکہ آزاد ہوتے ہیں اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ قانون بنانے والا نہیں جانتا کہ کن خصوصی مقدمات میں اس کے قوانین کا اطلاق ہوگا اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ جج جو ان قوانین کا اطلاق کرتا ہے اسے نتائج اخذ کرنے میں کسی پسند ناپسند کا اختیار نہیں ہوتا چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ قوانین حکمرانی کرتے ہیں افراد نہیں۔ ہائیک بھی (ڈائسے کی طرح) قانون اور امتیاز کے درمیان ایک بنیادی تضاد وضع کرتا ہے اور امتیاز کو مطلق العنانی کے مترادف قرار دیتا ہے۔ اس مفہوم میں جس طرح فریڈرک میٹ لینڈ قرار دیتا ہے کہ برے عمومی قوانین بھی بے لگام مرضی سے بہتر ہوتے ہیں۔ ''تکون مزاجی دہ بدترین خامی ہے جس کا مظاہرہ محکمہ انصاف کر سکتا ہے۔ مسلمہ عمومی قوانین چاہے برے ہوں وہ پہلے سے نہ موجود ہونے والے ضابطوں پر مبنی فیصلوں کے برعکس آزادی میں بہت کم مداخلت کرتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہائیک تسلیم کرتا ہے کہ جدید حکومتوں کو امتیاز پر عمل پیرا ہونا پڑے گا اگر وہ مستعدی سے کام کرنا چاہتی ہیں۔ اس کی تشویش انتظامیہ کی طرف سے ان استبدادی اقدامات کے لیے ہے جو شہریوں اور ان کی املاک کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ چاہے یہ اقدامات لازمی طور پر قانون کی حکمرانی کے خلاف نہ ہوں' ہائیک کے مطابق چاہے ان کا امتیاز قانونی ضابطوں کے اتباع میں ہو جو عمومیت' مساوات اور یقینیت کی خوبیاں رکھتے ہیں ان کے فیصلے عدالتی چشم پوشی پر مبنی ہوں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اکثر اوقات یہ قانونی پابندیاں موجود نہیں ہوتیں۔ مزید برآں کوئی انتظامی حاکم جو مخصوص پالیسی نتائج حاصل کرنے کی کوشش میں جبر و استبداد کرتا ہے جبلی طور پر قانون کی حکمرانی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ ہائیک اصرار کرتا ہے کہ اس طرح عمومیت کے تقاضے کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔ سماجی انصاف کا یہ تعاقب حکومتوں کے لیے ضروری امر بناتا ہے کہ وہ شہریوں اور ان کی املاک کے ساتھ سلوک کو انتظامیہ کا ایسا مقصد بنائے جس میں مخصوص گروہوں کے لیے مخصوص نتائج حاصل ہو سکیں۔ ہائیک کے مطابق اس حوالے سے انتظامی اقدامات کا فروغ قانون کی حکمرانی کے تصور سے بہت دور جا چکا ہے ہائیک خاص طور پر ان باتوں پر اندیشے میں مبتلا اور حقارت کا اظہار کرتا ہے جو اس کی نظر میں سماجی انصاف کے نام پر ترقی پسند اس تصور کے خلاف مسلسل کر رہے تھے۔

ہائیک بنیادی مساوات اور تقسیمی انصاف کی مخالفت میں

انتظامی اقدامات پر حملہ آور ہوتے ہوئے ہائیک بحث کرتا ہے کہ بنیادی مساوات اور بنیادی (یا تقسیمی) انصاف جبلی طور پر قانون کی حکمرانی سے عدم مطابقت رکھتے ہیں۔ بنیادی مساوات ایک ایسا تصور ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ مختلف مقام و مرتبہ کے لوگوں سے مختلف انداز کا سلوک ان کے غیر مساوی مقام کی وجہ سے ہونا چاہیے (رسمی مساوات کے برعکس جو ہر ایک سے ایک جیسا سلوک کرتی ہے اور حالات و واقعات میں اختلافات کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھتی) تقسیمی انصاف کا تصور تقاضا کرتا ہے کہ معاشرے میں اشیا کی تخصیص دیانتداری سے ہونا چاہیے۔ اس دیانتداری سے جس کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعین صلاحیت (خوبی) یا وصف کے معیار کے تحت کیا جا چکا ہو۔ یہ تصورات اس غیر منصفانہ تقسیم سے مربوط ہیں جو اکثر اوقات غیر مساوی صورت حالات اور اس کے برعکس صورت کی طرف لے جاتی ہے۔ اسے مزید ٹھوس اصطلاحوں میں رکھتے ہوئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ امیر پیدا ہونے والے یا غریب پیدا ہونے والے لوگوں کو ان کی مادی فوقیت اور عدم فوقیت کی بنیاد پر اخلاقی اعتبار سے برابر اور مستحق نہیں کہا جا سکتا (تقسیمی ناانصافی)۔ مساوی سلوک کرتے ہوئے عدم فوقیت کے شکار غریب آدمی کے ساتھ یقیناً امتیازی (ہمدردی) رویہ ہونا چاہیے (بنیادی مساوات)۔ عدم مساوات کی اور بہت سی صورتیں موجود ہیں جن کو دولت کی غیر منصفانہ سماجی تقسیم پر مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا مثلاً جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں میں فرق اور پرورش میں تفاوت۔

تقسیمی انصاف پر ہائیک کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ کوئی ایسا مسلمہ نظام اقدار نہیں ہے جس کے مطابق کوئی معاشرہ تعین کر سکے کہ کون سی تقسیم منصفانہ ہے چنانچہ کچھ لوگوں کے خدشات دوسروں کے بارے میں موجود رہیں گے یہاں تک کہ کسی ایسے معاشرے میں بھی جہاں کسی نظام اقدار پر اتفاق پایا جاتا ہو متضاد اقدار کے درمیان تنازعات اٹھ کھڑے ہوں گے اور ناگزیر طور پر اکثریت کی طرف سے اختلافات کا اظہار کیا جائے گا۔ ہائیک کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس طرح کا کوئی نظام ضرورت کے مطابق تفریق پسند ہوگا کیونکہ لامتناہی تنوع (حالات و واقعات کا) ابھرنے پر پہلے سے وضع کردہ عمومی قوانین سے سنبھالا نہیں جا سکے گا۔ تقسیمی انصاف اسی لیے جبلی یا پیدائشی طور پر قانون کی حکمرانی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ بنیادی مساوات بھی اسی وجہ سے قانون کی حکمرانی کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس لیے بھی خلاف ورزی کرتی ہے کہ اس کا مختلف (غیر مساوی) سلوک بھی مساوات کے تقاضوں کو نظر انداز کرتا ہے جو رسمی اصطلاحوں میں قابل فہم ہے۔ یہاں تک کہ اگر معاشرہ تمام افراد کے ابتدائی نکتہ کو بھرپور طریقے سے مساوی کرنا چاہے۔ بالفرض تمام وسائل کو مساوی طریقے سے تقسیم کر دے ایک جیسا تعلیمی نظام تخلیق کر دے (پیچیدگیوں اور امیروں پر نافذ پابندیوں سے قطع نظر) پیدائشی اور جبلی تفاوت کی وجہ سے عدم مساوات اور نابرابریاں ابھر آئیں گی اور پھر تخصیص پسند مطابقت کو کبھی ٹالا نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جا سکے گا۔

ہائیک تسلیم کرتا ہے اور غیر معذرت خواہانہ انداز میں اپنے مؤقف کے غیر منصفانہ مفاہیم کو قبول کرتا ہے۔

''ایک ضروری اور اکلوتا بظاہر متناقص نتیجہ اس کا یہ ہے کہ رسمی مساوات قانون کے سامنے متصادم بلکہ درحقیقت متضاد ہے کہ حکومت کا کوئی سا اقدام یا سرگرمی جس کا مقصد مادی یا مختلف لوگوں کی بنیادی مساوات سے ہو اور کوئی پالیسی جس کا تعلق براہ راست تقسیمی انصاف کے بنیادی تصور سے ہو لازمی طور پر قانون کی حکمرانی کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگی۔ مختلف لوگوں کے لیے ایک جیسے نتائج پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ساتھ مختلف قسم کا سلوک ہو۔ اس بات کی تردید نہیں کی جا سکتی کہ قانون کی حکمرانی معاشی عدم مساوات پیدا کرتی ہے۔ اس کے لیے صرف یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس عدم مساوات کا مقصد مخصوص لوگوں کو مخصوص انداز میں متاثر کرنا نہیں ہے۔''

ہائیک کا اصرار ہے کہ نتیجہ کے طور پر ابھرنے والا فرق یقیناً قابل افسوس ہے لیکن لبرل معاشروں کے غریبوں کے پاس سوشلسٹ معاشروں کے مساوی عوام کے برعکس زیادہ غیر مشروط دولت ہے اور وہ زیادہ آزادی سے لطف اندوز ہوتے ہیں جس میں ایسے اقدامات کرنے کی بھی آزادی ہے جو ان کی معاشی حالت کو مزید بہتر بناتے ہیں۔ وہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ حکومت معاشرے کے پسماندہ ارکان کو ایک کم از کم درجہ کی اعانت مہیا کر سکتی ہے کیونکہ یہ غیر استبدادی طریقوں سے ممکن ہے۔ (وہ عوامی خدمات کے لیے ٹیکس عائد کرنے کی تجویز پیش نہیں کرتا کہ ایسا کرنا استبدادی ہو جاتا ہے)

رواجی قانون اور قانون سازی کے لیے ہائیک کا نقطۂ نظر

پہلی جھلک میں ہائیک کا نقطۂ نظر قانون کی حکمرانی کے لیے رواجی قانون کے نظاموں سے بے جوڑ محسوس ہوتا ہے کیونکہ یہ بنیادی طور پر ججوں کے بنائے ہوئے قانون

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ہائیک نے شروع میں اس تشویش کا اظہار کیا تھا کہ..... قانون کی حکمرانی کے تصور اور نظیری قانون کے نظام کے درمیان کچھ جبلی قسم کا تصادم ہے چونکہ نظیری قانون کے تحت جج مسلسل قانون تخلیق کرتا ہے چنانچہ یہ اصول کہ وہ محض پہلے سے موجود ضابطوں کو نافذ کرتا ہے ایسے رائج نظام میں درست طور پر نہیں اپنایا جاتا۔

تقریباً دو عشروں کے بعد ہائیک نے اپنے اس مؤقف میں تبدیلی پیدا کر لی کہ رواجی قانون درحقیقت آزادی اور قانون کی حکمرانی کا برج ہے۔ اس نے ڈائسے کی طرح رواجی قانون کی مذکورہ تعریف قبول کر لی۔ ہائیک نے رواجی قانون میں مارکیٹ کے ''خفیہ ہاتھ'' کا تصور نافذ کرتے ہوئے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کی کہ قانون اپنی اصلاح کرنے والا برجستہ نظام ہوتا ہے جو سب کے مفاد کا حامل اور کسی ایک فرد کی منشا کی پیداوار نہیں ہوتا۔ افراد معاشرے کے اندر باہم عمل کرتے ہیں۔ یہ باہمی تعامل ان اقدار، ضوابط، رسم و رواج اور معمولات سے آگاہی اور مطابقت میں ہوتا ہے جنہیں کوئی تخلیق نہیں کرتا بلکہ اس موافقت میں ہوتا ہے جس میں سب زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ یہ ضابطے اور معمولات ایک ارتقائی عمل میں ترقی پاتے ہیں جو سماجی اختلاط کی ضروریات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قانون اس سماجی انتظام کے رسم و رواج اور اقدار کی بلوریں شکل ہوتی ہے چنانچہ یہ معاشرے سے ظہور پاتا اور اس کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔

ہائیک کے مطابق رواجی قانون افراد کے مقدمات سے نمٹنے والے ججوں کے فیصلوں کی افزائش سے بنتا ہے۔

''جج کی کوششیں اس طرح اس عمل کا حصہ ہوتی ہیں جس کے تحت معاشرہ حالات کے مطابق خود کو ڈھالتا ہے اور جس کے نتیجہ میں خود رو نظام نشوارتقا پاتا ہے۔ وہ انتخاب کے عمل میں اس طرح معاونت کرتا ہے کہ ان ضابطوں کو برقرار رکھتا ہے جو دوسرے ضوابط کی طرح ماضی میں مفید اور مؤثر ثابت ہو چکے ہوتے ہیں۔ انہیں مزید ایسی صورت دیتا ہے کہ وہ توقعات پر پورے اتریں اور متنازعہ نہ بنیں۔ اس طرح وہ اس نظام کا ایک عضو بن جاتا ہے۔ لیکن ان فرائض کی انجام دہی کے دوران جب وہ نئے ضابطے تخلیق کرتا ہے تو وہ نئے نظام کا خالق نہیں بلکہ موجودہ نظام کا ایک خادم ہوتا ہے اور اس کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوششوں کے نتیجہ کو ''انسانی عمل کی پیداوار کہا جائے گا' انسانی ارادوں کی نہیں۔ جس میں نسلوں کے تجربات سے حاصل ہونے والا علم اس علم سے زیادہ مفید ہوتا ہے جو کسی ایک شخص کو حاصل ہو سکتا ہے۔''

ہائیک کے مطابق روایتی قانون کے ججوں کی بنیادی کوشش اور سمت کسی ایسے فیصلہ پر پہنچنا ہوتی ہے جو معاشرے میں قانونی ضابطوں اور انصاف کے تصورات پر مبنی عمومی توقعات پر پورا اترے۔ جج اس فریضہ کی تکمیل ان قانونی ضابطوں اور اصولوں کی نشاندہی کر کے کرتے ہیں جو سابقہ فیصل شدہ مقدمات کے پیٹرن کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں جج قانون سازی نہیں کرتے چونکہ وہ محض اس بات کو واضح کر رہے ہوتے ہیں کہ موجودہ قانون پہلے سے جبلی اور پیدائشی ہے۔ چنانچہ اختیارات کی علیحدگی کی خلاف ورزی نہیں ہوتی اور نہ ہی فیصلے غیر متوقع ہوتے ہیں۔ جب ججوں کو اصولوں کی حکمرانی میں یا انصاف کے مشترکہ تصورات میں کوئی جواب نہیں ملتا تو وہ اپنے فیصلے ایسے ضابطے یا اصول کی بنیاد پر کرتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ عمومی اطمینان و رضامندی کا مظہر ہو۔ ہائیک کی طرف سے روایتی قانون کی یہ توصیف قدیم قرون وسطیٰ کے نقطۂ نظر کی بازگشت لگتی ہے کہ..... قانون دریافت کیا جاتا ہے..... بنایا نہیں جاتا۔

ہائیک روایتی قانون کی اس تفہیم پر مبنی قانون سازی کا ایک مشکوک نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ بلاشبہ ایک جزوی حقیقت یہ ہے کہ سوشل ویلفیئر ریاست جس پر وہ نوحہ کناں ہے' مقننہ کی تحریکات پر تعمیر ہوئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی تنقید قانون سازوں کے علم کی ناقابل تلافی کمی کو نشانہ بناتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ نہ تو کوئی جانتا ہے اور نہ جان سکا ہے کہ معاشرے میں کیا کچھ رونما ہوتا ہے تاکہ قانون سازی کے اقدامات کے مکمل نتائج کا پہلے سے سدباب کر سکے۔ نہ صرف اس لیے کہ باہمی عمل لامتناہی ہوتا ہے جو سماجی زندگی کا احاطہ کرتا ہے بلکہ افراد کے انفرادی اقدامات اقدامات' محرکات اور تخمینوں سے نابلد ہونے کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے اور پھر اس لیے بھی وہ سدباب نہیں کر سکتے کہ ہر عمل اَن گنت ردعمل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ روایتی قانون اس لیے برتر ہے کہ یہ موجود حالات کے ردعمل میں باقاعدہ فیڈ بیک کے ساتھ بتدریج متشکل ہوتا ہے' پچھلے فیصلوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ردعمل میں نئے مقدمات آتے ہیں اور اس میں ردوبدل کرنے کی صلاحیت ہونے کی وجہ سے ایک ایسے انداز میں روبہ عمل آتا ہے جو علم کی کلیت سے لبریز ہوتا ہے۔ ایسا کسی ایک فرد یا گروہ میں بہت مشکل سے پایا جاتا ہے۔

ہائیک کا کہنا ہے کہ رواجی قانون میں ترامیم کے لیے مناسب طریقہ کار محدود ہونے کے باوجود موجود ہے۔ جائز قانونی اصلاحات کے لیے بار بار پیش آنے والی صورت حال ہائیک کے مطابق رواجی قانون کو جکڑنے والے مفادات کے واقعات ہیں۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح کے شعبوں مثلاً مالک اور ملازم کے درمیان تعلقات کے بارے میں قانون' زمیندار اور مزارعہ کے درمیان تعلقات' قرض خواہ اور قرض دہندہ کے درمیان تعلقات اور موجودہ زمانے میں کاروباری اداروں اور صارفین کے درمیان تعلقات کے ضابطے فریقین میں سے ایک کے خیالات اور ان کے مخصوص مفادات نے تبدیل کر دیئے ہیں۔

انصاف' جمہوریت اور قوانین حقوق.....اور ہائیک

ہائیک کے نزدیک انصاف.....املاک' معاہدات' دیوانی ہرجانہ اور فوج داری قوانین کے امتناع کا طفیلیہ ہے۔ انصاف رائج قوانین کے نفاذ کا نام ہے۔ منصفانہ طرز عمل کے ضابطے بنیادی طور پر جائیداد کی ملکیت اور لین دین کی نگرانی کس طرح کی جائے گی' سے متعلقہ طے شدہ توقعات پوری ہونے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انصاف کے لیے اس کا معیار بری طرح کھوکھلا ہے کیونکہ اس میں کوئی اخلاقی پیمانہ نہیں ہے اور آفاقیت کے علاوہ کسی معیار کو مطمئن نہیں کرتا۔ ''اس طرح انصاف کسی ٹھوس مقدمہ میں خطرے میں پڑے مخصوص مفادات کو توازن میں نہیں لاتا' نہ ہی افراد کے قابل تعین مفادات کو تحفظ دیتا اور نہ ہی اس کا مقصد ایک ایسی مخصوص صورت حال تشکیل دینا ہے جسے منصفانہ قرار دیا جائے۔'' ہائیک کا انصاف قانون کی حکمرانی میں ایک اور ردوبدل بن کر سامنے آتا ہے۔

جمہوریت کے لیے البتہ ہائیک اپنی حمایت کا اظہار کرتا ہے' اگرچہ بعض اوقات اصطلاحی اعتبار سے نیم پُرجوش ہے۔ وہ جمہوریت کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزادی کے اہم محافظوں میں سے ایک ہے۔ حکومت تبدیل کرنے کا اکلوتا پُرامن طریقہ ہے جو اب تک انسانی معاشروں نے دریافت کیا ہے۔ تاہم ہائیک تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ جمہوریت آسانی کے ساتھ استبداد میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جو کچھ قانون سازی میں پایا جاتا ہے وہ عام طور پر اکثریت کی خواہش نہیں بلکہ مخصوص مفادات ہوتے ہیں۔ جدید جمہوریتیں جو قانون کے معاون نظریات سے ابھری ہیں وہ قانون سازی کو ایک ایسے ہتھیار کے طور پر دیکھ رہی ہیں جسے حکومت کی لوٹ مار کو سیاسی عمل کے دوران جیتنے والوں میں تقسیم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ عمومی نہیں بلکہ تفریق پسند ثابت ہوتا ہے یعنی کچھ لوگوں سے لے کر دوسروں کو نوازنا' لوگوں کے ساتھ مسلسل غیر منصفانہ سلوک ہوتا ہے۔ ہائیک نے اس کا حل یہ پیش کیا تھا کہ تمام قانون سازی محدود اور قانون کی حکمرانی کے ساتھ ہونی چاہیے۔ بالخصوص جائز قانون سازی کی پڑتال یہ ہونی چاہیے کہ یہ عمومیت' مساوات اور یقینیت کے تقاضوں پر پوری اترے۔ یہ پابندی اس کے خیال میں ایسی قانون سازی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی جو مخصوص گروہوں کے مفاد میں ہوسکتی ہے اور اس کے نتیجہ میں قانون سازی میں مجموعی طور پر کمی آجائے گی کیونکہ یہ مذکورہ شرائط پر آسانی سے پوری نہیں اترے گی۔

ہائیک اعلان کرتا ہے کہ حقوق کے قوانین آزادی کے کاز کے لیے مفید رہے ہیں۔ لیکن وہ دعویٰ کرتا ہے کہ قانون کی حکمرانی شخصی حقوق کی خلاف ورزی کی مؤثر ترین روک تھام کرتی ہے اور شخصی حقوق کے قوانین سے بہتر ہے کیونکہ اس کے تحت جو لوگ حکمرانی کرتے ہیں وہ استبدادی قوانین اپنانے سے گریز کریں گے کیونکہ عمومیت اور مساوات کے تحت یہ قوانین ان پر بھی لاگو ہوں گے۔ ایسی کوئی دفعہ یا شرط (جو قانون کی حکمرانی سے وابستگی کا تقاضا کرتی ہے) بذات خود سب کچھ حاصل کرلے گی اور اضافی طور پر یہ کہ حقوق کے روایتی قانون تحفظ کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ چنانچہ یہ ایک الگ فہرست مرتب کرے گی جس میں تحفظ یافتہ غیر ضروری بنیادی حقوق ہوں گے۔

کچھ نظریات دانوں نے قانون کی حکمرانی میں اپنے غیر متزلزل ایمان کا اظہار کیا ہے۔ ہائیک برابر کے مطابق قانون کی حکمرانی آزادی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ یہ

کیلئے مذکورہ بالا تمام کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرد کی آزادی کا تحفظ مہیا کرتے ہوئے وہ سب کچھ کرنے کا موقعہ دیتی ہے جس کی ممانعت قانون نہیں کرتا۔ یہ انصاف کا جوہر ہے۔ یہ ایک ایسی مؤثر رکاوٹ ہے جو جمہوریت کو استبدادی بننے سے روکتی ہے۔ یہ افراد کو حقوق کے قوانین سے زیادہ تحفظ فراہم کرتی ہے۔ ہائیک کا قانون کی حکمرانی کا تصور روایتی ہے' بنیادی نہیں اور یہ اس مفہوم میں ہے کہ وہ قانون کے اجزا میں کوئی خصوصی تقاضا شامل نہیں کرتا۔ تاہم وہ اس سے اہم بنیادی مفاہیم اخذ کرتا ہے۔ اس کا قانون کی حکمرانی کا بیان ایسی کوششوں کو رد کرتا ہے جو بنیادی مساوات اور تقسیمی انصاف کے حصول میں کی جاتی ہیں۔ البتہ وہ ایسے تمام سوشلسٹ اقدامات پر زور دیتا ہے جو تقسیم نو کو ممکن بنائیں۔

سوشل ویلفیئر سٹیٹ جھیلتی ہے

ہائیک اور ڈائسے نے قانون کی حکمرانی کے تحفظ کے لیے سوشل ویلفیئر سٹیٹ کی جارحیت کے خلاف فرد کو بند باندھنے کے لیے پکارا لیکن یہ پکار حقیر اور ناکام ثابت ہوئی۔ غالباً یہ حتمی حساب وشمار کے لیے قبل از وقت تھی۔ ان کے انتباہوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انتظامی ریاست تیزی سے آگے بڑھتی رہی اور حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے دوران ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور انگلستان میں اس کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی۔ ان دونوں ملکوں میں تو اس کا تصور تخلیق ہوا تھا لیکن لبرل مغرب کے بقیہ ملکوں میں بھی یہ توانا ہوگئی۔ اس کے نتیجہ میں اقتصادی اور سماجی ضابطے بنے جن کا ہدف پیچیدہ موضوعات تھے۔ مثلاً آلودگی پہ قابو پانا' صارفین کا تحفظ اور مقام کار پہ حفظان صحت اور حفاظتی اقدامات وغیرہ اور اس کے نتیجہ میں امتیازی معیار اور ماہرین کی طرف سے فیصلہ سازی میں اضافہ۔

اس پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ انتظامی اقدامات بھی قانونی سانچے میں ڈھالے جانے لگے۔ ایڈمنسٹریٹو پروسیجرز ایکٹ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صدی کے وسط میں نافذ ہوا جبکہ انگلستان میں ایڈمنسٹریٹو لاء نے انتظامی اقدامات پہ قانونی پابندیاں عائد کیں۔ ایسی پابندیاں زیادہ تر طریقۂ کار کی تھیں اور امریکہ میں انتظامی اقدامات کا جائزہ لینے والے ججوں نے انتظامی فیصلوں کو ان کی مہارت کی وجہ سے بھرپور احترام دیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایڈمنسٹریٹو ایجنسیوں نے فرائض کی داخلی تقسیم قائم کی بالخصوص آزاد ایڈمنسٹریٹو کورٹس قائم کیں جو عمومی قانون کی عدالتوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔

قدامت پسندوں نے مزاحمت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ڈی ریگولیشن اور ویلفیئر ریفارمز کے واقعات جنم لیتے رہے اور اس کی مثال امریکہ میں ریگن اور انگلستان میں تھیچر کے ادوار ہیں۔ سوشل ویلفیئر سٹیٹ کے بنیادی تختے محفوظ رہے۔ حالانکہ پھیلاؤ کی رفتار اگر ختم نہ ہوئی تو سست ضرور ہوگئی۔ ایک سیاسی نظریہ دان نے بیسویں صدی کے اختتام پر قانون کی حکمرانی کے حوالے سے درج ذیل نقشہ کھینچا ہے۔

''شواہد مسلسل ثابت کر رہے ہیں کہ قانون کی حکمرانی کے اہم اجزا اہم عصر ضابطہ پسند ریاست کے حالات میں منتشر ہو رہے ہیں۔ ہر سرمایہ دارانہ ویلفیئر ریاست میں قانون تیزی کے ساتھ غیر متشکل اور غیر متعین صورت اختیار کر رہا ہے جس طرح .....''مفاد عامہ میں''(In the Public Interest) یا ''صدق نیت سے'' (In Good Faith) جیسے قانونی معیار قانونی اقدار کی افزائش کے کلاسیکل لبرل تصورات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رہے تھے۔ ہر جگہ روایتی پارلیمانی قانون سازی کا ایک تکلیف دہ اختلاط یا انضمام مخصوص حالات سے مربوط انتظامی اقدامات کے نتائج سے ہو رہا ہے۔ ہر جگہ افسر شاہی اور عدالتی حکام کے امتیاز فروغ پا رہے ہیں۔ اگر قانون کی حکمرانی کے تصور کا کم سے کم مطالبہ یہ رہا ہے کہ ریاستی اقدامات کو پیشین گوئی کے قابل شکل میں ہونا چاہیے تو ہم عصر جمہوریتیں اس معیار سے بہت پیچھے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

6

انتہا پسند بایاں بازو اور قانون کی حکمرانی کا زوال

سیاسی دایاں بازو مغرب میں قانون کی حکمرانی کے انحطاط پر نوحہ کناں ہے تو انتہا پسند بایاں بازو اس انحطاط میں شدت لانے میں مصروف ہے۔ ان کی مخالفت لبرل ازم کے خلاف اشتمالیت پسندی کے ردعمل پر اور لبرل نظاموں میں قانون کی حکمرانی کے منفی نتائج پر مبنی تھی۔ بالخصوص ان نتائج کے حوالے سے جن کا تعلق تقسیمی انصاف اور رسمی مساوات سے تھا۔ انتہا پسند بائیں بازو کے عناصر لبرل ازم اور کیپٹل ازم پر زیادہ برہم ہیں جبکہ قانون کی حکمرانی پہ اس لیے تنقید کرتے ہیں کہ یہ اس سیاسی اور معاشی نظام کو استقامت مہیا کرنے کی خدمات پیش کرتا ہے۔ یہ باب ان دلائل پہ توجہ مرکوز کرے گا جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قانونی نظریات دان اٹھاتے رہے ہیں اور جہاں قانون کی حکمرانی کو نظریاتی چیلنج سب سے زیادہ پُرشور رہا ہے۔ ایسی کڑی تنقید صرف ایک ایسے ملک میں پیش کی جا سکتی تھی جس میں قانون کی حکمرانی کے ساتھ ایک طویل شناسائی نے لوگوں کو اس کی حدود و قیود سے خوب آشنا کر رکھا ہے اور ایک ایسے احساس تحفظ کی طرف لے گئی ہے جس نے اس کے فوائد کو قابل فراموش بنا دیا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1960ء اور 1970ء کے عشروں میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ایک بہت بڑا سماجی انقلاب دیکھا۔ یہ شہری حقوق کے لیے جنگ' ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاج' ڈرافٹ پہ عملدرآمد سے انکار اور سکول بسوں کی مزاحمت کی صورت میں ابھرا۔ اس کے ساتھ معاشی مستقبل کے لیے اندیشے (تیل کا بحران اور افراط زر) سیاست میں بدعنوانیاں (واٹر گیٹ)' جنسی آزادی اور ذہن پر اثرانداز ہونے والی ادویات جیسے مسائل نے مل کر ایک عوامی ابھار کو جنم دیا۔ صدر جان ایف کینیڈی اور اس کے بھائی اور سیاسی جانشین رابرٹ کینیڈی کو قتل کر دیا گیا۔ شہری حقوق کے علمبردار مارٹر لوتھر کنگ کا قتل ہوا۔ امریکی فوجیوں کے تابوت اور ویت نام کے دیہات پر نیپام بموں کو گرانے سے ہونے والی تباہیوں کے مناظر ٹیلی ویژن سکرین پر ابھرے تو امریکیوں کی معصومیت کا خاتمہ ہو گیا۔ بمباری اور بنک ڈکیتیاں' ویدر مین اور شکاگو-7 نے امریکہ میں غیر مانوس سیاسی دہشت گردی کے مناظر پیدا کیے۔ میلکم ایکس اور بلیک پینتھرز نے سفید فام امریکیوں کو خوف زدہ کر دیا۔ یہ سب کچھ ٹیلیویژن پر دکھایا گیا جس نے سارے ملک کو یقین دلا دیا کہ یہ ایک گہری دراڑ ہے۔ ملک ایک کثیر پہلو بحران کی گرفت میں ہے اور شاید ایک عظیم قوم کے زوال کا پہلا مرحلہ ہے۔

قانون اس قومی افتراق کی سنگینی میں پھنس گیا۔ دونوں طرف سے اسے مطعون کیا جا رہا تھا۔ بائیں بازو کے نزدیک قانون اکثر و بیشتر غلط سمت میں تھا۔ وہ اس کا تحکمانہ چہرہ دکھاتے جو اختیار و مراعات کا تحفظ کرتا ہے۔ پُرامن مظاہروں اور دھرنوں کا جواب برہم پولیس اور نیشنل گارڈز کے ساتھ دیتا ہے جن کے پاس ڈنڈے' سنگین چڑھی رائفلیں اور جھپٹنے والے کتے ہوتے ہیں۔ دائیں بازو کے نزدیک بے قابو سول نافرمانی قانون کی بے حرمتی کی حوصلہ افزائی کرتی اور سماجی بدنظمی کا خطرہ پیدا کرتی ہے۔ اس کا جواب قانون بڑے انکسار اور بے یقینی سے دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں مزید لاقانونیت جنم لیتی ہے۔ بایاں بازو وارن سپریم کورٹ کی تعریف کرتا کہ وہ اکلوتا قانونی ادارہ ہے جو سماجی انصاف کے لیے ترقی پسندانہ موقف رکھتا ہے۔ لیکن خوفزدہ بھی رہتا کہ وارن جانشین برگر کورٹ اس تھوڑی سی بہتری کو بھی ختم کر دے گا۔ جبکہ محکمہ قانون میں بہت سے لوگ جن میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدامت پسند اور مرکزی دھارے کے عناصر شامل تھے وارن کورٹ ججوں کو غیر ضروری طور پر فعال قرار دے رہے تھے۔ وہ الزام لگاتے کہ یہ جج نیا آئین تحریر کر رہے ہیں تاکہ اپنا سیاسی نظریہ پروان چڑھا سکیں۔ سب لوگ سمجھ رہے تھے کہ لیگل لبرل ازم کا ایک بحران جاری ہے اور قانون کی حکمرانی کا انجام زیادہ دور نہیں۔ جس طرح کا اذیت ناک دور انہوں نے گزارا' اس میں محسوس ہوتا تھا کہ پرانے نظام کی شکست و ریخت اور کسی نئے نظام کی تخلیق کے درمیان عبوری مرحلہ چل رہا ہے۔

ایک بحران انگیز لیگل سٹڈیز موومنٹ اس سماجی خلفشار میں سے ابھری جس کا نعرہ تھا..... قانون ہی سیاست ہے اور ہدف لیگل لبرل ازم تھا۔ اس تحریک کے بانی ارکان ممتاز اداروں میں 1960ء کے عشرہ کے دوران قانون کے طالب علم اور اب 1970ء کے عشرہ میں قانون کے پروفیسرز تھے۔ انہوں نے اپنے سابقہ اتحادیوں کو نفرت و کراہت کے ساتھ دیکھا۔ یہ لوگ لبرل ازم کی طرف جھکاؤ رکھنے والے ایسے پروفیسرز تھے جو اکثر و بیشتر انقلاب کی مخالف سمت میں کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ وہ لیگل لبرل ازم کے نام پر ہونے والے فراڈ کو بے نقاب کرنے میں پُرعزم تھے۔ اس موومنٹ کا فلسفی رہنما رابرٹو انگر تھا جس کی کتاب Knowledge & Politics۔ 1975ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں لبرل ازم پر نظریاتی تنقید کی گئی تھی۔ دوسری کتاب Law in Modern Society 1976ء میں شائع ہوئی۔ اس میں جدید لبرل معاشروں میں قانون کی حکمرانی کے زوال کے موضوع بناتے ہوئے لبرل ازم اور قانون کی حکمرانی کے خلاف مہم کی ابتدا کی گئی۔

انتہا پسند بائیں بازو کی نظر میں آزادی اور مساوات

انتہا پسند بائیں بازو نے دیکھا کہ لبرل ازم آزادی اور مساوات کا وعدہ کرتا ہے لیکن اس کے برعکس خفیہ طور پر تسلط اور عدم مساوات کی نئی صورتوں کی طرف لے جاتا اور انہیں قانونی پردے میں چھپاتا ہے۔ لبرل جنون شخصی آزادی کو حکومتی جبر سے محفوظ کرتے ہوئے ایک تیز قسم کا سرکاری اور نجی امتیاز تخلیق کرتا ہے۔ لبرل مستعدی کو سرکاری اختیارات کے استبدادی نفاذ کے خلاف متحرک کیا جاتا ہے۔ نجی شعبہ میں دوسروں کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلاف تشدد نہ کرنے اور ان کی املاک پر زبردستی قبضہ نہ کرنے کی وجہ سے افراد اپنی مرضی کے مطابق کچھ بھی کرنے میں آزاد ہوتے ہیں (نجی معاملات میں خاندان کو بھی تحفظ حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ میاں بیوی میں تشدد کو بھی نظر انداز کیا جاتا ہے)۔ یہ سب کچھ وہ ہے جس کا تقاضا آزادی کرتی ہے۔

آزادی کا استعمال ان طریقوں سے بھی ہوسکتا ہے جو دوسروں کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ لیکن ایک طاقت اس وقت توانا ہو جاتی ہے جب لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفادات کا تعاقب کریں اور اپنی بہبود کے لیے اپنی بصیرت پر عمل کریں۔ جب کارپوریشنیں اس طرح طاقتور ہو جاتی ہیں جس طرح حکومت' جب حالات کا رشدت کے ساتھ کسی کی بقا پر اثر انداز ہوتے ہیں تو تجریدی خطرہ ہوتا ہے کہ حکومت شاید اب یک طرفہ طور پر جبر سے کام لے گی لیکن وہ عجلت کے ساتھ پسپائی اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن لبرل ازم نہ صرف افراد کو مقام کار کے ماحول میں تحفظ کے لیے بہت کم بات کرتا ہے (حکومت کا قانونی اختیار صحت اور تحفظ کے بارے میں بہت محدود ہوتا ہے) بلکہ ایسے حفاظتی امور کے خلاف رکاوٹیں کھڑے کرتا ہے کہ نجی شعبہ میں مداخلت کی اجازت نہیں رہتی۔ اسی طرح اگرچہ لبرل ازم اور کیپٹل ازم عدم مساوات کے خلاف طاقتور مزاحمتیں تخلیق کرتے ہیں جس کی بنیاد سماجی حفظ مراتب اور پیدائشی مرتبہ ہوتا ہے لیکن نئی عدم مساوات پیدا ہو جاتی ہے جس کی بنیاد صلاحیت اور دولت کی غیر مساوی تقسیم ہوتی ہے۔ خاندانی یا وراثتی حوالے سے موجود اشرافیہ ٹیلنٹ یا معاشی طبقہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نئی عدم مساوات امیر و غریب کے درمیان ایسے درجہ پر پہنچ جاتی ہے جس کا تصور پرانی عدم مساوات میں نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر یہاں بھی لبرل ازم اصلاح احوال کے لیے حکومتی اقدامات کے راستے میں رکاوٹیں کھڑے کر دیتا ہے چنانچہ وہ نجی شعبہ میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ نجی غلبہ اور دولت کی غیر مساوی تقسیم اور ٹیلنٹ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ دولت اور ٹیلنٹ جس قدر زیادہ ہوں گے دوسروں پہ غلبہ پانے کی صلاحیت اسی قدر زیادہ ہوگی اور جواب میں زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرے گی۔ خاص طور پر غریب' کم استعداد رکھنے والے' کم تعلیم یافتہ یا سماج بدر لبرل ازم میں محروم رہتے ہیں۔ قدیم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشرافیہ کی حکومتوں میں اشرافیہ یعنی ممتاز ترین طبقہ کم از کم ایک سماجی ذمہ داری کی اخلاقیات کے پابند ہوتے تھے لیکن نئی دولت مند اشرافیہ کی اخلاقیات صرف یہ ہے کہ .....اپنے مفادات پر نظر رکھو..... اور اس کے بارے میں انہیں بتایا گیا ہے کہ یہی معاشرے کے لیے بھی بہتر ہے۔ اس کے علاوہ انہیں باور کرایا گیا ہے کہ امیر بننے کے لیے سب کے پاس مساوی مواقع ہیں۔ اگر کوئی ناکام رہتا ہے تو یہ اس کی قسمت ہے۔

آزادی سب کے لیے..... کی بجائے' سب سے نیچے رہنے والوں کے نقطۂ نظر سے لبرل ازم کچھ کو..... جن کے پاس معاشی طاقت ہوتی ہے..... ان پر غلبہ پانے کی آزادی دینا ہے جن کے پاس معاشی طاقت نہیں ہوتی۔ قانون کی سرکاری طاقت غیر معمولی طور پر ان کے اشارے کی منتظر ہوتی ہے جو نئے سلسلہ مراتب کی چوٹی پر ہوتے ہیں۔ وہ انتہائی مہنگے وکلا کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں جو ان کی طرف سے قانونی نظام کو استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ قانون سازوں کو خوش کرنے کے لیے بڑے بڑے عطیات اور چندے فلاحی مہموں کے نام پر دے سکتے ہیں تا کہ وہ ان کے مفادات کو قوانین میں برقرار رکھیں۔ اس طرح سرکاری وسائل ان مراعات یافتہ طبقہ کو تقویت دیتے ہیں جو پہلے سے ہی اعلیٰ ترنجی وسائل سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ لبرل ازم معاشی اشرافیہ کے ذریعے اور ان کے مفادات کے لیے حکمرانی کرتا ہے لیکن اپنی غیر جانبداری کا دعویٰ کرتا ہے۔

جس حد تک غلبے اور عدم مساوات کی ان نئی شکلوں کو لبرل ازم تسلیم کرتا ہے' ان کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ناگزیر ضمنی اثرات بہرحال آزادی اور رسمی مساوات کے ثمرات کے ساتھ ضرور آتے ہیں۔ لبرل عناصر کا کہنا ہے کہ اگرچہ یہ مآل بدقسمتی ہے لیکن اس میں جسمانی اذیت یا موت یا نقل و حرکت کو محدود کرنا وغیرہ شامل ہے جس کی اجازت نجی غلبہ کو نہیں دی جاتی۔ نجی غلبہ کو سرکاری قوت سے ختم کرنے کی بجائے نجی قوتوں کے مقابلہ پہ چھوڑ دینا بہتر ہوتا ہے کیونکہ سرکاری عمال کو قابل اجازت نجی غلبہ کی نوعیت اور حدود متعین کرنے کی اجازت دینے پر سب سے پہلے آزادی متاثر ہوتی ہے۔ معاشی نابرابری کی اصلاح کرنا فطری صلاحیتوں میں کمی بیشی کی موجودگی میں' حکومت کی طرف سے ناقابل برداشت مداخلت کا سلسلہ شروع کر دیتا ہے چنانچہ کام کرنے کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترغیب ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے ثمرات کم ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً معاشی آسودگی معدوم ہو جاتی ہے جو سب کو غریب کر دیتی ہے۔ لبرل ازم کے تحت افراد کو کم از کم یہ مواقع حاصل ہوتے ہیں کہ وہ ایک معاشی طبقہ سے نکل کر دوسرے میں چلے جائیں۔ لیکن جاہ و مرتبہ کا نظام یا پھر کمیونسٹ نظاموں کی جبری مساوات اس کے دروازے ابتدا میں ہی بند کر دیتی ہے۔ لوگ آزاد ہیں کہ وہ امیر ہو جائیں (یا غریب)۔ حالانکہ مسلمہ طور پر امیروں اور ان کی نسل کے لیے بہت آسان ہے کہ وہ امیر رہیں جبکہ غریبوں کے لیے امیر بننا اتنا آسان نہیں ہوتا..... اور آخری بات لبرل عناصر یہ کرتے ہیں کہ فری مارکیٹ کی طرف سے معاشی استعداد کی بدولت مکمل طور پر مادی اصطلاحوں میں سرمایہ دارانہ معاشروں میں غریب اب بھی معاشی' سیاسی نظاموں میں رہنے والے غریبوں سے بہتر ہیں۔ دنیا بھر سے نقل مکانی کر کے قانونی یا غیر قانونی طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پہنچنے والوں کی بیتابی دیکھیں۔ آپ کو نقادوں کے دلائل اپنی موت آپ مرتے نظر آ جائیں گے۔

لبرل ازم کے بارے میں درج ذیل شکایات بہت مانوس ہیں۔ ایک صدی پہلے لکھی گئی سٹوارٹ مل کی اس تحریر میں ان کی عکاسی ہوتی ہے۔

> ''اب غلامی میں نہ ہونے یا قانون کی قوت کے محتاج نہ ہونے کے باوجود لوگوں کی اکثریت غربت کی وجہ سے کسی ایک مقام پہ پابند سلاسل ہے یا ایک پیشہ کی اسیر ہے اور کسی آجر کی مرضی کے تحت اور اپنی پیدائش کے حادثہ کی وجہ سے خوشیوں اور ذہنی اور اخلاقی فوقیتوں دونوں سے محروم ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں دوسروں کو کسی محنت اور کارکردگی کے بغیر محض پیدائشی طور پر میسر ہیں۔ یہ ایک برائی ہے اور کم و بیش ہر اس برائی کے برابر ہے جس کے خلاف بنی نوع انسان آج بھی جدوجہد کر رہی ہے اور غریب یہ سوچنے میں غلط نہیں ہیں۔''

آزادی اور مساوات کے لبرل تصورات' لبرل ازم کی اصلاح کے لیے دباؤ ڈالنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ مساوات ایک غیر مغلوب ابہام رکھتی ہے۔ رسمی مساوات کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطلب ہے سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا۔ بنیادی مساوات کا مطلب ہے کہ لوگوں کے ساتھ ان کی حیثیت کے مطابق مختلف سلوک کیا جائے تاکہ ان کی حیثیت ایک جیسی ہو جائے۔ قدامت پسند بلاشرکت غیرے رسمی مساوات کی بات کرتے ہیں۔ لیکن دونوں طرح کی مساوات بہرحال مساوات کی قابل دفاع تفہیم رکھتی ہیں۔ اگر ایک فرد یا گروپ کسی غیر مساوی مقابلے کی پوزیشن میں سماجی قوتوں کی وجہ سے ہے اور ان کے ساتھ رسمی مساوات کا سلوک کر رہا ہے تو وہ پہلے سے موجود نابرابری کی توثیق کرے گا اور یہ اقدام غیر منصفانہ ہوگا۔ بایاں بازو اس استدلال کو معذور افراد کے لیے ملازمتوں اور تعلیم کے حوالے سے استعمال کرتا ہے تاکہ اس تفاوت کا خاتمہ ہو سکے جو ابتدائی تعلیم کے مواقع میں ہے یا نسلی اور گروہی امتیاز و تعصب کی وجہ سے ہے۔ آزادی میں بھی ایک اسی مشابہت کا ابہام ہے۔ تاہم اصلاح پسندوں نے اسے بہت کم استعمال کیا ہے۔ حق خود اختیاری کو منفی اصطلاحوں میں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کا مطلب ہے حکومت لوگوں کو اکیلا چھوڑ دے تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنی زندگی گزاریں۔ حق خود اختیاری کو مثبت اصطلاح میں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حکومت اس بات کی پابند ہے کہ لوگوں کو بااختیار کرے..... لوگوں کو بااختیار بننے کے لیے درکار ذرائع مہیا کرنے میں اعانت کرے..... تاکہ وہ اپنی آزادی سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔ آزادی کے تصور پر قائم شہری حقوق کو نجی شعبہ میں محدود پابندیاں عائد کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ تاکہ افراد کو دوسروں کی طرف سے ان کے حقوق پامال ہونے سے محفوظ رکھا جا سکے۔ انہیں ملازمتوں اور سرکاری سکونتی علاقوں میں دوسروں کے درمیان نسلی، گروہی، جنسی اور مذہبی بنیادوں پر پیدا کیے جانے والے امتیاز سے محفوظ رکھا جا سکے۔ یہ اقدام البتہ حق وابستگی (انجمن سازی کے حق) کے خلاف ہے جو اجازت دیتا ہے کہ نجی کلبوں میں سے دوسروں کو خارج کر دیں اور حق تقریر (اظہار رائے کی آزادی) کے بھی منافی ہے جو دوسرے گروپوں کے خلاف اظہار نفرت کی اجازت دیتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شہری حقوق کے تحفظ کے حوالے سے ایک انوکھا پن نظر آتا ہے۔ شہری حقوق کی نجی خلاف ورزی روکنے کا قانون کانگریس نے آئین کی کامرس کلاز کے تحت حاصل ہونے والے اختیار کے تحت منظور کیا تھا۔ اس کا جواز

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ صرف اس کا اپنا میرٹ تھا بلکہ ریاستوں کے درمیان تجارت میں امتیازی مداخلتوں کی بنیاد بھی تھا۔ لبرل ازم کے مخالفین نجی غلبہ سے تحفظ اور ناجائز ہتھکنڈوں کی روک تھام کے لیے نیم دلی سے کی گئی کوششوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کوششوں کو مسترد کرتے ہیں جو لبرل تصورات (مثلاً حقوق) کو ایک ایسے نظام کی بقا کے لیے استعمال کرتی ہیں جو بدعنوان ہے اور جسے لازمی طور پر ترک کر دینا چاہیے۔

قانونی حقیقت پسند اور قانون کی معاون سوچ

قانونی حقیقت پسند ہم خیال قانونی نظریات دانوں کے ایک ایسے گروہ کو کہا گیا جو بیسویں صدی کی پہلی تہائی کے دوران منظر پہ ابھرا۔ یہ لوگ کرٹیکل لیگل سٹڈیز موومنٹ کے دانشور پیشرو تھے۔ حقیقت پسندوں کے حملہ کا فوری مقصد اس مزاحمت کو توڑنا تھا جو عدالتیں سوشل ویلفیئر قانون سازی کے خلاف اس بنیاد پر کر رہی تھیں کہ رواجی قانون کے نظریات یا قانونی اصولوں کو نرم کرنے سے آزادی کی خلاف ورزی ہوگی' حقوق ملکیت سلب ہوں گے اور مارکیٹ کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ قانونی حقیقت پسندوں نے منظم انداز میں انیسویں صدی کے قانونی نظریات کے دو مرکزی ستونوں کو نشانہ بنایا۔ قانون کی حکمرانی ان پر ایستادہ تھی۔ تصوری ضابطہ پسندی (Conceptual Formalism) اور قانونی ضابطہ پسندی (Rule Formalism)۔

تصوری ضابطہ پسندی کا عقیدہ تھا کہ قانونی تصورات اور اصولوں مثلاً معاہدوں کی آزادی' جائیداد کی ملکیت' قانون ٹارٹ وغیرہ میں ایک ضروری منشاء تھی اور ایسے مرکب ضابطوں اور تصورات کے اندر تعلقات پر مشتمل تھا جو ایک باہم مربوط اور متحدہ قوانین کا مجموعہ تھا۔ یہ فریضہ جج کا تھا کہ مقدمات سے ابھرنے والے اصولوں کی نشاندہی اور تشکیل کرتا' ان سے قانونی استنباط کرتا اور وضاحت کرتا کہ یہ تصورات اور قوانین کیا ہیں اور کب مطلوب ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تجزیہ مبہم اور تجریدی تھا اور معروضی طور پر متعین تصوری ضرورت کی فضا میں پیش کیا گیا تھا۔ قانونی حقیقت پسند اس کے برعکس دلیل دیتے تھے کہ قانونی تصورات لوچدار اور اثر پذیر ہیں اور ان نظریات اور مفروضوں سے لبریز ہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو ججوں نے پیش کیے یا پھر ججوں کی غیر مسلمہ آرا سے متعین ہوئے۔ اس نکتہ کو جسٹس اولیور وینڈل ہومز کے اختلاف رائے میں نمایاں کیا گیا۔ یہ اختلاف لاکنر بمقابلہ نیویارک مقدمہ کے فیصلہ میں سامنے آیا جس میں سپریم کورٹ نے اس ریاستی قانون سازی کو غیر مؤثر قرار دے دیا جو بیکری والوں پہ کام کے دورانیہ کی پابندی عائد کرتی تھی۔ اس کے مطابق روزانہ دس گھنٹے سے زیادہ اور ہفتہ میں ساٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہ کرنے کی پابندی اس بنیاد پر عائد کر دی گئی تھی کہ اس طرح آجر اور اجیر کی یہ آزادی سلب ہوتی ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے کام کرنے کا دورانیہ کچھ بھی طے کر سکتے ہیں۔ جس حقیقت کو نیویارک سٹیٹ کے قانون سازوں نے تسلیم کیا لیکن سپریم کورٹ نے نہ کیا' یہ تھی کہ کارکنوں کو اپنی ملازمت پہ سودا بازی کرنے کی حقیقی آزادی نہیں تھی۔ ہومز نے واشگاف انداز میں کہا کہ ججز عدم مداخلت (تجارت میں دخل نہ دینے) کا معاشی نظریہ آئین پہ منطبق کر رہے ہیں حالانکہ اس کا آئین سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت پسند کہتے ہیں کہ کسی قانونی نظریہ کا منشاء ایسی چیز نہیں ہے جسے داخلی منطق کے معاملہ کے طور پر لیا جائے بلکہ اس کے برعکس اس کی تعمیر سماجی مقاصد کے فروغ کے لیے سماجی حقیقت پر اس کے اثرات سے آگاہی کے ساتھ ہونی چاہیے۔

قانونی ضابطہ پسندی کا تصور یہ تھا کہ ضابطے ججز نافذ کرتے ہیں اور ایک میکانکی انداز میں اس طرح کہ ہر مقدمہ میں ایک درست جواب کا تعین ہو سکے۔ اس میں نہ ان کا امتیاز شامل ہو اور نہ ان کی اقدار معترض ہوں۔ حقیقت پسند اعتراض کرتے تھے کہ قوانین میں خلا اور تضاد ہے۔ ضابطے ایسے استثنار کھتے ہیں جو متضاد نتائج کی اجازت دیتے ہیں یہ کہ جب ججز کسی سابقہ فیصل شدہ مقدمہ میں درج قانون کی تطبیق کرتے ہیں تو اس وقت گنجائش موجود ہوتی ہے۔ یہ کہ متعدد قوانین وضابطے مبہم ہیں۔ یہ کہ جب ایک عمومی ضابطہ کو کسی مخصوص مقدمہ میں لاگو کرتے ہیں تو ایک سے زیادہ معقول متبادل موجود ہوتے ہیں' مختصر یہ کہ قوانین کی تعبیر عموماً غیر متعین ہوتی ہے۔ محض میکانکی اور جج کی منشا اور ذہنی اپج کے مطابق جو اس کی اپنی اقدار سے متاثر ہوتی ہے۔ اس منشا کی تفسیر ضابطہ پسندی میں مخفی ہوتی ہے۔ حقیقت پسندوں کا کہنا ہے کہ اکثر اوقات جج فیصلہ پہلے کرتے ہیں اور اس فیصلہ کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تائید میں قانونی دلائل ڈھونڈنے کا کام بعد میں کرتے ہیں۔ غیر جانبداری پر زور دیتے ہوئے حقیقت پسندوں کا کہنا تھا کہ اس تمام ترعمل کو کھلا اور شفاف ہونا چاہیے تاکہ ججوں کے فیصلوں کو بھانپا جا سکے۔

حقیقت پسندوں کے دلائل اس مؤقف کو مسترد کرتے تھے کہ اکلوتا قانون مقدمات کا تعین کر سکتا ہے۔ انہوں نے تشکیک کا اظہار کیا کہ قانون کی حکمرانی کے دعوے کھوکھلے ہیں۔ ضابطہ پسندوں نے براہِ راست قانونی تصورات کی تصوراتی ضرورت کو قانون کے تحت ضابطوں کے میکانکی نفاذ سے مربوط کیا۔ انیسویں صدی کا معروف قانون کا مفکر ڈیوڈ لے فیلڈز بیان کرتا ہے:

> ''اگر مقدمہ بازی کے سوالات کے فیصلوں کا انحصار جج کی مرضی یا اس کے اس خیال پر ہو کہ انصاف پر مبنی کیا ہے تو ہماری املاک اور جانیں فیصلہ کے اتار چڑھاؤ کے رحم پر یا متلون مزاجی کی مرہون منت رہیں گی۔ قوانین کے کسی نظام کی موجودگی اور ان سے مطابقت تمام آزاد حکومتوں کے لیے ناگزیر شرط ہے۔ عوامی حکومتوں کے لیے تو یہ شرط بقیہ تمام چیزوں سے برتر ہے۔ قانون ہی ہمارا اکلوتا مقتدر اعلیٰ ہے۔ ہم نے اسے تخت نشین کیا ہے۔''

حقیقت پسندوں کے حملے کے بعد واضح ہو گیا کہ ''قانون کی حکمرانی'' اور ''فرد کی حکمرانی'' کے درمیان فرق اتنا باریک نہیں ہے جتنا سابقہ ناقدین قرار دیتے رہے ہیں۔ ضابطہ پسندی کے مفاہیم کی جگہ حقیقت پسندوں نے ایک معاون نظریہ کی وکالت کی جو قانون کو مطلوبہ سماجی مقاصد حاصل کرنے کا آلہ بناتا ہے۔ اس کے لیے قانون کو کوئی بھی شکل دی جا سکتی ہے۔ قانون کے پہلے سے موجود نظریات میں یہ ایک نمایاں تبدیلی تھی جیسا کہ پہلے ابواب میں نشاندہی کی گئی ہے' مغرب کی تاریخ میں زیادہ تر قانون کو ایک ایسی چیز کے طور پر دیکھا گیا تھا جسے دریافت کیا جاتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ یہ ایک عکس تھا پہلے سے موجود رسوم یا کمیونٹی کی اخلاقیات کا' فطری قانون کے اصولوں کا' قانونی تصورات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اصولوں کی داخلی نوعیت کا یا مارکیٹ اور فطری آزادی کی ضروریات کا۔ قانون کا معاون نظریہ سب سے پہلے جیری بینتھم نے قانونی اصلاحات کے علم کے تحت اٹھارہویں صدی کے آخر میں پیش کیا تھا۔

لبرل ازم کے اندر قانون کا معاون نظریہ بہرحال شدید قسم کی مشکلات پیش کرتا ہے۔ ''سماجی خیر'' پہ اتفاق رائے کی عدم موجودگی میں یہ نشاندہی کرنا پریشان کن ہے کہ قانون کو کون سے مشترکہ سماجی مقاصد کو فروغ دینا چاہیے۔ بینتھم کو اس ضمن میں کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ ایک پُریقین افادیت پسند کے لیے سماجی خیر حاصل کرنا فرد کی مجموعی مسرتوں میں اضافہ کرنے کا معاملہ تھا۔ لیکن افادیت پسندی ایک متنازعہ اخلاقی نظریہ ہے جس کی توثیق ضروری طور پر لبرل ازم نہیں کرتا (حالانکہ اکثر و بیشتر اس سے وابستہ ہوتا ہے)۔ حقیقت پسند بعض اوقات بہت زیادہ رجائیت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سوشل سائنس کو اس قابل ہونا چاہیے۔ سماجی خیر کی نشاندہی کر سکے یا کم از کم یہ بتا سکے کہ اس کا حصول کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی جواب نہیں مل سکا۔ قانون کا معاون نظریہ ایک مشترکہ خیر پہ اتفاق رائے کی عدم موجودگی میں دلالت کرتا ہے کہ قانون مصالحت کا معاملہ ہے یا جمہوری عمل کے اندر گروہی مفادات کا مقابلہ ہے اور ثمرات جیتنے والوں کو ملتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ جب اسے خیر اور شر کے درمیان رزمیہ کے طور پر پیش کیا گیا تو حقیقت پسند پسپائی اختیار کر گئے یا کم از کم خاموش ہو گئے کہ ان کے استدلال پہ زد پڑ رہی تھی۔ حقیقت پسندوں کی طرف سے قانون کے اس عملی اور معاون نظریہ کو فلسفہ نسبتیت (Relativism) نے پس پشت ڈال دیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی لیگل اسٹیبلشمنٹ کے لیے یہ اشد ضروری ہو گیا کہ اس بات کی توثیق کرے کہ قانون محض سیاست نہیں یہ کلیت رکھتا ہے اور اخلاقی اصول کی تجسیم کرتا ہے۔ قانونی حقیقت پسندی اپنی طاقتور شکل میں منظر سے غائب ہو گئی۔ تاہم متعدد نظریات دانوں نے اپنا کام جاری رکھا اور ان کے استدلال کی قوت کو مکمل طور پر دبایا نہ جا سکا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرکزی دھارے کی الجھن

1954ء میں براؤن بنام بورڈ آف ایجوکیشن کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ نے قانونی طور پر نافذ نسلی علیحدگی کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے کالعدم قرار دے دیا۔ اس فیصلہ سے مرکزی دھارے کا قانونی نظریہ آج تک پریشان ہے۔ مساوی تحفظ کی دفعہ وضع کرنے والوں نے اس کے تحت نسلی علیحدگی کو کالعدم نہ قرار دیا تھا کیونکہ ان دنوں یہ عام معمول تھا۔ علیحدگی کی دفعہ کے نفاذ کے فوراً بعد سپریم کورٹ نے پلیسی بنام فرگوسن مقدمہ کے فیصلہ میں اسے برقرار رکھا حالانکہ آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ انجمن سازی کی آزادی کا شور اسی شدت کے ساتھ وہ لوگ مچا سکتے تھے جو علیحدگی چاہتے تھے یا وہ جو یک جہتی چاہتے تھے۔ براؤن مقدمہ کا فیصلہ قابل بحث انداز میں قانونی اصولوں کی پشت پناہی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی تائید استدلالی تفصیل کرتی تھی اور نہ ہی غیر جانبدار اصول۔ اس طرح یہ فیصلہ آسانی کے ساتھ پہلے سے موجود آئینی قانون اور تفہیم کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اخلاقی نقطۂ نظر سے بلاشبہ یہ بالکل درست تھا اور مرکزی دھارے کے بہت سے حامی اس کی تائید کرتے ہیں۔ ترقی پسند وارن کے دیگر فیصلے اسی الجھن کو ابھارتے ہیں کہ اخلاقی طور پر مرکزی دھارے کے حامیوں کے نزدیک درست یہ امور خالصتاً قانونی اصطلاحوں میں جائز قرار دینا ناممکن ہیں۔ یہ فیصلے بظاہر ججوں کے سیاسی نظریات کی پیداوار ہیں لیکن قانون کی حکمرانی کے خلاف ہیں۔ مشتعل نقادوں کے نزدیک یہ قانون کی حکمرانی کے زوال کی ایک اور علامت ہے۔

جسٹس وارن کی طرف سے لائی جانے والی قانونی اصلاحات ایک چیلنج تھا جو مرکزی دھارے کے لبرل لیگل نظریات دانوں کو درپیش ہوا۔ اس کام کے لیے اپنائی جانے والی دو مختلف حکمت عملیوں کا ذکر کیا جائے گا۔ پہلی کا دعویٰ تھا کہ عدالت کے فیصلے حقیقتاً قانون کی حکمرانی سے مطابقت رکھتے ہیں جبکہ دوسری کا دعویٰ تھا کہ عدالت قانون کی حکمرانی میں نرمی لا رہی ہے تاکہ ایک اعلیٰ تر قانون کا نظام تشکیل دیا جا سکے۔

رونالڈ ڈورکن نے 1970ء کے عشرہ کی ابتدا میں بحث چھیڑی تھی کہ جسٹس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وارن کے فیصلوں سے قانون کی حکمرانی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ عدالت کی فعالیت آئین کی نئی تفسیر کر رہی ہے۔ بلکہ قانون کے تصور کی موجود کتابِ ضابطہ درست نہیں تھی۔ قانون محض ضابطوں سے زیادہ کچھ ہوتا ہے۔ یہ جبلی اخلاقی / سیاسی اصولوں پر بھی مشتمل ہوتا ہے جو ضابطوں اور مقدموں کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں یا ان میں مجسم ہوتے ہیں۔ یہ اخلاقی اصول اس وقت بھی موجود ہوتے ہیں جب انہیں ماضی میں بیان یا تسلیم نہیں کیا گیا ہوتا۔ یو ایس لیگل سسٹم نے وسیع تر تناظر میں جائزہ لیا اور اصول و ضوابط کی ایک ایسی ہم آہنگ اور مکمل سکیم بنائی جو کمیونٹی کی اخلاقی زندگی اور بصیرت کی عکاس تھی۔ ڈورکن کے بیان کے مطابق جج اصولوں کے حوالے سے فیصلے کرتے ہیں لیکن پالیسی کے معاملات کا فیصلہ نہیں کرتے اور جو اصول وہ نشان زد کرتے ہیں وہ قانون میں شامل ہوتے ہیں۔ (وسیع تر معنوں میں) چنانچہ قانون ہی حکمرانی کرتا ہے اس لیے جسٹس وارن کے اخلاقی طور پر اصولی فیصلے درست تھے اور قانون کی حکمرانی کے مطابق تھے۔

ڈورکن کے بیان میں دو کلیدی مفروضے پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ درحقیقت کمیونٹی ایک مشترکہ اور ہم آہنگ اخلاقی اور سیاسی اصول رکھتی ہے اور دوسرے یہ کہ ضابطہ کی کتاب کمیونٹی کی ان کوششوں کو پیش کرتی ہے جو اخلاقی حقوق گرفت میں لینے کے لیے کی جاتی ہیں۔ ڈورکن کا بیان ہائیک سے مشابہہ ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا تھا۔ یہ مثالی اصطلاحوں میں قانون پیش کرنے کی طویل روایت میں تازہ ترین اور ایسے ہی ہے جیسے کمیونٹی کی اخلاقیات اور روایات کو پیش کرنا یا اصولوں اور استدلال کی عکاسی کرنا ہے۔ ایک گہری تکثیریت کی حامل سوسائٹی میں ڈورکن کا بیان ایک سوالیہ نشان ہے کیونکہ اس میں بہت سے اخلاقی اصولوں کے مجموعے باہم مقابلے میں ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب قانون کا کوئی معاون نظریہ موجود ہو اور قانون سازی سیاسی مقابلے میں جیتنے والوں کی عکاسی کرتی ہو تو یہ دعویٰ کہ قانون کمیونٹی کے اخلاقی قوانین پیش کرتا ہے یا یہ ایک ہم آہنگ کلیت تشکیل دے گا' شکوک و شبہات سے خالی نہیں ہوگا۔ جب تک وہی گروپ (اکثریت؟ یا اشرافیہ) یا گٹھ جوڑ کرنے والے نظریات اور مفادات رکھنے والے گروہ معمول کے ساتھ قانون سازی کے مقابلہ میں ہوں تو ایک بالاتر ہم آہنگی قانون سازی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ چاہے ڈورکن درست ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی قانونی روایت سیاسی اصولوں کا مشترکہ داخلی مجموعہ رکھتی ہے اور چاہے ایک مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے جو تکثیریت کو سموئے ہوئے ہے' بنیادی مسائل پہ شدید اختلافات اب بھی موجود ہیں (ان کو بعد میں زیر بحث لایا جائے گا) چنانچہ عدالت کے ان موضوعات پر فیصلوں کو قانون کے بارے میں اس کے وسیع تر نقطۂ نظر میں شامل کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے۔

جسٹن وارن کے فیصلوں کو جائز بنانے کی دوسری حکمت عملی ایک مختلف راستہ اپناتی ہے۔ قانونی سماجیات دان فلپ نونیٹ اور فلپ سلزنیک کی تحریر کردہ اور 1978ء میں شائع شدہ کتاب Law and Society in Transition قانون کی حکمرانی کے ہم عصر زوال کی تصدیق کرتی ہے لیکن تاویل پیش کرتی ہے کہ یہ تبدیلی مثبت ہے اور تبدیلی کے تین مرحلوں میں سے گزر رہی ہے۔ یہ سفر استبدادی قانون (مطلق العنانیت' کچھ افراد کا من مانا تسلط دوسروں پر) سے خودمختار قانون (قانون کی حکمرانی) اور اس سے گزر کر ہمدرد قانون (بنیادی انصاف کا عظیم تر اظہار) کی طرف جاری ہے۔ قانون کی حکمرانی کے پاس یہ فضیلت تھی کہ وہ حکومت کے اقدامات کو حدود و قیود میں رکھنے کے لیے پابندیاں عائد کر کے ان کی پیش بینی ممکن بنا سکتی تھی۔ تاہم قوانین کی عمومیت جو حکومت کے اقدامات کی پیش بینی میں اضافہ کرتی ہے وہی اضافی شمولیت اور کمتر شمولیت کے نتائج بھی پیدا کرتی ہے۔ یعنی ایک ضابطہ جو عمومی اصطلاحوں میں بیان کیا گیا ہے کچھ اس طرح کی صورت حالات پر نافذ ہوگا جو اس ضابطے کے پیچھے موجود مقصد پر پوری نہیں اترتی۔ چنانچہ ایسے حالات میں سے کچھ میں ناکام رہتی ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال دیکھیں۔ ڈرائیونگ کے لیے کم سے کم سولہ سال کی عمر طے کرنے کا مقصد ڈرائیوروں کو لوگوں کے ایسے طبقہ تک محدود رکھنا ہے جو جسمانی اور جذباتی طور پر اتنے پختہ کار ہوں کہ ڈرائیونگ کے تقاضے پورے کر سکیں۔ لیکن سولہ سال سے کم عمر بھی کچھ نوجوان ہوتے ہیں جو یہ خوبیاں رکھتے ہیں اور کچھ زیادہ عمر کے ایسے افراد ہوتے ہیں جو ایسی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھیں تو قانون غیر منصفانہ لگتا ہے یا کم از کم اپنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقصد کے خلاف بھی جاتا ہے۔ اس کا مقصد تو ڈرائیونگ کی صلاحیت رکھنے والے فرد کو ڈرائیونگ کی اجازت دینا ہے تو پھر سولہ سال سے کم عمر لیکن صلاحیت رکھنے والے فرد کو اجازت نہ دینا مقصد سے انحراف ہے۔ چنانچہ اگر قانونی ضابطے کے پیچھے مقصد یا انصاف اور دیانتداری کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا جائے تو ایسی صورت احوال بھی پیدا ہوتی ہے کہ قانون کی پیروی نہیں کی جانا چاہیے۔ عمومیت' مساوات اور یقینیت (قانون کی) کسی ایسے سسٹم میں ایک حد تک ختم ہو جائے گی جو صورت حال کے مطابق تعین کرتا ہے۔

جدید امریکی قانون (نمایاں طور پر بشمول وارن کے فیصلے)' نونیٹ اور سیلز نیک کے مطابق ہمدرد قانون کے مرحلے میں جانے میں مصروف ہے اور اس وصف کے ساتھ کہ ان مقاصد اور اصولوں کے حصول پر زور دے رہا ہے جو کسی قانونی اور سماجی نظام کی بنیادوں میں ہوتے ہیں۔ ''اس طرح ہمدرد قانون کے امتیازی خدوخال یہ ہیں کہ وہ ضابطوں اور پالیسیوں میں پائی جانے والی مکمل اقدار کی تلاش کرتا ہے۔'' ہمدرد قانون کی حکومت کے تحت نظام نتائج طلب بن جاتا ہے محض سختی سے ضابطہ پسندی پر کاربند نہیں رہتا۔ نظام میں ضابطہ پرستی کو اہمیت تو حاصل ہوتی ہے لیکن سخت اور غیر لچکدار صورت میں نہیں ہوتی۔ مثلاً اس طرح کہ بعض اوقات یہ مقصد' اصولوں' انصاف اور شفاف پن کو زیر غور لانے سے گریز نہیں کرتی۔

یہ سوچنا غلط ہے کہ ڈورکن یا نونیٹ اور سیلز نیک قانونی نظریات دانوں یا مکاتب فکر کے مرکزی دھارے کے نظریہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مرکزی دھارے کے نقطۂ نظر پر نہ تو ماضی میں کبھی اتفاق رائے تھا اور نہ آئندہ کبھی ہو سکے گا۔ یہ قانون کے متعلق ایک طویل نظریاتی تنازعہ ہے جس کی اب تک کوئی مثال نہیں ملتی۔ ڈورکن اور نونیٹ اور سیلز نیک نے مرکزی دھارے سے جو کچھ لیا وہ اس کھوکھلے استرداد کو چھوڑ دیا کہ سیاسی فیصلے قانونی فیصلوں میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے اور دوسرے یہ پیغام دیا کہ بلاشبہ قانون اب بھی قابل قدر ہے۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ جج حضرات قانونی سمت بندی پہ قائم رہتے ہوئے مقاصد اور انصاف کو پیش نظر رکھنے میں زیادہ واضح ہو چکے ہیں اور یہی وجدان دونوں نظریات میں پایا جاتا ہے۔ ان کے بیانات میں بڑا فرق جو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بصورت دیگر بہت عام ہے' یہ ہے کہ ڈورکن صورت حال کی تاویل اس انداز میں کرتا ہے جو سسٹم کے قانونی کردار میں کوئی کمی نہیں لاتا جبکہ نونیٹ اور سیلز نیک ایک انقلابی پیش رفت کی حیثیت سے کمی کو قبول کرتے ہیں۔

قانون کی حکمرانی کا زوال اور انتہا پسند بایاں بازو

ان واقعات کو مثبت اصطلاحوں میں پیش کرنے کی کوشش کی بجائے انتہا پسند بایاں بازو حملہ آور ہوگیا۔ اپنے نظریاتی مخالفوں سے مرعوب ہوکر رابرٹو انگر نے ڈائسے کے پہلے دو عناصر کو اپنی قانون کی حکمرانی کی تعریف کے طور پر اپنا لیا۔ پہلا یہ کہ قانون کو نفاذ سے پہلے عمومی اصطلاحوں میں واضح ہونا چاہیے اور یہ کہ مقدمات کی سماعت عمومی اور خودمختار قانونی عدالتوں میں ہونی چاہیے۔ انگر بھی ہائیک کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے کہ قانون کو درست طور پر ماڈرن (لبرل) ریاست کی روح کہا گیا ہے۔ وہ ہائیک اور ڈائسے کے استدلال کی گونج میں مزید کہتا ہے کہ سوشل ویلفیئر ریاست' قانون کی حکمرانی کا خاتمہ لا رہی ہے۔

انگر وضاحت کرتا ہے کہ جن مسائل کی نشاندہی انہوں نے کی وہ کس طرح انتظامی سیاق وسباق سے آگے چلے گئے تاکہ قانون کو زہریلا کرسکیں۔ قانون میں دو نہایت اہم تبدیلیاں سوشل ویلفیئر سٹیٹ نے پیدا کیں۔ انگر اس ضمن میں کہتا ہے کہ پہلی تبدیلی یہ ہے کہ ججوں کو تسلسل کے ساتھ کہا گیا کہ وہ وسیع تر نتائج والے معیارات کا اطلاق کریں جن میں شفافیت' حسن نیت' معقولیت اور لاشعوریت ہو۔ دوسرے یہ کہ انہیں اصرار کے ساتھ کہا گیا کہ وہ مقصودی بحث واستدلال میں پڑا کریں تاکہ قانون سازی کے تحت طے شدہ پالیسی اہداف حاصل کرنے والے فیصلے ہوسکیں۔ ایک ایسا عمل جو ججوں کو وسیع تر متبادلات میں ایسے ذرائع منتخب کرنے کا موقعہ دیتا ہے جن میں مختلف قدری مفاہیم پائے جاتے ہیں۔ انگر کے مطابق یہ دونوں تبدیلیاں رسمی ضابطہ پسندی کے روایتی عدالتی کردار سے مطابقت نہیں رکھتی اور عمومیت' مساوات اور یقینیت کی خوبیاں رکھنے والے قوانین کی کسی حکومت کے نصب العین سے الگ ہوجاتی ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وسیع تر مقاصد کی دفعات اور عمومی معیار کی عدالتیں اور انتظامی ایجنسیاں مفادات کے عبوری توازن میں ملوث ہوتی ہیں جو عمومی قوانین میں کمی لانے کی مزاحمت کرتا ہے۔

مقصودی قانونی استدلال اور غیر رسمی انصاف بھی عمومیت کے نصب العین کے لیے مشکل پیدا کرتا ہے۔ پالیسی پہ کاربند قانون دان اصرار کرتا ہے کہ کسی قانون کی تفسیر کا ایک حصہ انتہائی مستعد ذرائع کا انتخاب کرنا ہے جو ایسے مقاصد کے حصول کے لیے تفویض کردہ ہوں۔ لیکن جب وہ حالات جن کے لیے فیصلے درکار ہوتے ہیں تبدیل ہو جائیں اور جب فیصلہ ساز کو میسر ذرائع کی تفہیم مختلف ہو تو پھر وہ طریقہ بھی بدل جانا چاہیے جس کے تحت وہ قوانین کی تفسیر کرتا ہے۔ نتیجہ کا یہ عدم استحکام تسلیم شدہ پالیسی کے اتار چڑھاؤ میں بڑھ جاتا ہے اور اس طرح فرد کے حقوق و فرائض کے مستحکم علاقوں کا تصور جو قانون کی حکمرانی کے تصور سے ناقابل علیحدگی ہے، ختم ہو جائے گا۔

بنیادی انصاف کی جستجو قانونی عمومیت کو زیادہ شدت سے بدعنوان بناتی ہے۔ جب ناقابل اجازت نابرابریاں سماجی حالات میں وسعت اختیار کر جاتی ہیں تو انفرادی سطح پر خصوصی طرز عمل کی ضرورت بھی اس کے مطابق بڑھ جاتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ بنیادی انصاف کس حد تک واضح ہے، اس کا حصول صرف اور صرف مختلف حالات میں مختلف سلوک سے ہی ممکن ہوتا ہے۔

ججوں سے کیے گئے ان تقاضوں نے قانون کی خودمختاری کی شکست و ریخت کے لیے اضافی اثرات مرتب کیے کیونکہ جج فیصلے کرنے کے لیے قانونی ضابطوں اور قانونی استدلال کی قلمرو سے زیادہ سے زیادہ باہر نکل رہے تھے تاکہ سماجی سائنس جیسے علم کے خارجی ذرائع سے استنباط حاصل کر سکیں اور انصاف کے فہم کو صاف صاف سمجھ سکیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''جب مقصودی قانونی استدلال اور بنیادی انصاف کے متعلقات وجود میں آنا شروع ہو گئے تو قانونی گفتگو کا انداز سیاسی یا معاشی بحث میں تبدیل ہو گیا۔ اس طرح کی عدالتی فیصلہ سازی کی قانونی حیثیت کے بارے میں سنجیدہ سوالات ابھر آئے۔ یہ بات سیاسی آزادی کو مجروح کرتی ہے کہ غیر منتخب جج ایسے فیصلے کریں جو مقننہ سے ہونے والے فیصلوں سے مختلف ہوں۔

معاملات کو مزید پیچیدہ کرنے والی حقیقت یہ تھی کہ سوچ میں آنے والی تبدیلی صرف جزوی طور پر حاصل ہوئی۔ مقصودی استدلال سے ملتی جلتی معاون معقولیت قانون کے اطلاق کے ساتھ خلط ملط ہو گئی۔'' ان حالات میں عدالتیں اور ایجنسیاں دو کرداروں میں پھنس گئیں جن کے تقاضے باہم متصادم تھے۔ روایتی ضابطہ پسند جج کا کردار جو دریافت کرتا کہ قانون کے ضابطوں کی درست ترجمانی کیا ہے اور دوسرا کردار مستعدی کے تخمینہ گر کا تھا جو یہ طے کرنا چاہتا تھا کہ کون سا طرز عمل مطلوبہ مقصد کو زیادہ مؤثر طریقے سے پورا کر سکتا ہے۔ نتیجہ ایک ایسا قانونی نظام ہے جو قوانین کی عمومیت اور عبوری فیصلوں کے درمیان ایک غیر مستحکم لرزش رکھتا ہے۔

کمیونٹی کے لیے اشتیاق

لبرل ازم کے خلاف سیاسی نظریہ میں بیک وقت ہونے والی بغاوت سے مطلع ہو کر انتہا پسند بائیں بازو کے نظریات دانوں نے استدلال پیش کیا کہ لبرل ازم ناقابل اصلاح خامیوں سے لبریز ہے اور اس کی وجہ ابتدائی اولین مفروضہ ہے کہ خود مختار افراد ایک قانونی نظام تشکیل دینے کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں تاکہ اپنی بصیرت کے مطابق خیر کے حصول کو آسان بنا سکیں۔ نقاد قانونی مفکرین نے دلائل دیئے کہ ان گنت طریقوں سے سوسائٹی اور قانون کے لیے لبرل سوچ کمیونٹی کے کردار کو سمجھنے میں ناکام رہی ہے۔ لوگ کمیونٹی میں پیدا ہوتے' اس میں نشو ونما پاتے اور ہمیشہ کمیونٹیوں میں اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں۔ وہ اپنی کمیونٹی کی زبان' اخلاقیات' فرائض اور کمیونٹیوں کے خیالات اپناتے ہیں۔ ان کی شناخت ایک ایسا عمل ہوتا ہے کہ کمیونٹی انہیں کس نظر سے دیکھتی ہے۔ دوسروں کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ یک جہتی جس کا اظہار دوستی اور بے غرضی میں ہوتا ہے زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور دوسروں کی محبت کے طلبگار رہتے ہیں۔ افراد سماجی نوع ہوتے ہیں لیکن یہ سب کچھ لبرل ازم کی شدید قسم کی انفرادیت پسندی بھول جاتی ہے۔

ناقدین اعتراض کرتے ہیں کہ لبرل نظام کی قانون کی حکمرانی واضح طور پر انفرادیت پسندی کی اصطلاحوں میں تعمیر ہوئی۔ اس میں اجتماعیت پسندی کی لہریں خود کو تسلیم کرانے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ ناقد نظریہ دان ڈنکن کینیڈی نے دعویٰ کیا کہ اس نے لبرل قانون میں ایک بنیادی تضاد تخلیق کیا ہے۔ یہ تضاد قانون کی سمت بندی اور بنیادی انصاف کے امتزاج میں آشکار ہے۔

> ''میں دعویٰ کرتا ہوں کہ بنیادی مسائل سے نمٹنے کے دو متصادم جذباتی ذریعے ہیں۔ انہیں میں انفرادیت پسندی اور ایثار پسندی کہوں گا۔ ایک رسمی ذریعہ واضح طور پر متعین اور پوری طرح قابل عمل عمومی ضابطوں کے استعمال کی حمایت کرتا ہے جب کہ دوسرا منصفانہ معیارات کے استعمال کی حمایت کرتا ہے جو نسبتاً کمتر فوقیتی قدر کے عبوری فیصلے مہیا کرتے ہیں۔ (یہ) متصادم جذباتی ذرائع جب قانون دان استعمال کرتے ہیں تو زیادہ گہرا تضاد منعکس ہوتا ہے۔ اس گہری سطح پر ہم اپنے آپ میں منقسم ہیں۔ یہ تقسیم انسانیت اور معاشرے کی ناقابل مصالحت بصیرتوں کے درمیان اور اپنے مشترکہ مستقبل کے لیے بنیادی طور پر مختلف آرزوؤں کے درمیان ہے۔''

اس حوالے سے قانون کی حکمرانی محض فریب نہیں تھی۔ چونکہ بہت سے معاملات میں ضابطوں اور معیارات کا مرکب متضاد نتائج برآمد ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ یہ بات ناقابل تصحیح تھی کیونکہ یہ منظم طور پر انفرادی خودمختاری کو کمیونٹی کی یکجہتی کی قیمت پر مراعات یافتہ بناتی ہے۔

بہت سے انتہا پسند بائیں بازو کے نظریات دانوں نے یہ موقف اپنایا کہ اس کا حل کمیونٹی کی قدر بڑھانے میں ہے۔ یہی لبرل ازم میں موجود تضادات کو فرد اور معاشرے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مفادات میں ہم آہنگی پیدا کر کے ختم کر سکتا ہے۔ انگر وضاحت کرتا ہے کہ یہ کس طرح ہوتا ہے۔

''کمیونٹی مشترکہ مقاصد کی اطاعت کے تحت اکٹھی رہتی ہے۔ یہ مشترکہ مقاصد جس قدر زیادہ' مخصوص افراد اور گروہوں کی بجائے انسانوں کی فطرت کو ترجیح دیں گے اسی قدر زیادہ ایک فرد کے لیے اس کی فطرت کے مطابق قابل قبول ہوں گے اور اسی قدر یہ انفرادیت کو ترک کرنے اور توثیق و تسلیم کی طرف بڑھیں گے۔ چنانچہ دوسروں کو مخالف کی بجائے معاون کی نظر سے دیکھنا ممکن ہوگا۔ ان کے مقاصد کے فروغ کا مطلب بذات خود فرد کے مقاصد کا فروغ ہوگا اور انفرادیت اور معاشرت کے تقاضوں کے درمیان تصادم ختم ہو جائے گا۔''

نہ صرف یہ کہ انفرادی خیر اور اجتماعی خیر کے درمیان ان حالات میں کوئی تصادم نہیں ہے کہ قانون کی حکمرانی مشترکہ اقدار رکھنے والی کمیونٹی میں ممتاز و فائق نہیں ہوتی۔ تصادم کے حالات میں غالب سمت بندی' قانون کے تحت اطلاق کی بجائے ایک ایسے نتیجہ پر پہنچتی جو کمیونٹی کے مشترکہ مقاصد کو فروغ دیتا ہے۔ ایک فرد کی مرضی سب کی مرضی سے مطابقت رکھتی ہے چنانچہ ججوں اور سرکاری عمال کا اختیار ایک مسئلہ نہیں رہتا بلکہ ایک مثبت معمول بن جاتا ہے جو عمومی خیر کے فروغ میں ان کی صلاحیتوں میں اضافہ کرتا ہے۔

یہ مثالی بصیرت ماڈرن سوسائٹی کے اس مرکزی معمول کو سمجھنے میں ناکام رہتی ہے جس کو لبرل ازم جاری رہنے کا موقع دیتا ہے اور یہ تکثیریت کی حقیقت ہے۔ اسے کمیونٹی کے افراد کے مفادات اور بہبود میں اہم اشتراک (ڈورکن کے بیان سے بڑھ کر) اور افراد کے مفادات اور بہبود میں ہم آہنگی درکار ہوتی ہے جو ماڈرن سوسائٹی میں مبہم اور مشکوک ہے۔ انگر آگاہ تھا کہ اگر اس کے ویژن کو مؤثر ثابت ہونا ہے تو سوسائٹی میں بنیادی تبدیلی ضروری ہے۔ اگرچہ انفرادیت اور تکثیریت قابل ذکر منفی خدوخال پیدا کرتی ہیں لیکن کئی طرح سے ہم عصر معاشرے کے ارکان کے لیے پرکشش ہیں۔ اگر لبرل ازم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہت زیادہ انفرادیت کی غلطی کرتا ہے تو انگر اس کے برعکس بہت کم غلطی کرتا ہے۔

انگر کا کمال یہ ہے کہ اس نے عظیم تر کمیونٹی کے فروغ میں ہمہ گیر اور گلا گھونٹ دینے والی جبلی قوت کو پہچان لیا تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ اکثر و بیشتر مشترکہ کمیونٹی کی اقدار واقعی ایسی اقدار ہوتی ہیں جو کچھ افراد کے مفادات کو دوسروں کے برعکس زیادہ فروغ دیتی ہیں۔ وہ متنبہ کرتا ہے کہ گروہی ہدف خیال باطل اور خطرناک ہوتا ہے۔

انتہا پسند بایاں باز و لبرل ازم اور قانون کی حکمرانی کی خامیوں پہ متفق ہے اور اس کے کچھ ٹھوس متبادلات پیش کرتا ہے۔ کٹر قسم کے حامی نسواں زور دیتے ہیں کہ قانونی ضابطوں کے متن میں واضح طور پر ان اقدار کو شامل کیا جائے جو آج کل اس میں سے خارج ہیں۔ ان اقدار میں ایثار، شفقت، محبت اور دوسروں کے لیے ذمہ داری شامل ہے۔ قانونی عملیت پسند زور دیتے ہیں کہ قانون کی حکمرانی کی عمومیت میں تبدیلی لا کر اسے زیادہ بنیادی انصاف اور مخصوص پس منظر کے عوامل کو وسیع طور پر زیر غور لانے کی اجازت دی جائے۔ ناقد قانونی نظریات دان زیادہ تر لبرل ازم اور قانون کی حکمرانی پر حملہ آور تو ہوئے ہیں لیکن انہوں نے یہ تجویز نہیں کیا کہ کیا رد و بدل کیا جائے۔

ناقد نظریات دان مرکزی دھارے سے تعلق رکھنے والے مفکرین سے مقابلہ میں ناکام رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مروجہ نظام کے روایتی ناقدین میں سے ہیں اور قانون کے کسی مکتبہ فکر سے تعلق نہیں رکھتے۔ ایک اور زبردست ردعمل نسلی نظریات دانوں کی طرف سے یہ استدلال تھا کہ اقلیتوں کی طرف سے اپنی سماجی حیثیت بنانے کے لیے لڑی جانے والی سماجی اور قانونی لڑائیوں میں لبرل حقوق نے جو خدمات سرانجام دی ہیں انہیں فاقدین سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ ناقد مفکرین یہ بھی سمجھنے میں ناکام رہے کہ انہوں نے جن تضادات اور عدم استقامتوں کی نشاندہی کی ہے کیا ان کو کسی ایسے انداز میں بہتر بنایا جا سکتا ہے کہ سسٹم غالب طور پر قانون کا پابند جب کہ انصاف اور شفاف پن کے لیے زیادہ کشادہ بھی رہے (نونیٹ اور سیلز نیک کے مطابق ایسا ہی ہو رہا ہے) اور انفرادیت کے ساتھ ساتھ کمیونٹی کے فہم کو بھی برقرار رکھ سکے۔ دراصل ان ناقدین کا ہدف پورے نظام کو غیر قانونی ثابت کرنا تھا ناں کہ ایسے راستے تلاش کرنا جن پر چل کر ان کے نشان زد نقائص

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو دور کر کے بہتر انداز میں کام کر سکے۔

عدم تعین اور قانون کی حکمرانی

انتہا پسند بائیں بازو نے قانون کی حکمرانی کے زوال کی نشاندہی کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا۔ اس نے کوشش کی کہ عدم تعین (Indeterminacy) کے تصور پر زور دے کر اس کے زوال میں تیزی لائی جائے۔ یہ تصور سب سے پہلے قانونی حقیقت پسندوں نے پیش کیا تھا۔ قانون کے عدم تعین پر بحث 1980ء اور 1990ء کے عشروں میں عروج پر تھی۔ اس پہ بہت سا لٹریچر سامنے آیا جس میں زبان کے عدم تعین سے لے کر معیارات کے عدم تعین اور قانون کے مخصوص مقامات کے عدم تعین تک بہت سے موضوعات شامل تھے۔ خوش قسمتی سے بہت سی بحث کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ جب ابتدائی مدت کم ہوئی تو فریقین میں عدم تعین کی موجودگی پہ اتفاق رائے ابھر آیا۔ اگر چہ اس کی ٹھیک ٹھیک وسعت اور اس بات پر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا کہ عدم تعین کی یہ کردار نگاری کیسے ہوگی اور کیا اس نے قانون کی حکمرانی کے لیے کوئی خطرہ پیدا کیا ہے؟

عدم تعین کا نظریہ' جو عدالتوں کو مرکز بناتا ہے .... دعویٰ کرتا ہے کہ مقدمات کی ایک بڑی تعداد میں قانون ایک اکلوتا درست جواب مہیا نہیں کرتا یا (مختصر لفظوں میں) میسر قانونی ضابطوں کا مجموعہ ایک سے زیادہ نتائج مرتب ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ بعض اوقات تو متضاد نتائج بھی پیدا کرتا ہے۔ عدم تعین قانون کی اس ناکامی میں پایا جاتا ہے کہ وہ ان مقدمات کے نتائج کا تعین نہیں کر سکتا۔ مذکورہ عدم تعین کی وجہ سے جج کا کیا گیا فیصلہ یقیناً قانونی ضابطوں کی بجائے خارجی یا داخلی اثرات کی پیداوار ہوگا۔ اس عدم تعین کے اشارے ان ضابطوں کی موجودگی میں پائے جاتے ہیں جو مختلف نتائج کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ ضابطوں اور قوانین میں خلا پایا جاتا ہے' قوانین کے لیے استثنا موجود ہے اور پھر قانونی معیارات کا کھوکھلا پن وغیرہ سب کچھ ایسی آسانی کا عکاس ہے جس کے ساتھ ماہر وکلاء ایک ہی مقدمہ میں دونوں طرح کے دلائل وضع کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

ججوں میں قانون پہ عدم اتفاق کی حقیقت کا مظہر اختلاف رائے اور عدالتوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں آنے والے منقسم فیصلے ہیں۔ عدم تعین کا یہ ناقابل تردید ثبوت ہے۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے بھی اس کے آئینہ دار ہیں جن میں فیصلے چار کے مقابلے میں پانچ ووٹوں سے ہوئے ہیں۔ یہ متنازعہ فیصلے سیاسی سوچ کے دائرے میں مقید کیے جاسکتے ہیں۔

قانون کے بارے میں فرض کیا جاتا ہے کہ یہ فیصلے کرتا ہے نہ کہ وہ فرد جو جج کی حیثیت سے کرسی عدالت پہ بیٹھا ہوتا ہے۔ ارسطو نے آدمی کو جذبات اور قانون کو عقل سے وابستہ کیا تھا۔ لاک قانون کے ذریعے حکمرانی کا موازنہ فرد کی حکمرانی سے کرتا ہے چیف جسٹس مارشل نے اس بات کی تردید کی تھی کہ ججوں کی مرضی قانون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی اس نعرے کا نکتہ ہے کہ ''حکمرانی قانون کی' فرد کی نہیں۔'' یہ تمام بیانات اور ان گنت دیگر' ججوں کی طرف سے قانون کے اطلاق کی انہی اصطلاحوں میں توصیف کرتے ہیں۔ جج قانون گوئی کرتا ہے۔ جج قانون کا مجسمہ ہوتا ہے۔ یہ خیال کسی اور کی بالادستی کے محکوم ہونے کا خطرہ ابھارتا ہے لیکن عدم تعین کا نظریہ اس خیال کو تحلیل کرتا ہے کہ باوقار سیاہ چوغہ اہم ہے اس میں ملبوس فرد نہیں۔ یہ استدلال ہوپز کے فیصلہ کا تازہ ترین اعادہ ہے کہ قوانین کی تفسیر و اطلاق میں حتمی حکم انسانوں کو حاصل ہے۔

عدم تعین کے تصور کے مخالفوں کی طرف سے پیش کیا جانے والا بڑا جواب قانون میں پیشین گوئی کی بھرپور صلاحیت کی نشاندہی تھا۔ بہت سے ایسے آسان مقدمات ہیں جن میں وکلاء بڑے اعتماد سے متوقع نتیجہ کے بارے میں جانتے ہیں۔ ایسے مقدمات میں ججوں کے درمیان بہت معمولی یا کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اس طرح کے مقدمات معمول میں کسی طویل عدالتی کارروائی کے بغیر فیصل ہو جاتے ہیں۔ جو مقدمات اس طرح فیصل نہیں ہوتے وہ اکثر اوقات ٹھوس ثبوت میں خامی یا خلاء کا نتیجہ ہوتے ہیں' قانون میں غیر یقینیت کی وجہ سے نہیں۔ بے قابو عدم تعین کے دعوے مبالغہ آرائی تھے کیونکہ ناقد نظریات دان اپیلینٹ کیسوں اور قانون کے پروفیسروں کی معمول کی نکتہ چینی پر زور دیتے تھے جو بلاشبہ عدم اتفاق کی بڑی مقدار ظاہر کرتی ہے لیکن یہ مجموعی طور پر مقدمات کی ایک معمولی مقدار ہے جسے گمراہ کرنے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

ناقد قانونی مفکرین متفق ہیں کہ مقدمات کی اکثریت میں پیشین گوئی کی جاسکتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے لیکن وہ مزید تین نکات اٹھاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ آسان مقدمات کی ایک بڑی تعداد یقیناً صرف اور صرف قانونی ضابطوں کی بجائے دیگر اثرات کے تحت فیصل ہوتی ہے۔ ان میں اشرافیہ کا سماجی اقتصادی پس منظر، سفید فام اور مرد جج جیسے عوامل بھی شامل ہیں۔ دوسرا یہ کہ مقدمات کی ایک معقول تعداد (اگرچہ اکثریت نہیں) آسان مقدمات پر مشتمل نہیں ہوتی۔ ان کے بارے میں پیشین گوئی کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان کے لیے ججوں کو ایسے فیصلوں تک پہنچنا ہوتا ہے جو قانونی ضابطوں کے دباؤ کی بجائے متبادل نتائج کے پیش نظر کیے جائیں۔ تیسرا یہ کہ بعض اوقات ابتدا میں صورتحال آسان مقدمہ کی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ پریشان کن نوعیت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ بتدیلی وکلاء کی ترغیب اور مہارت پیدا کرتی ہے یا خود جج کی خواہش کہ وہ کوئی مختلف نتائج کا حامل فیصلہ کرے۔ مزید برآں ناقد قانونی نظریات دان اشارہ کرتے ہیں کہ مشکل مقدمات سخت قسم کے متصادم سماجی مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں جو ان کے خدوخال پیچیدہ بنا دیتے ہیں حالانکہ وہ پیشین گوئی کے قابل مقدمات کے برعکس کم سامنے آنے والے مقدمات ہوتے ہیں۔

عدم تعین کے مخالفین کے پاس ناقد نظریات دانوں کے دوسرے اور تیسرے استدلال کا فوری جواب تیار تھا۔ انہوں نے نشاندہی کی کہ تمام قانونی نظاموں میں عدم تعین کا ایک ناگزیر درجہ پایا جاتا ہے۔ زبان کے کھلے پن کی وجہ سے قوانین کی عمومیت اور یہ حقیقت اس کا ثبوت ہے کہ ہر صورت حال کو پہلے سے متعین نہیں کیا جا سکتا یا اس کی پیشین گوئی نہیں ہو سکتی۔ ایک قانونی ضابطہ دیکھیں ''کسی گاڑی کو پارک میں لانے کی اجازت نہیں۔'' ظاہر ہے اس قانونی پابندی کے تحت آٹو موبائیل کو پارک میں نہیں لے جایا جا سکتا لیکن بائیسکل اور سکیٹ بورڈز اس پابندی سے مستثنیٰ رہیں گے۔ چلئے ایک اور وضاحت کے ساتھ بنایا ہوا قانون نافذ کیا جا سکتا ہے کہ ''اس پارک میں موٹر سے چلنے والی گاڑیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔'' یوں وضاحت ہو جائے گی کہ بائیسکل اور سکیٹ بورڈز لانے کی اجازت ہے لیکن اب موٹر والی وہیل چیئرز کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ یا پھر بیٹری سے چلنے والی کھلونا کار کے بارے میں یہ قانونی ضابطہ کیا کرے گا؟ اور اگر پارک میں یادگار کے طور پر کوئی پرانا ٹینک رکھا ہوگا تو اس کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟ اور اگر پارک میں سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی زخمی فرد کو لے جانے کے لیے ایمبولینس آئے گی تو اس کے داخلہ کا فیصلہ کس طرح ہو گا؟ اگر چہ اس قانون کا اطلاق معمول کے امور میں تو ہوتا رہے گا لیکن یہ قانونی ضابطہ ہر واضح اور غیر مبہم صورت حال کا جواب پیش نہیں کرے گا۔ زبان اور قانون کی ناگزیر کھلی ساخت کے باوجود تجربہ عملی طور پر ظاہر کرتا ہے کہ لوگوں کو ابلاغ صاف اور سادہ زبان سے ہوتا ہے اور وہ معمول کے مطابق قوانین کو سمجھتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ قوانین کام کرتے ہیں۔ وہ باقاعدگی سے وابستہ ہو جاتے اور راہنمائی کرتے ہیں۔ جب کسی صورت حال میں (قانون کے اطلاق کے وقت) ابہام اور تشکیک موجود ہو تو پھر اسے عقلی تجزیہ کے ساتھ دور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عدم تعین کی صورتیں اگر موجود ہوں تو ضروری نہیں ہے کہ انہیں کسی قانونی نظام میں معینات سے ناگزیر طور پر شکست دی جا سکے۔ عدم تعین کا الزام اس صورت میں کامیابی کے ساتھ عائد نہیں کیا جا سکتا اگر دلائل کسی تحریری سطح پر رہیں۔ اسے ٹھوس بنانے کے لیے یہ دکھانا ضروری ہے کہ موجودہ قانونی ضابطے بہت سے تضادات پیدا کر چکے ہیں جن کی نشاندہی ناقد نظریات دانوں نے نہیں کی۔

قانونی قطعیت کا دفاع کرنے والوں کا ایک متعلقہ جواب یہ تھا کہ ناقد مفکرین اس سے بڑی رکاوٹ کھڑی کر رہے ہیں جس کا تقاضا قانون کی حکمرانی کرتی ہے۔ اگر چہ قانونی ضابطے بعض اوقات ایک سے زیادہ نتائج کی اجازت دیتے ہیں لیکن ان نتائج کو قانونی اعانت کی طاقت شمار کیا جاتا ہے۔ چاہے یہ جبری یا مکمل طور پر درست نہ ہو۔ ایک طاقتور رائے پر مبنی فیصلہ بہر حال قانون کے مطابق یا اس کی راہنمائی میں طے ہو گا۔

اور آخر میں تیسرے نکتہ کے جواب میں دفاع کرنے والوں نے تسلیم کیا کہ کسی بدنیت جج کو ضابطوں کے عیارانہ استعمال کر کے مرضی کا فیصلہ کرنے سے روکنا ناممکن ہے۔ قانون کے تمام نظام ججوں پر انحصار کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ وہ دیانتداری کا مظاہرہ کریں گے اور زبان اور قانونی ضابطوں میں چھپے عدم تعین سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ جج کو قانون سے وفاداری کا پابند ہونا چاہیے اور اس کی بنیادی سمت بندی قانونی ضابطوں کے درست ترین مفاہیم کی تلاش ہونا چاہیے۔ اگر عدلیہ میں بدعنوانی یا نالائقی نہ ہو تو برے ججوں کو روکا جا سکتا ہے (اگر چہ ہر مقدمہ میں نہیں)۔ یہ رکاوٹ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے ججوں کی موجودگی پیدا کر سکتی ہے مگر ججوں کو اسی پینل میں بٹھایا جا سکتا ہے یا اپیل کے لیے اعلیٰ تر سطح کے جج نظر ثانی کر سکتے ہیں۔

زیادہ تر ناقد مفکرین نے ان جوابات کا سختی سے مقابلہ نہ کیا چنانچہ عدم تعین کے نظریہ کی بحث محدود ہو کر قانون میں پیشین گوئی کی صلاحیت کے تسلیم شدہ بنیادی درجہ کے ذرائع تک آ گئی۔ ناقد مفکرین نے پیشین گوئی کے قابل ہونے کی صلاحیت کے ذریعہ کو قانون سے الگ عوامل سے منسوب کیا۔ بالخصوص امریکہ میں ججوں کے مشترکہ سماجی' اقتصادی پس منظر سے منسوب کیا (بالائی متوسط طبقہ یا اشرافیہ کے سفید فام مرد)۔ ناقد مفکرین نے لیگل کلچر میں غیر نظریت پسندی کو پیشین گوئی کے قابل ہونے کی صلاحیت کے طور پر پیش کیا۔

> ''لیگل کلچر جو ججوں اور نظریات دانوں سے تشکیل پاتا ہے باضابطہ ادارہ جاتی کردار کے مشترکہ مفاہیم اور اس حد کا احاطہ کرتا ہے جس حد تک موجودہ حالت کو برقرار رکھا یا تبدیل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کلچر میں ''عقل سلیم'' شامل ہوتی ہے جو سمجھاتی ہے کہ قوانین کیا ہیں؟ رسم و رواج (قوانین اور استثنا کی نشاندہی) کیا ہے؟ اور سیاست (لبرل اور قدامت پسند ججوں کے درمیان فرق) کے کیا معنی ہیں؟''

قانون میں پیشین گوئی کی یہ روایتی توضیح ہے۔ عدم تعین کے نظریہ کے بہت سے مخالفین قانون میں پیشین گوئی کے قابل ہونے کی صلاحیت کی روایتی تشریح پہ متفق ہیں۔ اس مفہوم میں تمام تر معانی روایتی ہیں۔ یہ نہ صرف درست ترین ہے بلکہ ناگزیر ہے کہ غیر نظریت پسندی کسی مشترکہ قانونی روایت میں ضروری ہوتی ہے۔ قانون کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے ایک مشترکہ زبان' کلچر اور اعتقادات کے ایک مجموعے کے ساتھ تفسیری کمیونٹی تشکیل دیتے ہیں جو قوانین کے اطلاق اور تفسیر کو مستحکم بناتے ہیں۔ جب غیر متعین قوانین کو تجریدی حالت میں دیکھا جاتا ہے تو اطلاق کے سیاق و سباق میں ارادہ متعین ہوتا ہے کیونکہ مشترکہ رسم و رواج کی قانونی روایت میں (ادارہ جاتی پابندیوں کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پشت پناہی کے ساتھ جیسے نظر ثانی کا عمل) بہت سی تشریحات کو نا قابل قبول قرار دے کر مسترد کر دیتا ہے۔ قانونی ضابطے دیکھے نہیں جا سکتے' کم از کم عمومی ظاہری معقولیت کی حدود میں' ان طریقوں سے نہیں دیکھے جا سکتے جن کی اجازت اردگرد کے رسم و رواج میں نہیں ہوتی۔'' ناگوار گزرنے والی آراء تحریر نہیں کی جائیں گی۔'' یہ وضاحت اس چیز کو وسعت دیتی ہے جو اس کی نظر میں ان ضابطوں سے آگے'' قانون'' کا ایک حصہ بنتی ہے جن کو لیگل کلچر اور روایت کی کلیت میں شامل کیا جاتا ہے۔

آسان مقدمات کے پھیلاؤ کے لیے اس تشریح کا مقابلہ لازمی طور پر ان متبادل تشریحات سے کرنا چاہیے کہ ججوں کے فیصلوں کے بارے میں پیشین گوئی اس حقیقت کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک ممتاز پس منظر رکھتے ہیں اور یہ بات انہیں قانون کی تفسیر اور اطلاق انہی طریقوں سے کرنے پر مائل کرتی ہے جو اشرافیہ کے غلبہ کے مفاد میں ہو۔ قانونی قطعیت کا یہ ذریعہ قابل قبول نہیں ہوگا کیونکہ اس طرح اہمیت بذات خود قانونی روایت کو نہیں بلکہ ججوں کے مخصوص سماجی پس منظر کو حاصل ہوگی۔ ایک اور حل طلب سوال یہ موجود ہے کہ کیا قانونی روایت زیادہ وسیع طور پر بذات خود اشرافیہ کے مفادات سے سماجی طور پر متاثر رہتی ہے۔

ایک یا دو نسلیں پہلے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لاء سکولوں نے ماضی کے خارج کردہ گروپوں کے لیے نشستیں مختص کیں اور اسی طرح کا اقدام اب عدلیہ میں کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس صورت حال کے ساتھ یہ اعتراف کہ مقدمات کی ایک بڑی تعداد کے فیصلوں کے بارے میں پیشین گوئی کی جا سکتی ہے اور یہ کہ قانونی روایت اس یکسانیت کا ایک بڑا سبب ہے' عدم تعین کا نظریہ اپنا زور شور کھو چکا ہے۔ حتمی رائے سے بہت دور علمی مطالعات نشاندہی کرتے ہیں کہ سپریم کورٹ سے نیچے کی عدالتوں میں عدم تعین بہت کم ہوتا ہے۔ یہ صورت حال تشریحی عدم اتفاق کے پیمانے سے ہے اور ناقد مفکرین کے دعووں کے برعکس بہت کم ہے۔ قانون کے نظریاتی حلقوں میں عدم تعین کے نظریہ پر آج کل بحث نہ ہونے کے برابر ہے۔

عدم تعین کا نظریہ ضروری طور پر قانون کی حکمرانی کے ایک مرکزی پہلو کے لیے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خطرہ نہیں ہے۔ یاد رہے کہ پیشین گوئی کے قابل ہونے کی صلاحیت ہائیک کے نزدیک وہ کلیدی طریقہ ہے جس کے ذریعے قانون کی حکمرانی آزادی کو محفوظ بناتی ہے۔ یہ لوگوں کو اجازت دیتی ہے کہ ایسے اقدامات کی منصوبہ بندی کریں اور اس پر عمل کریں جو انہیں قانون کے جبر کا محکوم بنائیں۔ یہی قانونی آزادی ہے۔ ایک غیر معین اور نا قابل پیشین گوئی قانونی نظام اس حوالے سے ناکام ہو جاتا ہے۔ ایک غیر معین قانونی نظام جو بلاشبہ قابل پیشین گوئی ہو، پیشین گوئی کی صلاحیت کا ذریعہ کوئی بھی ہو.... قانونی آزادی کا تحفظ برقرار رکھتا ہے۔

قانون کے نظریات دانوں کے درمیان عدم تعین کے موضوع پر ہونے والی بحث کی ناکامی کا مطلب یہ نہیں لیا جانا چاہیے کہ اس نے کسی ایسی بات کے لیے اضطراب پھیلایا جو کچھ بھی نہیں تھی۔ نہیں بلکہ اس کے برعکس اس نے تصدیق کی کہ عدم تعین قانون میں ہمیشہ سے موجود رہنے والی امکانی قوت ہے۔ اس نے یہ بھی تصدیق کی کہ عدم تعین کے امکان کے لیے کسی نظام قانون میں پیشین گوئی کئے جانے کی صلاحیت تباہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا انتہائی اہم سبق یہ تھا کہ اگر جج کسی ایسے بنچ میں بیٹھے ہیں جو ذاتی یا سیاسی مقاصد کی حمایت میں قانون کے مخفی عدم تعین سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی پستی رکھتا ہے تو پھر قانون بے یار و مددگار ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

7

رسمی نظریات

تاریخی اور سیاسی سیاق وسباق کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ آج کل زیر گردش قانون کی حکمرانی کی متبادل نظریاتی تشکیل کو موضوع بنائیں۔ مقابلہ آرا تشکیلات کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن انہیں دو بنیادی زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ انہیں نظریات دان ''رسمی'' صورتیں اور ''اثباتی'' صورتیں کہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک تین مختلف شکلوں میں ابھرتی ہیں۔

قانون کی حکمرانی کی متبادل تشکیلات

کمزور	سے	طاقتور
رسمی صورتیں : 1- قانون کے ذریعے حکمرانی (حکومتی اقدامات کے لیے قانون بطور آلہ)	2- رسمی ضابطہ پسندی (+عمومی ' مؤثر بہ مستقبل' شفاف' یقینی)	3- جمہوریت + ضابطہ پسندی (قانون کے مندرجات متعین کرتی ہے۔)
اثباتی صورتیں = 4- شخصی حقوق (معاہدہ' املاک' نجی امور' خودمختاری)	5- منصب و مرتبہ اور/ یا انصاف کا حق	6- سوشل ویلفیئر (اثباتی مساوات' بہبود' کمیونٹی کی بقا)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ متبادل نظریاتی تشکیلات ایک تدریج میں بیان کی جائیں گی جو قانون کی حکمرانی کی کمزور و ناتواں صورت سے طاقتور صورت تک پائی جاتی ہیں۔ اس سے میری مراد ایسی تشکیلات ہیں جن کے تقاضے بتدریج بڑھتے چلے گئے ہیں۔ عمومی انداز میں بات کی جائے تو ہر شکل پچھلی شکل کے بنیادی خدوخال رکھتے ہوئے ارتقا کی جانب سفر کرتی ہے۔

قانون کے نظریہ میں یہ معیار مقرر ہے کہ قانون کی حکمرانی کے تصورات کو الگ کرتے ہوئے انہیں رسمی اور اثباتی شاخوں میں تقسیم کیا جائے۔ موازنے کا یہ درج ذیل بیان ہمارے سفر میں بنیادی رہنما کا کردار ادا کرے گا۔

''قانون کی حکمرانی کے رسمی تصورات اس انداز کی پڑتال کرتے ہیں جس میں قانون کا نفاذ ہوا تھا۔ (کیا یہ کسی جائز بااختیار فرد نے نافذ کیا تھا)۔ نتیجتاً ظاہر ہونے والے اصول کی وضاحت کرتے ہیں (کیا یہ واضح طور پر کسی فرد کو اپنے طرز عمل کے لیے رہنمائی کرتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کے لیے منصوبہ بندی کے قابل ہو سکے)۔ اور وضع کردہ اصول کی چوٹی کی جہت کیا ہے (کیا یہ مؤثر بہ مستقبل ہے)۔ قانون کی حکمرانی کے رسمی تصورات البتہ ایسے فیصلہ کے متلاشی نہیں ہوتے جو بذات خود قانون کی حقیقی تسکین پر استوار ہو۔ انہیں اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ آیا قانون اس مفہوم میں ایک اچھا قانون تھا یا برا۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کیا قانون کی حکمرانی کے رسمی تقاضے بذات خود پورے ہوئے تھے؟ جو لوگ قانون کی حکمرانی کے اثباتی تصورات کو اپناتے ہیں وہ اس سے آگے جانے کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ قانون کی حکمرانی میں وہ رسمی خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن وہ اس نظریہ کو مزید آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ متعدد اثباتی حقوق مبینہ طور پر قانون کی حکمرانی پہ مبنی ہیں یا اس سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس تصور کو ان حقوق کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جو اس وقت ''اچھے'' قوانین (ان حقوق سے مطابقت رکھنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والے) اور ''برے'' قوانین (ان حقوق سے محروم کرنے والے) میں امتیاز کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔''

چنانچہ بنیادی امتیاز کو اس طرح مختصر کیا جا سکتا ہے۔ رسمی نظریات ضابطہ پسندی کی درست شکل اور ذرائع پر توجہ مرکوز کرتے ہیں جبکہ اثباتی نظریات قانون کی تسکین کے تقاضوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ (عام طور پر اسے انصاف یا اخلاقی اصول کے موافق ہونا چاہیے)۔ چونکہ امتیاز معلوماتی ہوتا ہے چنانچہ اسے اتنا سخت نہیں ہونا چاہیے کیونکہ رسمی صورتیں اثباتی نتائج رکھتی ہیں اور اثباتی صورتیں رسمی تقاضوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان اسباب کی بنا پر جن کی وضاحت ابھی کی جائے گی' اینگلو امریکن قانون کے نظریات دانوں نے دوسری رسمی صورت اپنائی ہے۔ میں اسے رسمی ضابطہ پسندی کا نام دیتا ہوں۔ یہ باب رسمی نظریات کا احاطہ کرے گا جبکہ اگلے باب میں اثباتی یا مستقل بالذات تصورات کو موضوع بنایا جائے گا۔

قانون کے ذریعے حکومت

قانون کی حکمرانی کی دبلی پتلی یا کمزور ترین صورت یہ تصور ہے کہ قانون وہ ذریعہ ہے جس سے حکومت اپنے امور سرانجام دیتی ہے۔ کوئی حکومت جو کچھ کرتی ہے اسے قوانین کے ذریعے ہونا چاہیے۔ اس صورت کا ایک اور موزوں نام ''قانون کے ذریعے حکمرانی'' ہے۔ حکمرانی کی ایک انتہائی صورت کہتی ہے کہ..... مقتدر اعلیٰ کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ..... کیونکہ وہ مقتدر اعلیٰ کی زبان سے نکلا ہے' قانون ہے' اس انداز میں قانون کی حکمرانی ظاہر ہے کوئی حقیقی معنی نہیں رکھتی۔ کیونکہ یہ حکومت کی حکمرانی کے تصور میں منہدم ہو جاتی ہے۔ ''یہ کہا گیا ہے کہ قانون کی حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کے تمام اقدامات قانون کے اختیار کے تحت ہونے چاہئیں۔ اگر حکومت' تعریف کے اعتبار سے قانون کے اختیار کے تحت ہے تو قانون کی حکمرانی محض معنوی تکرار لگتی ہے کوئی سیاسی نصب العین نہیں رکھتی۔ ہرماڈرن ریاست قانون کی حکمرانی کا یہ تنگ مفہوم رکھتی ہے۔

بلاشبہ قانون کی حکمرانی کے تصور کا ایک پہلو یہ ہے کہ حکومت قانون کے ذریعے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کام کرتی ہے اور یہ جرمن قانونی ریاست Rechtsstaat کے جزوی معنی ہیں لیکن کوئی مغربی قانون کا نظریات دان قانون کی حکمرانی کو قانون کے ذریعے حکومت کی اصطلاحوں میں تسلیم نہیں کرتا۔ قانون کے ذریعے حکمرانی حکومت پر قانونی پابندیوں کا تھکا ماندہ مخفی مفہوم رکھتی ہے جو قانون کی حکمرانی کی روایت کی ناگزیر شرط ہے۔ یقیناً کچھ ہم عصر حکومتیں بظاہر اسی مفہوم کو اپنائے ہوئے ہیں۔ چین کے قانون کے مفکرین نے دعویٰ کیا ہے کہ چینی حکومت کی قانون کی حکمرانی کے لیے یہ ترجیحی تفہیم ہے۔ حالانکہ قانون کی حکمرانی کا یہ علم صرف اکلوتے چین ہی نے نہیں اُٹھایا ہوا۔'' کچھ ایشیائی سیاست دان باضابطہ اور مستعدی سے قانون کا اطلاق چاہتے ہیں لیکن وہ حکومت کو اس کی ماتحتی میں دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ان کے نقطۂ نظر میں قانون اس لیے نہیں پایا جاتا کہ ریاست کو پابند کرے بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ ریاست کی طاقت کی خدمت کرے۔

رسمی ضابطہ پسندی کا کھوکھلا پن

ممکن ہے کسی کو قانون کے ذریعے حکمرانی کی گوشمالی کرنے کے لیے اسے قانون کی حکمرانی کی مسخ شدہ آمرانہ شکل قرار دینا اچھا لگے لیکن اسی تصور کی رسمی ضابطہ پسندی کو ہائیک نے اپنایا اور یہ سفاک مطلق العنان حکومتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ جوزف راز ایک ممتاز ہم عصر مفکر نے اس نکتہ پر بہت زور دیا ہے۔

> ''ایک غیر جمہوری نظام جس کی بنیاد انسانی حقوق کی نفی، بہت زیادہ غربت، نسلی امتیاز، جنسی عدم مساوات اور نسلی جبر واستبداد ہو، ممکن ہے اصولاً قانون کی حکمرانی کے تقاضوں سے مطابقت رکھتا ہو جو زیادہ روشن خیال مغربی جمہوریتوں کے نظام ہائے قانون سے بہتر ہیں۔ یہ ایک ناقابل تصور حد تک برا نظام قانون ہوگا لیکن ایک حوالے سے بہت عمدہ ہوگا کہ یہ قانون کی حکمرانی رکھتا ہے..... چاہے قانون کی حکمرانی کی خلاف ورزی کیے بغیر ممکن ہے یہ قانون غلامی رائج کرتا ہو۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ دعوے ان لوگوں کے لیے پریشان کن ہوں گے جو قانون کی حکمرانی کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ان دنوں بھی قانون کی حکمرانی سے وابستہ تھا جب وہاں غلامی قانونی طور پر رائج تھی اور نسلی امتیاز قانونی طور پر نافذ تھا۔ جو چیز قانون کی حکمرانی کے اس انداز کو شر سے ہم آہنگ کرتی ہے وہ کسی خیر کے الگ معیار یا قانون کی تسکین کے حوالے سے انصاف کی عدم موجودگی ہے۔

راز' ہائیک کی تقلید کرتا ہے جب وہ قانون کی حکمرانی کے نیچے موجود بنیادی وجدان کی نشاندہی کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ قانون کو اپنے محکوموں کے طرز عمل کی رہنمائی کے قابل ہونا چاہیے۔'' وہ قانون کی حکمرانی کے عناصر اسی تصور سے اخذ کرتا ہے۔ راز کے مطابق یہ عناصر چاہتے ہیں کہ قانون مؤثر بہ مستقبل' عمومی' عوامی' شفاف اور نسبتاً مستحکم ہو۔ اس فہرست میں راز ایسے اور بہت سے میکنزم شامل کرتا ہے جو اس کے نزدیک قانون کی حکمرانی کی اس قسم کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً آزاد عدلیہ' کسی جانبداری کے بغیر کھلی اور شفاف سماعت مقننہ اور انتظامیہ کے عمال پر نظر اور قانون کی حکمرانی کے تقاضوں سے ہم آہنگی یقینی بنانے کے لیے پولیس کی صوابدید کو حدود و قیود میں لانا۔ تقاضوں کا پہلا مجموعہ جو ہائیک اور انگر کے ہاں بھی پایا جاتا ہے' قانون کی حکمرانی کی غالب رسمی شکل کے لیے ایک معیار ہے۔ قانون کے ایک ممتاز نظریہ دان لون فلر نے ایک نسل پہلے قانون کی حکمرانی کی ایک انتہائی مؤثر شکل پیش کی تھی۔ اسے انہی اصطلاحوں میں اس نے ضابطہ پسندی کا نام دیا تھا جس کے تقاضے' عمومیت' صراحت' عوامی اجرا' وقت کے ساتھ استحکام' ضابطوں اور قانون کے حقیقی کرداروں کے طرز عمل کے درمیان موافقت و ہم آہنگی' مؤثر بہ ماضی کی مخالفت' تضادات اور ناممکن تقاضوں پر پابندیاں شامل ہیں۔

راز' فلر' ہائیک' انگر اور وہ تمام لوگ جنہوں نے یہ تصور اپنایا' اس بات پر متفق ہیں کہ قانون کی حکمرانی فرد کی خودمختاری اور وقار میں اضافہ اسے یہ اجازت دے کر کرتی ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی قانونی نتائج سے قبل از وقت آگاہ ہو کر کرتا ہے۔ قانون کے تحت آزادی کا یہی تصور مونٹیسکیو کے ہاں پایا جاتا ہے..... وہ سب کچھ کرنے کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزادی جس کی اجازت قانون دیتا ہے..... قانون کی آزادی۔ ''لیکن یہ حکومت کی طرف سے مداخلت کی کوئی رکاوٹ پیش نہیں کرتا اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔'' یہ اس بارے میں خاموش ہے کہ قانون کس طرح بنایا جائے گا۔ استبدادی جمہوری اکثریت کے ذریعے یا کسی اور ذریعے سے۔ یہ بنیادی حقوق کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہتا۔ مساوات یا انصاف کے بارے میں بھی خاموش ہے۔ یہ صرف طریقۂ کار کے تقاضے نافذ کرتا ہے۔ صرف ان پابندیوں کی بات کرتا ہے جو قانون کی صورت میں ہونا چاہئیں۔

یہ حقیقت کہ قانون کی حکمرانی کی یہ شکل ایسی کسی تسکین کے تقاضے نہیں رکھتی۔ مقاصد کے ایک وسیع سلسلے کو جنم دیتی ہے۔ فلر کا دعویٰ ہے کہ رسمی ضابطہ پسندی قانون کے مستقل مقاصد کے لیے غیر جانبدار ہے اور ایک جیسی مستعدی کے ساتھ اسطرح کے مقاصد کے ایک تنوع کی خدمت کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ نظریات دانوں نے اس غیر جانبداری کو اثباتی صورت پر رسمی صورت کو ترجیح دینے کی وجہ قرار دیا ہے۔ ایک نسبتاً رسمی نظریہ بذات خود کم وبیش سیاسی طور پر غیر جانبدار ہوتا ہے اور چونکہ یہ اس طرح محدود ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنی شرائط پر سیاست کے دائیں اور بائیں بازو کے علاوہ مرکزی دھارے کی حمایت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس اثباتی صورت نہ صرف رسمی انداز میں متصورہ قانون کی حکمرانی کو خود میں شامل کرتی ہے بلکہ بہت سے متنازعہ مستقل اجزا شامل کر لیتی ہے۔ یہ مستقل بالذات کھوکھلی خوبی کئی نظریات دانوں کو کھٹکتی ہے۔ ورلڈ بنک اور دوسری ترقیاتی ایجنسیاں بھی سمجھتی ہیں کہ یہ جو کچھ پیش کرتی ہے' عالمی اطلاق کے لیے اس میں ردوبدل کی ضرورت ہے۔

قانون کی حکمرانی کی اس صورت سے وابستہ عناصر اس کے تقاضوں اور اس کے نتائج کے بارے میں مستقل طور پر اتفاق رائے رکھتے ہیں۔ البتہ دو نکات پہ متفق نہیں کہ برابری کے تقاضے یا ضرورت کو کیسا سمجھا جائے اور کیا قانون کی حکمرانی بذات خود ایک اخلاقی خیر پیش کرتی ہے۔

لٹریچر میں مساوات کے تقاضے کے دو مفہوم ملتے ہیں۔ ہائیک کا کہنا ہے کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مساوات ایسے قوانین کے نفاذ کو ممنوع قرار دیتی ہے جو لوگوں میں من مانی تفریق پیدا کریں۔ اس پابندی میں مسئلہ یہ ہے کہ یہ ایک بنیادی معیار چاہتی ہے جو طے کرے کہ کیا چیز من مانی اور استبدادی ہے ایک اور سنگین مسئلہ یہ حقیقت ہے کہ قانون ہمیشہ ایسے متعدد تفریق و امتیازات پیدا کرتا ہے جنہیں مختلف طریقوں سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ تدریجی ٹیکسوں کا نفاذ مثال کے طور پر آمدنیوں کی مختلف سطحوں پر مختلف شرحوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ نفاذ دوسری صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ ان مشکلات کی وجہ سے بہت سے رسمی بیانات مساوات کی ضرورت کو ایک اور فہم کے ساتھ لیتے ہیں۔ (ہائیک نے بھی اسی کو استعمال کیا ہے): ایک قانون اپنی شرائط کے مطابق ہر ایک پہ مساوی طور پر نافذ ہوتا ہے۔ (یہ شرائط چاہے کچھ بھی ہوں)۔ اور ایسا کرتے ہوئے کسی کی دولت' مرتبے (سرکاری منصبدار یا عام آدمی)' نسل یا مذہب یا متعلقہ فرد کی کسی خصوصیت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ہر ایک قانون کے سامنے برابر ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

رسمی ضابطہ پسندی کی اخلاقیات

اختلاف رائے کا دوسرا علاقہ یہ ہے کہ..... کیا قانون کی حکمرانی ایک اخلاقی خیر ہے؟ یہ سوال بری طرح متنازعہ ہے۔ یہ استفسار کرتا ہے کہ کیا ایک حکومت جو قانون کی حکمرانی کا دعویٰ کرتی ہے' اپنے شہریوں کی اطاعت کی حق دار ہے' فلر کا استدلال ہے کہ قانون کی حکمرانی بذات خود ایک اخلاقی خیر ہے۔ اس لیے کہ یہ فرد کی خودمختاری میں اضافہ کرتی ہے۔ مزید برآں اس کا دعویٰ ہے کہ قانون کی حکمرانی ''خیر کے ساتھ ایک تعلق اور رغبت رکھتی ہے۔'' مطلب یہ کہ ان رسمی خصوصیات کے نظام ہائے قانون امکانی طور پر ایسے قوانین رکھتے ہیں جو زیادہ شفاف اور منصفانہ ہوتے ہیں۔ ''سرکاری (قانونی) ماحول میں کم از کم کچھ ایسی اقدار و اصول ہوں گے جن کا سہارا لے کر عام شہری ناانصافی کے متعلق اپنی شکایات پیش کر سکے اور کچھ ایسا تناؤ پیدا کر سکے جس سے حکومت ہراساں ہو جائے۔'' کم از کم سطح پر قانون کی حکمرانی کے طریقۂ کار کی ضروریات حکومت کو مکمل طور پر من مانے انداز میں اقدامات کرنے سے روکتی ہیں۔ ''ایک استبدادی حکومت جو ضرر رساں مقاصد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے خود کو وقف رکھتی ہے خود کو قانون کے متقاضی طریقۂ کار کے ذریعے کسی اصولی نظم کی پابند نہیں رکھتی۔ تاہم ایک طاقتور مخالف استدلال پیش کیا جا سکتا ہے کہ رسمی قانون کی حکمرانی اخلاقی طور پر غیر جانبدار ہوتی ہے۔ رازا سے اس طرح پیش کرتا ہے۔

> ''ایک اچھا چاقو..... اور خوبیوں کے علاوہ ایک تیز دھار چاقو ہوتا ہے۔ اسی طرح قانون کی حکمرانی سے مطابقت قوانین کی ایک پیدائشی خوبی اور بلاشبہ یہ ان کی انتہائی اہم پیدائشی خوبی ہے۔ یہ قانون کے جوہر میں سے ہے کہ وہ طرز عمل کی رہنمائی ضابطوں اور انکا اطلاق کرنے والی عدالتوں کے ذریعے کرے۔ دیگر دستاویزات کی طرح قانون کی ایک مخصوص خوبی یہ ہے کہ وہ اخلاقی طور پر اسی طرح غیر جانبدار ہو جس طرح اس مقصد کے لیے جس کے لیے دستاویز کو پیش کیا گیا ہو۔

کسی چاقو کی طرح جو بذات خود نہ اچھا ہوتا ہے اور نہ برا۔ لیکن اسے آپ کسی انسان کو قتل کرنے کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور سبزی کاٹنے کے لیے بھی۔ چنانچہ قانون کی اخلاقیات اس عمل سے تشکیل پاتی ہے جس کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی غیر اخلاقی قانونی حکومت کی خدمت کرنے والی قانون کی حکمرانی بھی غیر اخلاقی ہوگی۔ ضرر رساں قوانین کے حوالے سے صراحت اور نفاذ کا تواتر..... قانونی غلامی کی طرح..... نظام کو مزید برا اور شر انگیز بنا دیتا ہے۔ اس سے ظالمانہ استعداد اور کینہ پروری بڑھ جاتی ہے۔ کیا ایک قانونی حکومت حمایت کی حقدار ہے' اس تناظر میں یہ سوال نہیں ہے کہ کیا یہ قانون کی حکمرانی کا احترام کرتی ہے۔ (اگرچہ یہ تشخیص کا ایک حصہ ہو سکتا ہے) بلکہ قوانین کے مندرجات کی اخلاقی درآمد' ان کا نفاذ اور ان کے نتائج اصل سوال ہے۔

یہ بحث دلچسپی کا ایک تجریدی معاملہ ہے اور محض نظریات دانوں تک محدود نہیں۔ مطلق العنان حکومتیں جو رسمی ضابطہ پسندی سے وابستہ ہوتی ہیں' اب بھی موجود ہیں۔ قانون کی حکمرانی کو میسر حالیہ بے مثال قانونی حیثیت کی وجہ سے کسی استبدادی حکومت کے لیے لازم ہو جائے گا کہ وہ ظالمانہ قوانین کے ساتھ قانون کی حکمرانی قائم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرے تاکہ شہریوں کی اطاعت کا دعویٰ کر سکے۔ چاہے اس طرح ان کے لیے مشکلات پیدا ہوں۔ ایسی مکار استبدادی حکومتیں اپنے موقف کی حمایت میں وہ دلائل تلاش کر لیں گی جو با اثر نظریات دانوں نے پیش کیے ہیں کہ قانون کی حکمرانی رکھنے والی حکومتیں چاہے یہ متشدد ہوں' ان کی اطاعت کی جانی چاہیے کیونکہ ان کا متبادل ان سے بھی برا ہو سکتا ہے۔ جیری ویلڈ ران نے ایسا ہی استدلال پیش کیا ہے: ''ایک نظام جو اس تصور (قانون کی حکمرانی) کے قریب ہو' وہ ہماری حمایت کا معقول دعویٰ کر سکتا ہے اگر اس بات کا حقیقی خطرہ ہو کہ اس کی ناانصافیوں اور کوتاہیوں کے خلاف احتجاج اور نافرمانی شدت اختیار کر کے اس کے انہدام اور اس کی جگہ ایسی حکومت کے قیام کا سبب بن سکتا ہے جو ضابطہ پسندی کا احترام نہ کرتی ہو۔'' اس طرح ایک نفرت انگیز حکومت اپنے استبداد کو جائز ٹھہرانے کے لیے قانون کی حکمرانی کو استعمال کر سکتی ہے اور جواز پیش کر سکتی ہے کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کی جگہ زیادہ ظالمانہ اور متشدد حکومت کے امکانات موجود ہیں۔ رسمی ضابطہ پسندی کو بذات خود ایک اخلاقیات کے طور پر دیکھنا' کسی عوام کے لیے پریشان کن نتائج کا سبب بن سکتا ہے۔ ''ظالمانہ قانون غالباً لاقانونیت کے جبر و تشدد سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے لیکن یہ خود بھی اتنا ہی خوفناک ہوتا ہے۔''

ایک فہمیدہ حل دونوں اطراف کی بصیرت کو قبول کرتا ہے۔ رسمی ضابطہ پسندی شہریوں کو پیش بینی کرنے اور منصوبہ بندی کی اجازت دے کر ان کے وقار میں اضافہ کرتی ہے اور بلاشبہ یہ ایک اخلاقی اثبات ہے۔ تاہم اتنا ہی اہم کسی قانون کی اخلاقی تشخیص کرنا ہے۔ یہ تعین کرتے ہوئے کہ آیا یہ شہریوں کی طرف سے تعمیل کی اخلاقی ذمہ داری پیدا کرتا ہے' یہ بھی لازمی طور پر دیکھنا ہوگا کہ قوانین کے اجزا کے اخلاقی نتائج اور ان کے اثرات کیا ہیں۔

رسمی ضابطہ پسندی کا کھوکھلا پن' ایک وسیع تر نکتہ بنانے کے لیے قانون کی حکمرانی کی طویل روایت کے بالمقابل چلتا ہے جس کی تاریخی ترغیب مقتدر اعلیٰ کے استبداد کے راستے میں رکاوٹ رہی ہے۔ یہ پابندی اس تصور سے آگے نکل گئی کہ حکومت کو لازمی طور پر ان قوانین کو وضع کرنا اور ان کے مطابق چلنا چاہیے جو ضابطوں کی درست ترین شکل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختیار کرتے ہیں تاکہ یہ تفہیم شامل ہو جائے کہ ایسی بہت سی چیزیں تھیں جو حکومت یا مقتدر اعلیٰ نہیں کر سکا۔ قانون کی طرف سے عائد ہونے والی پابندیاں اثباتی یا مستقل بالذات تھیں کیونکہ یہ فطری قانون' مشترکہ رسوم ورواج' مذہبی اخلاقیات یا کمیونٹی کی بہبود پر مبنی تھیں۔ رسمی ضابطہ پسندی اس سمت بندی سے انحراف کرتی ہے۔ رسمی ضابطہ پسندی پہ قائم رہتے ہوئے حکومت وہ کچھ کر سکتی ہے جو چاہتی ہے۔ جب تک یہ اس قابل ہوتی ہے کہ اپنی ان خواہشوں کی تکمیل پہلے سے اعلان شدہ قانونی ضابطوں (عمومی' واضح' یقینی اور عوامی) کی مطابقت میں کر سکے' وہ ایسا کرتی رہتی ہے۔ اگر حکومت کوئی ایسا اقدام کرنے پر تیار ہو جائے جو قانونی طور پر جائز نہ ہو تو وہ سب سے پہلے قانون تبدیل کرتی ہے تاکہ قانونی ضروریات کو پورا کرنا یقینی بنایا جا سکے۔

یہ سب کچھ ذہن میں رکھتے ہوئے' یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ رسمی ضابطہ پسندی میں قانون کی حکمرانی کی تاریخی روایت کے برعکس قانون کے ذریعے حکومت کی مشترکہ چیزیں زیادہ ہیں۔

رسمی ضابطہ پسندی قوانین کا مسئلہ ہے

اہم ترین بات یہ تسلیم کرنا ہے کہ قانون کی حکمرانی کو رسمی ضابطہ کی اصطلاحوں میں سمجھنا ضابطوں کی نوعیت کو بھاپ بنا کر اڑا دیتا ہے۔ استدلال کے مکمل تسلسل کی تعمیر نو اس طرح ملوث ہوتی ہے۔

''قانون اپنے جوہر میں ضابطوں پر مشتمل ہوتا ہے (ضابطے وہ امتیازی صورتیں ہیں جو قانون اپناتا ہے)۔ ضابطوں کا کام (اور تعریف) لوگوں کے طرز عمل کی عمومی رہنمائی ہے۔ عمومیت' یقینیت' وضاحت اور مؤثر بہ مستقبل ہونا' یہ سب خوبیاں ضابطوں کی نوعیت سے مربوط ہیں۔ عمومیت سے مراد کسی خصوصی حکم کے برعکس ایک عمومی ضابطہ ہونا ہے۔ یہی ایک بنیادی فرق کسی ضابطے پر عمل کرنے اور ایک عبوری اقدام کرنے یا ایک مخصوص سیاقی فیصلہ کرنے میں ہے۔ غیر یقینی یا مبہم ضابطے لوگوں کی رہنمائی ان کے طرز عمل کے لیے کرنے میں محدود اثر یا قوت رکھتے ہیں۔ مؤثر بہ ماضی ضابطہ اجتماع

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضدین ہوتا ہے کیونکہ اس کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔ ضابطے کسی بھی قسم کے اطمینان پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی کسی بھی قسم کے اطمینان کے لیے کھلی ہوتی ہے۔ ضابطے فطرت بناتی ہے۔ چنانچہ قوانین فطرت کے ذریعے بنتے ہیں یوں قانون کی حکمرانی فطرت سے تشکیل پاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسمی ضابطہ پسندی کی خوبیاں وہی اوصاف ہیں جو ضابطے رکھتے ہیں۔ ضابطوں کے فلسفیانہ اور سماجی تجزیئے اور ضابطوں پر عملدرآمد انہی امور اور عناصر کو نمایاں کرتے ہیں جن کو قانون کی حکمرانی کی رسمی شکل نمایاں کرتی ہے اور آخر میں رسمی قانون کی حکمرانی میں ایک علیحدہ تصور کی حیثیت سے کچھ بھی خصوصی نہیں۔ کیونکہ یہ (قانونی) ضابطوں کے بارے میں ہے۔

اس آخری نکتہ کو ذہن میں رکھنے سے ان دعوؤں کو زیادہ احتیاط سے بھانپنے میں مدد ملے گی جو نظریات دانوں نے رسمی قانون کی حکمرانی کے بارے میں کیے ہیں۔ میکس ویبر دلیل دیتا ہے کہ سرمایہ داری ایک رسمی ضابطہ طلب قانونی نظام کا تقاضا کرتی ہے تاکہ مارکیٹ کے معاملات کے لیے ضروری تحفظ اور پیش بینی کو یقینی بنایا جا سکے۔ ہائیک کی قانون کی حکمرانی کے لیے رسمی سوچ انہی دلائل کو آگے لاتی ہے جو شخصی آزادی کی کلید کے طور پر قانون پر عملدرآمد کی پیش بینی کے بارے میں ہیں۔ سرمایہ داری' لبرل ازم اور قانون کی حکمرانی اس طرح آپس میں سختی سے بندھے ہوئے ہیں اور ہائیک کے اس دعویٰ کی پشت پناہی کرتے ہیں کہ قانون کی حکمرانی سوشلسٹ معاشی نظام یا سوشل ویلفیئر سٹیٹ کے سیاق وسباق میں زیر عمل نہیں لائی جا سکتی۔

سوشل ویلفیئر نظام اور اسی طرح سوشلسٹ نظام بھی ضابطوں کے عملدرآمد پر انحصار کرتے ہیں۔ جب ضابطے موجود ہوتے ہیں اور اس قانونی نظام میں ان کا احترام کیا جاتا ہے جو رسمی ضابطہ پسندی کے تحت رائج ہوتا ہے تو بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ کن شعبوں میں یا کون سی سرگرمیوں کے حوالے سے قانونی ضابطوں کی حکمرانی ہونی چاہیے۔ رسمی ضابطہ پسندی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ یہ حکومت کی سرگرمیوں کے تناسب یا نوعیت کے بارے میں بھی کوئی ہدایت نہیں دیتی جنہیں ضابطوں کے تحت ہونا چاہیے۔ یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سب معاملات سماجی انتخاب یعنی پسند و ناپسند کے ہیں۔ فیصلے اس وقت ہونے چاہئیں جب پیش بینی اور شخصی خودمختاری کو پورا احترام دیا گیا ہو' جب سماجی میل جول کے کسی مخصوص شعبہ میں قانونی ضابطوں کے اطلاق سے وابستہ سود و زیاں کو پیش نظر رکھا گیا ہو' جب دیکھا جائے کہ کیا ضابطے موزوں مؤثر اور سماجی طور پر مفید اور کس تناسب میں اور کس حد تک ہیں۔ ضابطوں کو ہر اس صورت حال میں نافذ کیا جا سکتا ہے جس میں یہ سماجی طور پر مفید ہوں اور ایسا کرتے ہوئے ماحول کے معاشی یا سیاسی نظام کی نوعیت کی پروا نہیں کی جاتی۔ قانون کی حکمرانی کی تاریخی روایت' ریاستی استبداد پر پابندیوں کے اصرار کے ساتھ انتباہ کرتی ہے۔ رسمی ضابطہ پسندی کم از کم ان شعبوں میں ضروری نافذ ہونا چاہیے جو حکومت کے استبداد کا موضوع ہیں۔ مثلاً فوج داری سزاؤں کے سیاق و سباق میں اس کا نفاذ کم سے کم ہونا چاہیے۔

ہائیک اور انگر کے موقف کے برعکس سوشل ویلفیئر ریاست لازمی طور پر قانون کی حکمرانی کے لیے خطرہ نہیں بنتی۔ یہ حکومت کے لیے ایسے علاقے تخلیق کرتی ہے جہاں وہ تفصیلی قانونی پابندیوں کے بغیر اقدامات کر سکتی ہے۔ ان میں بہت سے علاقے یا شعبے وہ ہیں جہاں حال ہی میں پیدا ہونے والی تحریکات و ترغیبات کے تحت حکومتی سرپرستی میں پروگرام شروع کیے جاتے ہیں۔ ماضی میں قانون سے متعلقہ امور' بالخصوص جن کا تعلق فوج داری قوانین کے اطلاق سے ہوتا تھا' مثلاً عوامی نظم و نسق کو متاثر کرنے والے یا فرد اور دوسروں کی املاک پر اثر انداز ہونے والے امور کو انتظامی عملہ نہیں چھیڑتا تھا۔ اگر کوئی چیز جو رسمی ضابطہ پسندی کی پہنچ کو پھیلاتی ہے' کم نہیں کرتی (ہائیک کی تحریر کے بعد فوج داری قوانین کے اطلاق اور امکان میں اضافہ ہو چکا ہے) تو وہ لازمی طور پر آزادی عمل کو بڑھانے کی بجائے کم کرتی ہے۔ صورت حال کو یقینی بنانے کے لیے بہت سے انتظامی اقدامات تعزیری پہلو رکھتے اور فوج داری پابندیوں سے مشابہ ہیں' مثلاً جرمانے وغیرہ۔ لیکن یہ اکثر اوقات ضابطے کی حکمرانی کے فریم ورک میں شمار کیے جاتے ہیں۔

حکومتی سرگرمیوں' ان میں زیادہ تر سرگرمیاں پالیسی کی پابند اور امتیازی فیصلوں کی متقاضی ہوتی ہیں' کے مجموعی پھیلاؤ کی وجہ سے قانونی ضابطوں میں جکڑے حکومتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقدامات کے مجموعی تناسب میں کمی ہوتی ہے۔ تاہم ہائیک رسمی ضابطہ پسندی کا سہارا لے کر اس صورت حال کی شکایت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ رسمی ضابطہ پسندی صرف اس صورت کو مخاطب کرتی ہے جو قانون کو اختیار کرنا چاہیے ناں کہ اس کے اطلاق کے تناسب اور حالات کو انتظامی سیاق وسباق سے باہر' نجی قانون کے علاقوں میں کھلے معیارات کے استعمال میں اضافہ ہو چکا ہے۔ مثلاً شفاف پن' معقولیت اور ججوں کی طرف سے انفرادی مقدمات میں انصاف کے حصول کو یقینی بنانا۔ لیکن اس کے باوجود ان تبدیلیوں نے نظام قانون کے مجموعی ضابطہ طلب کردار کو تبدیل نہیں کیا۔ نہ ہی انہوں نے پیش بینی کی صلاحیت میں کسی درجہ کی کمی ہے اور نہ ہی انہوں نے نظر بظاہر تجارتی معاملات میں کسی طرح کے منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ جدید شکایات یہ ہیں کہ قانون بہت زیادہ ہے لیکن اس کا جو وسیع تر حصہ رسمی ضابطہ پسندی کو مطمئن کرتا ہے..... وہ بھی کم نہیں ہے۔

مغربی جمہوریتوں نے ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہوا تصدیق کر دی ہے کہ سوشل ویلفیئر ریاست کا رسمی ضابطہ پسندی کے ساتھ حقیقتاً اشتراک ہو سکتا ہے۔ انتظامی صوابدیدی اختیارات کو مقننہ کے ذریعے پابندیاں نافذ کر کے اور طریقہ کار کے تقاضے وضع کر کے حدود وقیود میں لایا جا سکتا ہے۔ ججوں کو کہا جا سکتا ہے کہ وہ شفافیت اور معقولیت کے وسیع تر معیارات اپنائیں یا فیصلے پالیسی کے مطابق کریں یا مفادات کو متوازن رکھیں۔ ایسا کرنے سے ضابطہ پر مبنی نظام قانون کے قانونی اوصاف مسخ نہیں ہوتے۔ پیش بینی اس صورت میں بھی برقرار رہتی ہے اگر مشترکہ پس منظر کے مفاہیم ہوں یا مشترکہ رسوم ورواج معاشرے یا کسی قانونی کلچر میں موجود ہوں جو وسیع تر معیارات کے اطلاق سے باخبر رکھیں۔ جب تک حکومتی عمال کا رویہ ضابطوں کا پابند رہتا ہے کہ حکمران ضابطے موجود ہوتے ہیں تو صوابدیدی اختیارات حکومتی عمال کو مجاز بناتے ہیں کہ پالیسی اہداف کو آگے بڑھائیں۔ اس سے غیر قانونی جبر واستبداد جنم نہیں لیتا۔ قانون کے نظریہ دان مارٹن کرائیگر جس کی نظر سابقہ کمیونسٹ مشرقی یورپ پہ بہت گہری تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک اختلافی دنیا پائی جاتی ہے جس کے ایک کنارے پر بے قابو سیاسی خود اختیاری اور قانون کا اعانتی استعمال جور وجبر میں پایا جاتا ہے تو دوسرے کنارے پر ویلفیئر ریاستیں ہیں جو سیاسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوریت اور توانا اور طویل قانونی روایات کے ساتھ انتظامی مداخلتوں کو شامل کر دیتی ہیں۔

جمہوریت اور رسمی ضابطہ پسندی

قانون کی حکمرانی کی تیسری اور آخری شکل جمہوریت کو رسمی ضابطہ پسندی میں شامل کرتی ہے۔ رسمی ضابطہ پسندی کی طرح جمہوریت بھی بنیادی طور پر اس حوالے سے کھوکھلی ہے کہ وہ کچھ نہیں بتاتی کہ قانون کا اطمینان کیا ہونا چاہیے۔ یہ ایک فیصلے کا طریقہ کار ہے جو بتاتا ہے کہ قانون کا اطمینان کیسے متعین کرنا ہے۔

مغربی سیاسی افکار میں ایک مشترکہ احتراز' جسے ایتھنز کے جمہوریت پسندوں نے پیش کیا اور روسو اور کانٹ کے علاوہ متعدد دیگر مفکرین نے دہرایا' یہ ہے کہ ''آزادی ان قوانین کے اندر رہنا ہے جنہیں خود بنایا گیا ہو۔'' سیاسی آزادی کا تصور یہی ہے۔ فلاسفر جرگن ہیبرمس کے مطابق جس نے رسمی ضابطہ پسندی اور جمہوریت کے درمیان تعلق کا انتہائی خوبصورت بیان مرتب کیا ہے: جدید نظام قانون اپنا جواز صرف خودارادیت کے تصور سے اخذ کر سکتا ہے: شہریوں کو ہمیشہ اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ بذات خود سمجھیں کہ جس قانون کو انہوں نے وضع کیا ہے اور جس کے وہ مخاطب ہیں ان سے کیا تقاضا کرتا ہے۔ قانون اپنا اختیار ان کی رضامندی سے حاصل کرتا ہے جن پر وہ حاکم ہوتا ہے۔ جج' حکومتی عمال اور شہری سب پر فرض ہے کہ وہ اس قانون کی اطاعت کریں جس کو عوام نے اپنے نمائندوں کے ذریعے وضع کیا ہے۔

اس استدلال کے تحت رسمی ضابطہ پسندی' بالخصوص اس کی یقینیت (قطعیت) اور نفاذ کی مساوات اپنا اختیار جمہوریت سے لیتی اور اس کی خدمت کرتی ہے۔ رسمی ضابطہ پسندی کے بغیر جمہوریت دھوکہ میں آ جاتی ہے۔ (کیونکہ حکومتی عمال قانون کو توڑ مروڑ لیتے ہیں) جمہوریت کے بغیر رسمی ضابطہ پسندی اپنا جواز کھو بیٹھتی ہے (کیونکہ قانون کا اطمینان قانونی (جائز) طریقوں سے متعین نہیں کیا گیا ہوتا۔)

ہیبرمس اس امتزاج کو مغربی لبرل جمہوریتوں کے اندر اکلوتے جائز انتظام کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حیثیت سے دیکھتا ہے جو ہم عصر عقائد و حالات میں پایا جاتا ہے۔ فطری قانون پہ ایمان کے خاتمہ اور اخلاقی تکثیریت کی حقیقت نے ہمارے لیے کوئی متبادل نہیں رہنے دیا۔ جمہوری صحیفہ' تحریری قانون اس کے انصاف کے ساتھ مہیا کرتا ہے یہ استخراجی اصول نہیں ہیں جن سے مطابقت ضابطوں کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ قانون کا انصاف اس مخصوص طریقۂ کار سے یقینی بنایا جاتا ہے جس کے ذریعے یہ وجود میں آتا ہے۔ اس انتظام کے تحت ہیبرمس دعویٰ کرتا ہے کہ ''وضعی قانون کی جائز حیثیت طریقۂ کار کی معقولیت سے محمول کی جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ اعلیٰ تر معیارات کی عدم موجودگی میں جن کے سامنے قانون کی اخلاقی درستی کو پرکھا جاتا ہے' قانون اس صورت میں اچھا ہوتا ہے اگر اسے اچھے طریقۂ کار سے وضع کیا گیا ہو۔ معقولیت پسند جمہوری میکنزم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر اس فرد کو قانون سازی میں شرکت کا مساوی موقعہ دے جو قانون سے متاثر ہو اور لازمی طور پر ہر ایک کی رضامندی حاصل کرے۔

اس حوالے سے بھی ایک طویل بحث ابھری ہے کہ کس قسم کی رضامندی درکار ہوتی ہے۔ یہ مسائل کسی براہِ راست جمہوریت میں نہیں ابھرتے جو مکمل اتفاق رائے کی طالب ہوتی ہے۔ لیکن کسی بڑے گروپ میں قانون سازی اس انداز میں نہیں ہوتی۔ کانٹ کا استدلال ہے کہ تمام شہریوں کی رضامندی (محدود نمائندگی) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس بات کا ان سے مشورہ لیا جائے گا اس پر متفق بھی ہوں گے۔ لیکن اس کے برعکس اس بات پر وہ متفق ہوں گے جس پر فہم وادراک کے ساتھ مسلسل عمل کرتے ہیں۔ ہیبرمس کھلے طور پر اتفاق رائے کا تقاضا کرتا ہے۔ قانون کی جائز حیثیت انجام کار ایک ابلاغی انتظام پر انحصار کرتی ہے۔ جس طرح شرکاء عقلی مباحثہ میں قانون کے تحت ہم مرتبہ لازمی طور پر اس قابل ہونے چاہئیں کہ وہ جائزہ لے سکیں کہ کیا ایک زیر بحث اصول لاگو ہوتا ہے یا لاگو کیا جا سکتا ہے' تو ممکنہ طور پر سب متفق نہیں ہوں گے۔ حتمی تجزیہ میں البتہ ہیبرمس کا مطلب حقیقی متفقہ رضامندی نہیں اور یہ ناممکن نہیں تو ناقابل عمل ضرور ہے۔ اس سے نہ تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اتفاق رائے کی ضرورت جو سب سے زیادہ فرد کی سیاسی آزادی کو جائز بناتی ہے' دانشمندانہ ہے۔ کیونکہ یہ ایک فرد کو اس قابل بناتی ہے کہ باقی سب کو یرغمال

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنا لے ایسی پیش قدمیوں کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر دے جو اجتماعی طور پر مفید ہوں یا جبری طور پر غیر متناسب ثمرات اس بنیاد پر چھین لے کہ یہ ثابت قدم رہنے والے کی رضامندی حاصل کرنے کی قیمت ہے۔ یہ نظریات دان ایک انضباطی نصب العین پیش کر رہے تھے اور اسے ایک ایسے ہدف کے طور پر مرتب کر رہے تھے جس کے لیے نظام ہائے قانون کو ایسے قوانین وضع کرنے کے لیے کوشش کرنا چاہیے جن پر تمام متاثرہ لوگ متفق ہو جائیں اور یہ توقع نہ رکھیں کہ اس کا حصول عملی طور پر ممکن ہو سکے گا۔

لاک نے ان مسائل پر ایک عملیت پسندانہ موقف اختیار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ براہِ راست شرکت اور اتفاق رائے کا تقاضا کرنا مفلوج کرنے کا نسخہ ہے۔ ایسا نمائندہ جمہوریت اور اکثریت کی حکمرانی کو کرنا پڑتا ہے۔ ہر شہری سے جو کچھ درکار ہوگا وہ اس کی یہ رضامندی ہے کہ اس پر جمہوری میکنزم کی حکمرانی ہو۔ اس طریقۂ کار پہ اتفاق جو قوانین کے اطمینان کے بارے میں فیصلہ سازی کے لیے استعمال ہو' نہ کہ ہر قانون کے پیدا کردہ اطمینان کے لیے رضامندی۔ جب تک ایک مسئلہ پر ہارنے والے فرد یا گروہ کو کسی دوسرے مسئلہ پر غالب رہنے کا بھرپور موقعہ میسر رہے گا' نظام آزاد رہے گا۔

آخر میں ایک بات ذہن میں رہے کہ قانون کے لیے طریقۂ کار کی جائز حیثیت کے طور پر جمہوریت کی طرف رجوع کرنا ایسی حدود و قیود رکھتا ہے جو رسمی ضابطہ پسندی سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اسی طرح ایسے نظام جو قانون کا متن متعین کرنے کے لیے جمہوری طریقۂ کار استعمال کرتے ہیں برے قوانین وضع کر سکتے ہیں۔ جب جمہوری میکنزم کسی ایسے معاشرے میں زیرِ عمل لائے جاتے ہیں جہاں جمہوری روایت نہ ہو یا ایسی روایت قائم کرنے کی کوشش بھی نہ ہو رہی ہو یا جب دشمن کمیونٹیاں یا ذیلی کلچر ایک ساتھ رہ رہے ہوں تو جمہوریت ایک ایسے ذریعہ کا کام کرتی ہے جس کو کوئی منظم سازباز یا معاشرے کا ذیلی گروہ استعمال کر کے حکومت کی باگ ڈور اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے اور پھر قانون کو استعمال کر کے اپنے مخصوص ایجنڈا کو آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن اس دوران اس کا دعویٰ ہوتا ہے کہ جمہوریت نے اسے جائز حیثیت دی ہے۔ رسمی ضابطہ پسندی اس صورت حال کو رونما ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ قانون کی حکمرانی ہی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اکلوتا فیصلہ کن عامل نہیں جو کسی نظام میں پیش بینی کی صلاحیت کا تعین کر سکے۔ جمہوری نظام عوام کے مزاج اور رویہ میں ڈرامائی تبدیلیاں دیکھتے ہیں۔ ایک جمہوری نظام قانون کی حکمرانی کے باوجود کم یقینی اور ناقابل پیشین گو ہونے کے علاوہ کسی مستحکم مطلق العنان حکومت کے برعکس جو قانون کی حکمرانی نہیں رکھتی زیادہ استبدادی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم مطلق العنان حکومت کی سفارش نہیں کر رہے بلکہ آگاہ کر رہے ہیں کہ ماحول کے سیاسی' سماجی' معاشی' قانونی اور ثقافتی عوامل کے تمام پیچیدہ پہلو مل کر نتائج پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ ایک جمہوری مقننہ کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ خواہش کے مطابق قوانین میں تبدیلیاں لا سکے چنانچہ یہ قانون کی قطعیت کے لیے جس انداز میں خطرہ بنتا ہے وہ قانون کے کلاسیکل اور قرون وسطیٰ کے مفاہیم میں نہیں پایا جاتا جن میں قانون (فطری' رواجی) کی حکمرانی ضابطوں کے ایک مستقل مجموعہ پر استوار ہوتی تھی۔

جمہوریت ایک منہ پھٹ اور بھاری بھرکم میکنزم ہے جو اخلاقی اعتبار سے اچھے قوانین وضع کرنے کی کوئی یقین دہانی نہیں کراتا۔ شہریوں کے لیے انفرادی طور پر سیاسی آزادی کی حمایت سے قطع نظر غالباً اس کا مضبوط ترین جواز جو ناقابل غور نہیں یہ ہے کہ موجودہ دیگر نظام ہائے قانون و سیاست میں یہی کم تر خطرات رکھتا ہے۔ یقیناً یہ آج کل سیاسی قیادت کو تبدیل کرنے کا بہترین طریقہ ہے لیکن یہ مسئلہ بالکل الگ ہے جبکہ یہاں مسئلہ یہ ہے کہ قانون کو کس طرح بہترین بنایا جائے۔ اسے یقین دہانی کی توثیق تو نہیں کہا جا سکتا لیکن جب جمہوریت کا تذکرہ قانون کے جواز کی بنیاد کے طور پر کیا جاتا ہے اور رسمی ضابطہ پسندی کی اقدار جواز کے لیے اضافی وجوہات کی حیثیت سے پیش کی جاتی ہیں تو قانون کا اخلاقی دعویٰ اطاعت کے لیے یقیناً وزنی محسوس ہوتا ہے۔ یہ بات البتہ فراموش نہیں کی جانا چاہیے کہ ان رسمی میکنزم میں سے کوئی بھی یہ یقین دہانی نہیں کراتا کہ وضع کیے جانے والے اور نافذ کیے جانے والے قوانین اپنے متن یا اثر میں اخلاقی ہوں گے۔

❖....❖....❖

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

8

اثباتی نظریات

شخصی حقوق

قانون کی حکمرانی کی تمام اثباتی یا مستقل بالذات صورتیں رسمی قانون کی حکمرانی کے عناصر کو شامل کر کے آگے بڑھتی اور متعدد قسم کی تسکین و اطمینان کی خصوصیات کا اضافہ کر لیتی ہیں۔ سب سے زیادہ پائی جانے والی اثباتی صورت قانون کی حکمرانی میں شخصی حقوق شامل کرتی ہے۔ رونالڈ ڈورکن اس کو نہایت نازک انداز میں پیش کرتا ہے۔

''میں قانون کی حکمرانی کے دوسرے تصور کو ''حقوق'' کا تصور کہوں گا۔ یہ کئی طرح ضابطہ کی کتاب کے تصور سے زیادہ اولوالعزم ہے۔ یہ فرض کرتا ہے کہ شہریوں کے ایک دوسرے کے حوالے سے کچھ اخلاقی حقوق اور فرائض ہیں۔ اسی طرح ریاست کے بالمقابل مجموعی طور پر سیاسی حقوق حاصل ہیں۔ یہ اصرار کرتا ہے کہ یہ اخلاقی اور سیاسی حقوق وضعی قوانین میں تسلیم کیے جانے چاہئیں۔ تاکہ انہیں کسی شہری کے انفرادی مطالبہ پر عدالتوں یا اسی قسم کے عدالتی اداروں کے ذریعے اس وقت تک نافذ کیا جاتا رہے جب تک یہ قابل عمل ہیں۔ اس تصور پر قانون کی حکمرانی ایک مثالی حکمرانی ہے جو شخصی حقوق کے ایک درست ترین عوامی تصور کے ذریعے کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتی ہے۔ یہ ضابطہ کی کتاب کے تصور کی طرح قانون کی حکمرانی اور بنیادی انصاف کے درمیان میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ اس کے برعکس یہ قانون کے نصب العین کے ایک حصہ کے طور پر تقاضا کرتا ہے کہ ضابطہ کی کتاب میں موجود ضابطوں کو گرفت میں لیا جائے اور اخلاقی حقوق نافذ کیے جائیں۔''

ڈورکن نے اصرار کیا ہے کہ یہ حقوق وضعی قانون نے عطا نہیں کیے بلکہ اس کے برعکس وضعی قانون کے ایک پس منظر اور ناگزیر پہلو نے مہیا کیے ہیں۔ اس نے مابعد الطبیعات سے رجوع کرنے سے بھی گریز کرتے ہوئے ان حقوق کے ذرائع کی کمیونٹی میں نشاندہی کی ہے۔ ضابطہ کی کتاب کمیونٹی کی طرف سے اخلاقی حقوق کی تسخیر کی کوششیں پیش کرتی ہے لیکن ضابطہ کی کتاب ہی ان حقوق کا اکلوتا ذریعہ نہیں ہے اور پھر کتاب ضابطہ خاموش بھی ہو سکتی ہے یا متنازعہ تشریحات بھی پیش کر سکتی ہے۔ ایسے مواقع پر یہ ذمہ داری جج کی ہے کہ ایسا فیصلہ کرے جو فریقین کے حقوق کے پس منظر سے موزونیت رکھتے ہوں۔ اس کے لیے وہ کوئی بالاتر سیاسی اصول اپنا سکتا ہے جو موجود ضابطوں اور اصولوں کے مجموعہ سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہ اصول ضابطوں سے آگے بھی جا سکتے ہیں اور یہ ضابطوں کے درمیان ظاہری تنازعات کو بھی حل کر سکتے ہیں تب اس فریضہ میں ملوث جج کہتے ہیں کہ قانون سازوں کو کیا کرنا چاہیے تھا کیا وہ سسٹم کے تحت سیاسی اصولوں کے مطابق کام کرتے اور کمیونٹی میں روح پھونکتے رہے ہیں؟

ڈورکن اپنے حقوق کے تصور پر واضح اعتراض کو تسلیم کرتا ہے۔ عام طور پر یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ ''کمیونٹی'' کے اندر یہ بات متنازعہ ہوتی ہے کہ انہیں کون سے اخلاقی حقوق حاصل ہیں اور اگر یہی مسئلہ ہو تو پھر جج کس طرح موجود سیاسی اصولوں سے مدد لے سکتا ہے؟ ڈورکن اس یقین پر انحصار کرتا ہے کہ کسی غالب اصول کا اطلاق عام طور پر ممکن اور بدیہی ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ معاشرے کے نظریات ان موضوعات پر سیاسی اور اخلاقی اصول کی اعلیٰ ترین سطح پر اس طرح متحد یا مربوط ہوتے ہیں کہ ایک درست قانونی جواب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس وقت تلاش کیا جا سکتا ہے جب جج مسئلہ کا جائزہ مکمل وابستگی اور ذہانت کے ساتھ لے لیکن اس طرح تنازعات کی حتمی متصادم نوعیت کی تکذیب ہوتی ہے اور اخلاقیات کے فلاسفر ایسٹیئر میک اینٹائر نے حال ہی میں تبصرہ کیا ہے۔ ''کوئی حقیقت اس جدید دنیا میں اتنی افسوس ناک نہیں ہوگی جتنی اخلاقیات پر عدم اتفاق کی وسعت اور گہرائی ہے۔ بعض اوقات تو بنیادی مسائل پر بہت زیادہ عدم اتفاق ہوتا ہے۔ مثلاً ہم عصر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا معاشرہ اسقاط حمل' ملازمت اور تعلیم میں توثیقی اقدامات' ہم جنس پرستوں کے حقوق' سزائے موت' منافرت آمیز گفتگو (تقریر) فحاشی تک رسائی' مذہبی سکولوں کے لیے فنڈز اور اس طرح کے کئی امور پر گہری تقسیم کا شکار ہے۔ ان سب کو حقوق کے نام پر عدالتوں میں زیر بحث لایا جا رہا ہے۔'' مزید برآں نزاع حقوق کے اطمینان سے آگے نکل کر مناسب حل کے عدم اتفاق تک جا پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر شہریوں کی ایک اکثریت نے سپریم کورٹ کے براؤن فیصلہ کی حمایت کی جس میں قانونی طور پر نافذ نسلی علیحدگی کو کالعدم قرار دیا گیا تھا لیکن ایک بڑی تعداد میں لوگوں نے بالخصوص جنوبی ریاستوں میں اس سے عدم اتفاق کیا۔ سفید فام شہریوں کی ایک واضح اکثریت نے بچوں کو شہر سے باہر الگ سکولوں میں لے جانے کی شدید مخالفت کی۔ اسی طرح اسقاط حمل کی مزاحمت اس قدر آگے نکل گئی کہ ڈاکٹروں کو قتل کیا گیا اور کلینکس پر بم مارے گئے۔ اسی طرح ہم جنس پرستی کی مخالفت سیاسی اور قانونی میدانوں میں ہر سطح پر ہو رہی ہے۔

یہ مسائل محیطی نہیں بلکہ ایسے تنازعات ہیں جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور دوسرے لبرل معاشروں میں پائے جانے والے سیاسی اصولوں اور اخلاقیات کی شہ رگ کو کاٹ رہے ہیں۔ جب کوئی کمیونٹی اپنے اخلاقی شعور میں منقسم ہو جائے تو پھر ایسے اعتماد کے لیے بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے کہ قانونی ضابطوں کا مجموعہ' سیاسی اصول یا کمیونٹی کی اخلاقیات مربوط یا داخلی طور پر مستحکم رہیں۔ شاید ہی کوئی اکلوتا یا کمیونٹی کی اکثریت کی اخلاقیات کا نظریہ موجود ہو البتہ مختلف اخلاقی نظریات مختلف اوقات اور مختلف موضوعات پر قانون کی جنگ میں جیت جاتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ قانون بنانے کے لیے بااختیار ہوتے ہیں ہمیشہ یا بنیادی طور پر ایسے قوانین تخلیق کرنے پر راغب نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے جو دیانتداری سے کمیونٹی کی اخلاقیات کے آئینہ دار ہوں۔ جانبدارانہ یا پسندیدہ قانون سازی کروانے میں خصوصی مفادات کا اثر انداز ہونا بری طرح بدنام ہے۔

اس طرح کے اعتراضات نہ صرف ڈورکن کو نشانہ بناتے ہیں بلکہ قانون کی حکمرانی کی تمام اثباتی صورتوں پر حملہ آور ہوتے ہیں جو شخصی قوانین رکھتی ہیں۔ ایسا کوئی غیر متنازعہ طریقہ نہیں ہے جو طے کرے کہ یہ حقوق کیا ہیں کرتے ہیں۔ تمام عمومی نصب العین مثلاً مساوات' آزادی' نجی معاملات' حق املاک' معاہدوں کی آزادی' بہیمانہ سزاؤں سے آزادی وغیرہ سب اپنے معنوں اور رسائی میں قابل بحث ہیں۔ اطلاق کے مخصوص سیاق و سباق میں حقوق کے درمیان تنازعات پیدا ہو سکتے ہیں اور پھر کوئی بھی حق مطلق نہیں ہوتا چنانچہ سماجی مفادات کے حوالے سے سوچ بچار ضرور ہونا چاہیے کیونکہ محض حق کے بارے میں سوچنا شافی جواب نہیں دے سکتا۔

ڈورکن کی سوچ کا انتہائی پریشان کن نتیجہ یہ ہے کہ یہ متنازعہ مسائل کو سیاسی میدان سے نکال کر ججوں کے سپرد کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

حقوق کے جمہوریت دشمن نتائج

شخصی حقوق ناگزیر طور پر جمہوریت دشمن پہلو رکھتے ہیں۔ ہر مغربی لبرل جمہوریت ایک توازن کی تلاش میں جدوجہد کرتی رہتی ہے۔ اس جدوجہد کو قانون کی حکمرانی کی لڑائیوں نے متشکل کیا ہے۔ اس کے باہم مربوط لیکن قابل شناخت دورخ ہیں یعنی یہ جمہوریت پر نافذ حدود و قیود اور ججوں کو تفویض کیے گئے اختیارات۔

جیسا کہ پہلے نشاندہی کی جا چکی ہے ابتدائی لبرل سوچ رکھنے والے لوگ جمہوریت کے لیے ایک' دو جذبی رویہ رکھتے تھے۔ حکومت خود اختیاری کے معنوں میں لی گئی آزادی (سیاسی آزادی) اصرار کرتی ہے کہ شہری خود پر حکومت کرنے کے حقدار ہیں لیکن آزادی کو اگر ان معنوں میں لیا جائے کہ یہ ملکیت کے حق اور اقلیت کے حقوق کا نام ہے جو اکثریت کے جبر سے نجات دلاتی ہے..... ذاتی آزادی..... تو خطرہ ہوتا ہے کہ یہ عوامی جمہوریت بن جائے گی۔ (اقلیتوں کا نام ابتدا میں مذہبی گروہوں اور دولت مندوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو دیا گیا تھا نسلی یا لسانی گروہوں کو نہیں) ابتدائی لبرل ازم کے شباب کے دنوں میں یہ وسیع طور پر سمجھا جاتا تھا کہ اگر موقعہ دیا جائے تو غریبوں کی اکثریت یقیناً ایسے قوانین بنائے گی جو دولت مندوں کی اقلیت سے اس وقت تک دولت لیتی رہے گی جب تک یہ مساوی طور پر تقسیم نہیں ہو جاتی۔ لبرل ازم اور قانون کی حکمرانی کے لیے عوامی جمہوریت کا خطرہ ہمیشہ غالب رہا ہے۔ اسی کے نتیجہ میں ''قانون کی حکمرانی جمہوری حکومت کی بجائے شخصی آزادی کے لیے متفکر اور اس سے وابستہ رہی ہے۔ شخصی حقوق اس وقت جمہوریت کو جیت لیتے ہیں جب یہ تنازعہ میں پڑتے ہیں۔

کہا جائے گا کہ جمہوریت تو آج بھی حکمرانی کرتی ہے۔ حالانکہ شخصی حقوق کو واضح طور پر عوام کے بنائے گئے آئین ہائے ریاست میں یا مسودہ ہائے حقوق میں محدود کیا جا چکا ہے اور اس طرح کی دفعات بذات خود جمہوری قوتوں کی پیداوار ہیں۔ اس طرح کی حدود عوام کی طرف سے عوام پر خود نافذ کردہ ہیں اور خود عوام ہی انہیں (آئینی ترامیم کے تحت) ختم کر سکتے ہیں اگر اس کی خواہش کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس طرح کی قانون سازی جو حقوق کو جائز اور کامیاب بناتی ہے۔ جمہوریت دشمن نہیں لیکن یہ جواب پوری طرح مؤثر نہیں کیونکہ حقوق کے بہت سے نظریات دان' لاک سے ڈورکن تک جو اصرار کرتے ہیں کہ افراد یہ حقوق خدائی عطیہ کی حیثیت سے رکھتے ہیں انسانوں کی حیثیت سے ہمارے مرتبہ سے وابستہ ہیں یا اخلاقی کمیونٹی کے ارکان ہونے کی وجہ سے ہمارا استحقاق ہیں اور کسی آئینی شق یا قانون سازی کے مرہون منت نہیں۔

جمہوریت دشمنی کے ایک اعتراض کا ایک اور مدلل جواب یہ ہے کہ شخصی حقوق جمہوریت کی سالمیت اور بقا کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ صرف آزاد لوگ ہی جمہوریت کے حق خودارادی کو عمل میں لا سکتے ہیں۔ آزادی سب سے پہلے حق خودارادیت ہے (جمہوریت) لیکن حقیقی خودارادیت کے لیے سب سے پہلے فرد کی آزادی ضروری ہے (شخصی حقوق)۔ حقوق ملکیت' حق انجمن سازی اور حق آزادی اظہار وغیرہ یہ سب ضروری طور پر حق خودارادی کا عملی اظہار کرنے والے فرد کے لیے بنیادی شرط ہیں اور جمہوریت اسے لازم سمجھتی ہے۔ جمہوریت اس طرح جمہوریت کی عظیم تر بہتری کے لیے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شخصی حقوق کے قابو میں رہتی ہے۔ لیکن یہ بات لبرل روایت کو الٹ دیتی ہے جو تاریخی طور پر جمہوریت کو شخصی حقوق کے بعد مقام دیتی ہے۔ ''جمہوری حکومت کا وجود اور حدود صرف اس وقت تک جائز ہیں جب تک یہ افراد کی فزوں تر آزادی کی بہتر خدمت کرتی ہے۔ یہ حقیقی لبرل ریاست کی طرف پیش قدمی میں نیا اضافہ ہے۔ جمہوریت اور حقوق کے درمیان مفاہمت کی کمزوریاں یہ ہیں کہ شخصی حقوق کی مکمل فہرست اور امکان کو جمہوریت کے لیے فعال فوائد کے معنوں میں جائز قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ اس آزاد قدر کے ساتھ انصاف کرنے میں ناکام رہتی ہے جو لبرل معاشروں میں ایسے حقوق سے وابستہ ہے۔

شخصی حقوق کے متعلق اندیشوں کا ایک الگ مجموعہ یعنی غیر جمہوری پہلوؤں کا دوسرا رخ ان اختیارات سے متعلق ہے جو ججوں کو تفویض کیے گئے ہیں۔ حقوق کا اطلاق خود کار نہیں ہوتا ''کسی'' کو یہ ضرور بتانا چاہیے کہ اطلاق کے سیاق سباق میں شخصی حقوق کے معنی کیا ہیں؟ کسی نہ کسی کو ان حدود کی نشاندہی ضرور کرنا چاہیے جو قانون ساز طاقت پر نافذ کی جاتی ہیں۔ زیادہ تر مغربی لبرل جمہوریتوں میں حقوق کے حتمی اطمینان کے بارے میں حتمی بات کرنے کا اختیار ججوں کو سونپ دیا گیا ہے چاہے وہ عام عدالتوں میں بیٹھتے ہوں' آئینی موضوعات کی عدالتوں میں یا انسانی حقوق کی عدالتوں میں بیٹھتے ہوں اور ان امور پر فیصلے دیتے ہوں انہیں قانون سازی کی نظر ثانی کہا جاتا ہے۔ اگر جج منتخب نہ ہوں تو یہ اختیار ایسے افراد کے گروپ کو تفویض کیا جاتا ہے جو جمہوریت کو جواب دہ نہیں ہوتے یعنی اس قوت کو جواب دہ نہیں ہوتے جو جمہوری قانون سازی کو ویٹو کر سکتی ہے۔

کوئی چیز اس بات کا اختیار نہیں دیتی کہ حقوق کی تشریح پر حرف آخر ہونے کا محفوظ مقام عدلیہ کو بنا دیا جائے۔ اس کے برعکس یہ اختیار کسی جمہوری ادارے مثلاً پارلیمنٹ یا اس مقصد کے لیے تخلیق کی گئی نظر ثانی کی کونسل کو دینا چاہیے لیکن یہ رجحان تیزی سے دنیا میں پھیل رہا ہے کہ مذکورہ اختیار عدالتوں کو دے دیا جائے۔ مزید برآں اپنی ساخت کے اعتبار سے اکثریت دشمن ہوتے ہوئے یہ امر منطقی محسوس کرتا ہے کہ جمہوری طور پر جواب دہ کسی ادارے کو یہ اختیار نہ دیا جائے کیونکہ وہ ان کے مقصد کو ختم کر دے گا۔

اختیار کی اس تفویض سے کوئی پریشانی نہیں ابھرے گی اگر حقوق کی منشا اور نتائج

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلے سے واضح ہوں۔ لیکن پہلے بھی نشاندہی کی جا چکی ہے کہ اکثر و بیشتر ایسا نہیں ہوتا۔ اس مرحلہ پر چھٹے باب میں زیر بحث لایا گیا عدم تعین کا مسئلہ پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ اگر ججز حقوق کی منشا کے حوالے سے اپنے داخلی نظریات کو زیر غور لاتے ہیں تو نظام زیادہ دیر قانون کی حکمرانی نہیں رہے گا بلکہ اس مرد یا عورت کی حکمرانی بن جائے گا جو جج کے منصب پر فائز ہوگا۔ ایک کی جگہ دوسرا جج لایا جائے جس کے خیالات مختلف ہوں یا ایک سے زیادہ ججوں کے خیالات کو مجتمع کیا جائے تو نتائج یقیناً مختلف نکلیں گے۔ اس طرح افلاطونی سر پرستوں کے تصور کو فروغ ملتا ہے جو عام لوگوں یا ان کے نمائندوں کے ترجمان بنا دیئے جاتے ہیں۔

دفاع کرنے والے تین بڑے راستوں میں سے ایک کا انتخاب کر کے قانون کی سالمیت کو جمہوریت دشمنی اور موضوعاتی الزامات سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ قانون کے نظریات دانوں کا اصرار ہے اور یہ جمہوری رضامندی کے استدلال سے مطابقت رکھتا ہے کہ جج خواتین وحضرات حقوق کی تشریح اپنے سادہ مفہوم میں کرتے ہیں تاکہ ان کی وفاداری' اختیار تفویض کرنے والوں سے اور ان ووٹرز سے رہے جنہوں نے ان حقوق کو وضع اور منظور کیا۔ جج کا کام اقدار سے متعلقہ موضوعی سوالات کا جواب دینا نہیں بلکہ حقائق سے متعلقہ سوالات کا جواب دینا ہے کہ ان لفظوں کا مطلب کیا ہے؟ اس تشریحی سمت بندی کی بدولت جج کی داخلیت کا سدباب ہو جاتا ہے چنانچہ قانونی ضابطے حکمرانی کرتے ہیں ناں کہ جج کی ذات۔ اسی طرح شہریوں کی سیاسی آزادی جو حقوق وضع کرتی ہے اس کا سر بلند ہو جاتا ہے..... بدقسمتی سے کسی حق کے سادہ معانی جو اطلاق کے پس منظر میں دیئے گئے ہوتے ہیں اکثر اوقات اپنی بدیہی صورت سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو سادہ معانی اور اصل منشا مختلف سمتوں کا اشارہ کرتے ہیں۔ اس سوچ کے ساتھ مزید تین مسائل سر اٹھاتے ہیں۔ ادارے کے شواہد (بالخصوص ان حقوق کے حوالے سے جو ایک یا دو صدیاں پہلے قانون بنائے گئے تھے) زیادہ تر داغدار ہیں یا بالکل پائے ہی نہیں جاتے۔ ممکن ہے ان کے لیے کوئی ارادہ و منشا موجود ہی نہ ہوں (جو مسئلہ بعد میں درپیش ہے وہ قانون سازی کے وقت موجود نہیں تھا) یا پھر ایسے بہت سے ارادے ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگوں میں پائے جاتے ہوں جنہوں نے منظوری کے ووٹ دیئے۔ زیرِ موضوع مسئلہ سے براہِ راست نمٹنے کی بجائے جج خواتین وحضرات تاریخی سوالات سے الجھ جاتے اور ذہنی حالتوں کا اندازہ لگانے لگتے ہیں لیکن وہ اس کی تربیت ومہارت نہیں رکھتے۔

ایک اور حکمت عملی اس موقف کو سنبھالتی ہے جسے ڈورکن نے خطرے میں ڈال دیا تھا۔ وہ اس بات کی مذمت کرتا ہے کہ جج خواتین وحضرات مقتدر اصولوں کے لیے اپنے داخلی نظریات کے تحت نتائج اخذ کرتے ہیں اس کی بجائے انہیں کمیونٹی کے مخفی اور عیاں اصولوں کی تلاش کرنا چاہیے جو قانونی ضابطوں کے متنوع مجموعہ کے اندر جبلی اور پیدائشی ہوں۔ چونکہ ان اصولوں کا منبع کمیونٹی ہے چنانچہ اس عمل کی تاویل کرتے ہوئے ڈورکن انہیں فطری اعتبار سے جمہوری قرار دیتا ہے۔ عدلیہ مقننہ کی طرح ایک سیاسی ادارہ ہے جو سیاسی عمل میں شرکت کرتا اور اس کا عکاس ہے۔ جج خواتین وحضرات کو قدم بڑھاتے ہوئے حقوق کو نافذ کرنا چاہیے بالخصوص ایسے حالات میں جب جمہوریت نظام سیاست میں پائے جانے والے اصولوں کو ٹھیک طرح پیش کرنے میں ناکام رہ رہی ہو یا انصاف کے حصول میں ایسا ہو رہا ہو۔ اس استدلال کے مطابق جج چاہے جمہوری قانون سازی کو اس بنیاد پر کالعدم قرار دے دیں کہ یہ شخصی حقوق سے تجاوز کرتی ہے یہ عمل حقیقتاً جمہوریت کی اعانت کرے گا۔ اس دلیل کو تشکیک کی نظر سے دیکھنے والے نشاندہی کرتے ہیں کہ..... ''مذکورہ بالا دلائل کے علاوہ کہ متنازعہ اور متصادم اصول کسی تکثیریت رکھنے والی کمیونٹی میں یقیناً زیرِ گردش ہوتے ہیں یہ حقیقت موجود رہتی ہے کہ کمیونٹی کے اصولوں کے لیے جج کے نظریات کو خود اس کے اپنے اصولوں سے الگ رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ شبہ کہ جج کے ذاتی نظریات حقوق کے منشا کو متشکل کرنے میں غالب کردار ادا کرتے ہیں یقیناً توانا ہے اور اسے اس بنیاد پر دبانا مشکل ہے کہ جج اکثر اوقات ان باتوں پر باہم غیر متفق ہو جاتے ہیں جو نظریاتی بنیادوں پر استوار نظر آتی ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سپریم کورٹ کے مطالبات نے ثابت کیا ہے کہ ججوں کے ذاتی نظریات اور مختلف قسم کے ان کے فیصلوں کے درمیان بہت زیادہ باہمی تعلق پایا جاتا ہے۔ مزید برآں یہ نامناسب ہے کہ ججوں کو اس وقت جمہوری اداکار قرار دیا جائے جب اداروں کا دباؤ قانون کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکمرانی کی مدد کر رہا ہو۔ بالخصوص ایک آزاد عدلیہ ججوں کو سیاسی قوتوں سے محفوظ رکھتی ہے تا کہ وہ ایسے فیصلے کر سکیں جو مکمل طور پر قانون پر مبنی ہوں۔ یقیناً جج اگر سیاسی فیصلے کرتے ہوئے نظر آئیں تو دنیا بھر میں ان کی مذمت کی جاتی ہے۔ ڈورکن کا جواب یہ ہے کہ اس مذمت کا جواز اس وقت بنتا ہے جب ججوں کے فیصلے سیاسی ''اصول'' کی بجائے سیاسی ''پالیسی'' پر مبنی ہوں۔ سیاسی اصولوں کو وہ جمہوریت کے مطابق قرار دیتا ہے۔ تاہم اسے متعین کرنا اور مسلسل مرتب رکھنا شاید خام خیالی ہو۔

تیسرا راستہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جب حقوق کے نتائج واضح نہ ہوں تو جج کو لازمی طور پر اپنے حسن نیت کے ساتھ وہ فیصلہ کرنا چاہیے جسے وہ درست سمجھتا یا سمجھتی ہے۔ فیصلہ کی اعانت میں معقول جواز ہونے چاہئیں جو ظاہر کریں کہ تفصیہ طلب حقوق کی یہ تفسیر ہی سب سے زیادہ قابل دفاع ہے اور اس میں سب کچھ زیر غور لایا گیا ہے۔ جمہوری اختیار سے یہ ایک قابل افسوس انحراف تو ہے لیکن ایک ایسا انحراف جو ناگزیر طور پر نظام سے بے نیاز ہے۔ مفروضہ طور پر ججوں کے خیالات معاشرتی ماحول اور لیگل کلچر سے تشکیل پاتے ہیں چنانچہ فیصلے بے محل نہیں ہوتے۔ اس جواب کی خوبی عیاں ہے اور عدم تعین میں یہ عملیت پسند حل ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس قسم کے فیصلے واضح طور پر قانونی نہیں ہوتے اور ججوں کو اختیارات مختص کرنے کی موزونیت کے بارے میں نئے سوالات اٹھاتے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں راستوں میں سے کوئی ایک بھی داخلیت کے الزام کا انتہائی حوصلہ مند جواب دینے کی طرف نہیں لے جاتا کہ حقوق معروضی ہوتے ہیں چاہے وہ فطری قانون کی حیثیت سے ہوں یا درست ترین اخلاقی فلاسفی (مابعد الطبعیاتی یا فطرت پسند) کی حیثیت سے اور یہ کہ ججوں کا کام اس معروضی مفہوم کو واضح کرنا ہے۔ دو یا تین صدیاں پہلے یہ نظریہ عام تھا۔ امریکہ کا اعلان آزادی بڑے اعتماد کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے۔ ''ہم ان صداقتوں کو عیاں بالذات سمجھتے ہیں کہ تمام انسان ایک جیسے تخلیق کیے گئے ہیں اور یہ کہ ان کو خالق کائنات نے متعدد ناقابل تردید حقوق عطا کیے ہیں اور یہ کہ ان میں زندگی' آزادی اور مسرت کے حقوق شامل ہیں۔ ہم عصر فلسفہ تشکیک وشبہات جو بنتھم کے معنی خیز

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تبصرہ میں ملفوف ہے کہتا ہے کہ.....فطری حقوق بے معنی اور بیساکھیوں پر کھڑے ہیں۔ یہ فلسفہ اس راستے کو مسدود کر دیتا ہے۔ کچھ نظریات دان اس کی صورتوں کو مسلسل پیش کرتے ہیں لیکن ابھی تک کوئی بھی کامیابی کے ساتھ رضامندی/توثیق حاصل نہیں کر سکا۔ ایک مرتبہ پھر ہم اپنے آپ میں جو گومگو کی کیفیت پاتے ہیں وہ اس لیے ہے کہ قانون کی حکمرانی کے نصب العین کے مرکزی عناصر ابتدائی طور پر ان اعتقادات پر تعمیر ہوئے تھے جو زیادہ عرصہ برقرار نہ رہے۔

امریکہ اور دنیا بھر میں حقوق کے تجزیہ کا حقیقی معمول مذکورہ بالا چاروں امکانات کا ایک مرکب ہے۔ یہاں تک کہ آخری امکان جسے کبھی بھی بے تکلفی سے نہیں اپنایا گیا دراصل قابل دفاع نہیں تھا لیکن اس کے باوجود بہت سے لوگوں کے اعتقادات میں شامل ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس کی سفارش کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور رکھتا ہے۔ تاہم کوئی بھی تشکیک سے مبرا نہیں۔ جدید صورت حال ہر طور یہی ہے۔

اور آخر میں دفاع کرنے والے وثوق سے کہتے ہیں کہ حقوق کی تشریح اور جمہوری قانون سازی کے عدالتی کالعدم کے بارے میں سوالات اتنے تواتر سے نہیں ابھرتے کہ یہ افلاطونی سرپرستوں کی حکمرانی کے مترادف قرار دے دیا جائے۔ مقدمات کی اکثریت کے موازنے سے اس کا تواتر واقعی بہت معمولی ثابت ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ اس وقت بھی غیر متناسب نتیجہ برآمد کرتا ہے جب ایسے معاملات پر مسائل ابھرتے ہیں جنہیں معاشرہ بہت عزیز رکھتا ہے اور جن پر منقسم ہے۔ حکومت خود اختیاری کو اس وقت شکست ہوتی ہے جب انتہائی دل شکستہ فیصلے کوئی اور کرتا ہے۔

غالباً سب سے بڑا خطرہ خود عدلیہ کو ہے۔ یہ باور کرتے ہوئے کہ سیاست حقوق کی تشریح کا ایک ناگزیر پہلو ہے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ منقسم سماجی فیصلے کرنے کی غیر معمولی طاقت ججوں کو حاصل ہے سیاسی قوتیں ممکن ہے منظم طور پر نظریاتی لٹمس ٹیسٹ اپنائیں تاکہ ایسے امیدواروں کو عدلیہ میں متعین کیا جائے جو ان کے نظریات سے وفادار ہوں۔ اس طرح کے آثار ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی فیڈرل جیوری میں دکھائی دے رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو آگے چل کر عدلیہ مکمل طور پر سیاسی ہو جائے گی اور ایک امتیازی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قانونی ادارے کی حیثیت سے اس کی ساکھ تباہ ہو جائے گی۔ یو ایس سپریم کورٹ کے ایک رکن نے جارج بش کو صدارت کے منصب کا اہل قرار دیئے جانے کے بظاہر سیاسی فیصلے پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''ان انتخابات میں شکست قوم کے اعتماد کو ہوئی ہے جو جج کو قانونی حکمرانی کا غیر جانبدار محافظ سمجھتی ہے۔''

سیاست کی عدالت

قانون کی حکمرانی کا جدید جرمن تصور ڈرامائی طور پر جمہوریت اور شخصی حقوق کے درمیان تناؤ ظاہر کرتا ہے۔ جرمن تصور بہت سے مرحلوں سے گزرا ہے۔ ابتدا میں اس پر کانٹ کے لبرل ازم نے اثرات مرتب کیے۔ جن میں رسمی حقوق پر زور دیا گیا تھا اور جو سب کے لیے مساوی آزادی یقینی بناتے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے وسط تک اسے قانون کے ذریعے حکمرانی کے مفہوم میں سمجھا جاتا رہا۔ نازی حکومت نے قانون کے ذریعے جو ظلم و بربریت کا بازار گرم کیا اور جب قانون نازی دہشت گردی کے خلاف رکاوٹ بننے میں ناکام ہو گیا تو دوسری جنگ عظیم کے بعد قانون کی حکمرانی کے جرمن تصور میں زبردست تبدیلیاں لائی گئیں۔ اب اس کا مفہوم مختلف ہو گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنوں کے خود الزامی کے دور میں قانون کی قانونی ثبوتیت پسندی کی تفہیم کو بنیادی مجرم قرار دیا گیا جس نے ریاستی استبداد میں قانونی پیشے اور ججوں کی شرکت کو معاون بنایا۔ اگر قانون اور حقوق وہ کچھ ہیں جو ریاست کہتی ہے تو قانونی ثبوتیت پسندی قرار دیتی ہے کہ ریاستی اقدامات پر قانونی پابندیاں عائد کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

جنگ کے بعد جرمنی کے آئین (بنیادی قانون) میں تبدیلی لاتے ہوئے انتقام کے طور پر قانون کی حکمرانی میں حقوق کے بنیادی اور اثباتی اطمینان کو داخل کر دیا گیا۔ ریزر گروٹے نئی تبدیلیوں کو اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کرتا ہے۔

> ''قانون کی حکمرانی کے مستقل عناصر سے تعلق بنیادی قانون کے اہم ترین خدوخال میں سے ایک ہے۔ اس میں کچھ وسیع طور پر مسلمہ رسمی اور طریقہ کار کے پہلوؤں کو شامل کیا جائے جیسے ضابطہ پسندی کا اصول'

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عدالتوں میں منصفانہ سماعت کا حق اور مؤثر بہ ماضی فوجداری قوانین کی ممانعت وغیرہ.....تو یہ معاملہ قانون کی حکمرانی کی محض رسمی تفہیم سے آگے نکل جاتا ہے کیونکہ فرد کے احترام اور اس کے وقار کے تحفظ کو ریاست کے تمام اقدامات کے رہنما اصول کی حیثیت سے قائم کیا جاتا ہے۔ فرد کے وقار کا تحفظ بنیادی قانون کے تخلیق کردہ آئین میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ آرٹیکل نمبر 1' پیرا نمبر 2 تسلیم کرتا ہے کہ ناقابل انتقال اور مقدس انسانی حقوق ہر کمیونٹی کی اساس اور دنیا میں امن اور انصاف کی بنیاد ہیں۔ چنانچہ ان حقوق کی آفاقی اور بالائے قانون حیثیت تسلیم کر لی جاتی کہ یہ حقوق ریاست کے قیام اور سرکاری طور پر انہیں تسلیم کرنے سے پہلے بھی موجود تھے.....اور آخر میں یہ یقینی بنایا جاتا ہے کہ مرکزی ضمانتیں جو ریاست کے لبرل کردار اور اس کے وفاقی ڈھانچے کو متشکل کرتی ہیں انہیں آئندہ کسی آئینی ترمیم سے ختم نہیں کیا جا سکے گا۔ اور باتوں کے علاوہ آرٹیکل نمبر 79 بنیادی قانون میں ترامیم کا اعلان کرتا ہے جو آرٹیکل 1 اور 20 میں درج بنیادی اصولوں پر اثر انداز ہوتی ہیں اس میں انسانی وقار کا ناقابل منسوخ ہونا شامل ہے جو ہر مخصوص بنیادی حقوق کی ضمانت کے مرکزی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی بھی طرح کے حالات میں اس کی تنسیخ ناقابل قبول بناتا ہے۔ (یہ مکمل طور پر نئے آئین سے بچاتا ہے)

ایک خصوصی آئینی عدالت قائم کی گئی تاکہ شخصی قوانین کو نافذ کیا جا سکے۔ ''مختصر یہ کہ قانون کی حکمرانی بنیادی قانون کے تحت نمودار ہوتی ہے۔ بنیادی حقوق کے تصور کے اختصار کی حیثیت سے جس کی تکمیل سیاسی قوت کسی پارلیمانی جمہوریت کے فریم ورک میں کرتی اور عدلیہ کے لیے ایک طاقتور کردار ممکن بناتی ہے۔''

یہ خدوخال شخصی حقوق کا تحفظ قانون کی حکمرانی کے تصور میں شامل کرتے اور مقننہ کی دسترس سے باہر نکالتے ہیں۔ یہاں تک کہ وقار کے حق کو آئینی ترمیم کی زد سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دور لے جاتے ہیں۔ یہ اعلان کہ حقوق آئینی توثیق سے ماورا ہیں' قانونی ثبوتیت پسندی کی گوشمالی ہے جو حقوق کو قانون سازوں اور جمہور سے بالاتر قرار دیتی ہے۔ اب اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ مقننہ کے اختیار اور حکومت کے اقدامات پر عائد پابندیاں ایک معمول ہے۔ سوال صرف ان پابندیوں کی منشا اور اطلاق کے بارے میں پائے جاتے ہیں۔ عملی طور پر یہ تعمیر فطری قانون کی حدود وقیود کی ایک شکل کو اس کی مذہبی بیساکھیوں کے بغیر زندہ کرتی ہے۔ یہ قرون وسطیٰ کی قانون کی حکمرانی کے فہم کو حیات نو دیتی ہے اور قوت نافذہ عدلیہ کو سونپتی ہے۔

اس سوچ سے برآمد ہونے والے صرف دو نتائج متعلقہ ہوں گے۔ پہلا یہ ہے کہ عزت نفس کا حق خاص طور پر ججوں نے آئینی عدالتوں میں مشکوک قرار دیا ہے۔ ان کے جائزے میں ہر طرح کے موضوعات اور حکومت پر منفی اور مثبت دونوں قسم کے فرائض کی پابندی شامل تھی۔ ایک مرتبہ پھر عدم تعین کا مسئلہ پرشور سوالات اٹھاتا ہے کہ جج کس طرح ایسے حقوق کی منشا اور نتائج کا تعین اطلاق کے مواقع پر کرے گا۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے سیاسی تنازعات آئینی سوالات میں تبدیل ہو چکے ہیں مثلاً یہ کہ جرمنی میں سیاست کو نمایاں طور پر عدالتی رنگ دے دیا گیا ہے۔'' حقوق کے اس پھیلاؤ کا اثر یہ ہوا ہے کہ پارلیمنٹ کے قانون سازی کے اختیار میں کمی آ گئی ہے۔ قانون کی حکمرانی کے اس فہم کے ذریعے سیاست کی قلمرو' جمہوریت کی دسترس' کو عدالتی اختیار کے حق میں اسی کے ذریعے محدود کر دیا گیا ہے۔

یہ صورتحال کسی بھی طرح محض جرمنی تک محدود نہیں۔ ''پورے یورپ میں قومی اور برتر قومی عدالتوں نے اہم اور متنازعہ سماجی سوالات کا فیصلہ کرنے میں زیادہ فعال کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے بالخصوص ایسے سوالات جن کا فیصلہ ماضی میں عموماً حکومتیں کیا کرتی تھیں۔ متعدد سابقہ کمیونسٹ یورپی ممالک میں ججوں نے جارحانہ انداز میں قانون کی حکمرانی کے اثباتی فہم کے نام پر قانون سازی کو کالعدم قرار دے دیا ہے۔ اضافی طور پر پُراعتماد عدالتیں سیاسی پیچیدگی کے ساتھ فیصلے کرتی ہوئی اب تیزی سے لاطینی امریکہ میں بھی نظر آ رہی ہیں۔ آج دنیا بھر میں آئینی عدالتوں کے ذریعے قانون سازی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی عدالتی نظر ثانی کو اپنانے کی لہر پر سوار عدالتی اختیار ایک عالمی رجحان بن چکا ہے۔

جب یہ استبدادی اداروں کے ناجائز استعمال کی قیمت پر رونما ہوتا ہے تو اس معاملے کو کم خطرناک ہونا چاہیے لیکن جب یہ جمہوری اداروں کی قیمت پر ہوتا ہے یا جب عدلیہ میں غیر متناسب تعداد میں سماجی اقتصادی اشرافیہ کے ارکان ہوں یا دیگر غیر نمائندہ ذیلی گروہوں سے تعلق رکھنے والے ارکان ہوں تو سیاسی آزادی کی خود اختیاری حکمرانی کے لیے سنگین خطرات لاحق کر دیتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ عدلیہ کے ایسے اختیارات بذات خود قانون کی حکمرانی کے لیے تباہ کن ہوتے ہیں کیونکہ جب عدلیہ بہت زیادہ سیاسی رنگ رکھتی ہو' خارجی دباؤ سے خوفزدہ ہو' ذاتی یا گروہی ایجنڈوں پر کاربند ہو' بدعنوانی یا پھر مہارت اور تجربہ کا فقدان رکھتی ہو تو پھر اختیارات کے نتائج ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔

رسمی ضابطہ پسندی' جمہوریت اور شخصی حقوق

باوجود یکہ مذکورہ بالا کشیدگیاں ان میں پائی جاتی ہیں لیکن جب قانون کی حکمرانی کا جملہ کہنے یا سننے میں آتا ہے تو یہ بات طے شدہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں جمہوریت اور شخصی حقوق رسمی ضابطہ پسندی کے ساتھ شامل ہیں۔ اس مجلس ثلاثہ کی ضرورت اس تصور میں نظریاتی طور پر ناگزیر نہیں۔ یہ عناصر لبرل جمہوریتوں میں ایک متحدہ تکمیلی پیکج کی طرح ہوتے ہیں۔ قانون کا انگریز نظریہ دان' ٹی آر ایس ایلن' قانون کی حکمرانی کے اپنے بھرپور بنیادی تصور کی طرف سے درج ذیل بحث کرتا ہے۔

> ''قانون کی حکمرانی کی اصطلاح سن کر لگتا ہے کہ اس سے مراد بنیادی طور پر کچھ اساسی اصولوں اور اقدار کا مجموعہ ہے جو باہم مل کر قانونی نظام کو کچھ استحکام اور پیوستگی مہیا کرتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی معیارات' توقعات اور خواہشات کا ایک ملغوبہ ہے۔ یہ شخصی آزادی اور فطری انصاف کے روایتی تصورات پہ محیط اور عمومی طور پر حکومت اور عوام کے درمیان تعلقات میں انصاف اور غیر جانبداری کے تصورات کی ضروریات پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ اثباتی نہیں ہو سکتے اور طریقہ کار کی شفافیت آسانی سے دیکھی جا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتی ہے۔ان میں سے ہر ایک شخصی عزت نفس کے احترام کی تمہید ہے۔''

قانون کی حکمرانی کا تصور پیچیدگی کے ساتھ متعدد بنیادی ادارہ جاتی انتظامات سے منسلک ہے۔مساوات کا بنیادی عقیدہ جو انصاف اور شفاف پن کے ہمارے عقائد کے قریب تر ہے' قانون سازی کے عمل میں تمام بالغ شہریوں کی مساوی آواز کا تقاضا کرتا ہے۔ عالمی حق رائے دہی کو آج قانون کی حکمرانی کے مرکزی ستون کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔''

ایلن نے اپنے تصور کو قانون کی حکمرانی کے برطانوی مفہوم تک محدود کیا ہے لیکن یہ وسیع تر نقطۂ نظر کا نمائندہ ہے۔اس کی تصدیق 1990ء میں کانفرنس آن سیکیورٹی اینڈ کوآپریشن ان یورپ کانفرنس کے اعلامیہ میں سامنے آئی۔اس کانفرنس میں یورپ کے چھتیس ممالک کے علاوہ امریکہ اور کینیڈا کے نمائندوں نے شرکت کی۔اعلامیہ کے مطابق ''قانون کی حکمرانی کا مطلب محض رسمی ضابطہ پسندی نہیں جو جمہوری نظام کے حصول اور نفاذ میں باقاعدگی اور تسلسل کی ذمہ داری لیتی ہے۔ بلکہ انسانی شخصیت کی اعلیٰ تر قدر کی مکمل قبولیت پر مبنی انصاف ہے جن کی ضمانت ادارے اس کے مکمل ترین اظہار کے فریم ورک کے ساتھ دیتے ہیں..... جبکہ..... جمہوریت قانون کی حکمرانی کا ایک جبلی عنصر ہے۔

رسمی ضابطہ پسندی قانون کے نظریات دانوں میں قانون کی حکمرانی کی غالب تفہیم ہے۔ یہ ٹھوس اثباتی قانون کی حکمرانی جس میں رسمی ضابطہ پسندی' شخصی حقوق اور جمہوریت شامل ہوتے ہیں' مغربی معاشروں میں قانون کی حکمرانی کے عمومی مفہوم کے قریب تر ہے۔(یہ تصور کرتے ہوئے کہ عمومی اور مشترکہ مفہوم پایا جاتا ہے)۔وسیع تر رائے اس مقابلہ میں ایک وزنی عامل ہے کہ ایک نصب العین کیا پیش کرتا ہے۔اس بات سے قطع نظر کہ نظریات دان اس پر اصرار کرتے ہیں کہ عوامی مفہوم الجھن کا شکار ہے۔

ایک سبق رسمی ضابطہ پسندی' شخصی حقوق اور جمہوریت کے یکجا ہونے سے لیا جاسکتا ہے۔شخصی حقوق کے جمہوریت دشمن نتائج اس کے دونوں رخوں میں' خوفناک ہونے کے باوجود سماجی اور سیاسی قوتوں کے بہاؤ میں کامیابی کے ساتھ توازن میں لائے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جا سکتے ہیں۔ جب عدالتیں شخصی حقوق کے تحفظ کے نام پر جمہوری قانون سازی کو بہت زیادہ کچل دیتی ہیں تو ان کا طرز عمل ایک جوابی حملہ کی صورت میں نکل سکتا ہے جو تیزی سے عدلیہ کو اپنی رویہ میں محتاط کر دیتا ہے۔ اس کی ایک بدنام زمانہ مثال 1930ء کے عشرہ کی امریکی سپریم کورٹ ہے۔ اس نے سوشل ویلفیئر پر مبنی قانونی سازی کا لعدم قرار دے دی۔ یہاں تک کہ امریکی صدر روز ویلٹ نے عدالت کو وسیع کرنے کے لیے حسب ہدایت کام کرنے والے ججوں کی اضافی تقرری کی تجویز پیش کر دی۔ یہ عدالت کو بھرنے والی تجویز کانگریس کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہی لیکن عدالت نے صورت حال بھانپ لی اور اپنا طرز عمل بدل لیا۔ اگرچہ بعد کے واقعات نے اس معاملہ کو پسندیدہ رنگ دے دیا یعنی جمہوری عزم کامیاب ہوا اور عدالتی انتہا پسندی میں عملیت پسندی غالب آ گئی لیکن اس نے خطرات کی نشاندہی کر دی۔ مختلف حالات کے تحت عدالتوں پہ جمہوریت دشمن نتائج کے ساتھ دباؤ ڈالا جا سکتا ہے اور ہر دفعہ ایسا دباؤ کامیابی کے ساتھ قانونی عمل کی سالمیت کے لیے خطرہ بنتا ہے یا خطرہ کو مزید بڑھاتا ہے۔

ایک مؤثر توازن کے حصول کے لیے کوئی اکلوتا فارمولا نہیں ہے۔ کم از کم سطح پر طاقتور فعال عوام ہونا چاہئیں جو حکومتی عمال پر گہری نظر رکھیں جو شخصی حقوق اور جمہوریت کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے پر تیار ہوں اور یہ سوچ رکھتے ہوں کہ حکومت سمیت ہر ایک قانون کی پابند ہے۔ ایک مستحکم قانونی روایت بھی ہونی چاہیے جو قانون کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے وقف ہو۔ اسے تسلیم ہو کہ قانونی ضابطوں کی تشریح' استعمال اور اطلاق اس کا مخصوص مشن ہے اور اس دوران اس عہد سے وابستہ ہو کہ کسی جمہوری معاشرے میں قانونی ضابطوں کی تدوین صرف اور صرف سیاسی شعبہ کا کام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومتی عمال ان تصورات پر لازمی طور پر یقین رکھتے ہوں اور اسے فرض سمجھیں۔

اس انداز میں قانون کی حکمرانی کو سمجھنے پر سخت ترین اعتراض یہ ہے کہ رسمی ضابطہ پسندی' جمہوریت اور شخصی حقوق کو باہم پیوست سمجھنے والے اکثر اوقات اس کی بنیاد کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اسے قانون کی حکمرانی کے ضروری یا جبلی معنی کے طور پر جائز نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرار دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس ان لفظوں کا یہ ایک عمومی مفہوم ہے جو اس لیے مستحکم ہوا کہ مذکورہ تینوں عناصر مل کر مغربی لبرل جمہوریتوں میں کام کرتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی کا یہ مفہوم ضروری طور پر ہر جگہ موجود نہیں ایسے معاشرے جہاں ان عناصر کا پیکج نہیں پایا جاتا انہیں ہدایت نہیں دی جا سکتی کہ قانون کی حکمرانی کے مطابق رہنے کے لیے رسمی ضابطہ پسندی' جمہوریت اور شخصی حقوق کے مکمل پیکج پر لازمی طور پر عملدرآمد کریں۔ موجودہ زمانے کے حوالے سے اس کی دو نمایاں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً چین میں جمہوریت کے بغیر ضابطہ پسندی پر عمل ہو رہا ہے اور ایران میں انسانی حقوق کے بغیر۔

دبیز ترین اثباتی صورتیں

قانون کی حکمرانی کی دبیز ترین اثباتی صورتیں رسمی ضابطہ پسندی' شخصی حقوق اور جمہوریت تو بہر طور رکھتی ہیں لیکن ان کے ساتھ وہ ایک اضافہ معیاری جہت بھی رکھتی ہیں جسے سوشل ویلفیئر رائٹس یا سماجی بہبود کے حقوق کا نام دیا جاتا ہے۔ 1959ء میں انٹرنیشنل کمیشن آف جیورسٹس نے قانون کی حکمرانی کا مطلب کے موضوع پر ایک کانفرنس کی تھی۔ اس کے اعلامیہ کا ایک اقتباس ہمارے موضوع کے لیے ایک عمدہ حوالہ ہے:

> ''انقلابی تصور'' جو قانون کی حکمرانی کی نام سے اعلان دہلی میں شامل کیا گیا' بلاشبہ کسی آزاد معاشرے میں فرد کے شہری اور سیاسی حقوق کو تحفظ اور فروغ دیتا ہے۔ لیکن اس کا تعلق سماجی' معاشی' تعلیمی اور ثقافتی حالات کے قیام سے بھی ہے جن کے تحت فرد کی جائز خواہشات اور عزت نفس کی تعبیر ممکن ہوتی ہے۔ آزادی اظہار رائے کسی اَن پڑھ کے لیے بے معنی ہوتی ہے۔ حق رائے دہی بے راہ رو ہو کر استبداد کے ایک ایسے آلے میں تبدیل ہو سکتا ہے جسے جذبات سے کھیلنے والے مقرر' متعصب اور تنگ نظر رائے دہندگان کے ذریعے استعمال کر سکتے ہیں۔ حکومتی مداخلت سے آزادی کا مطلب غریب اور محروم کو فاقوں مارنے کی آزادی نہیں ہونا چاہیے۔''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ کلاسیکل لبرل نقطۂ نظر حکومتی استبداد کو روکنے کے جنون کے ساتھ ایک منفی دباؤ بھی رکھتا ہے جس کے تحت حکومت پر حدود و قیود نافذ کرتا اور فرد کو اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی آزادی دیتا ہے۔ سماجی بہبود کے تصور میں قانون کی حکمرانی حکومت پہ فرض عائد کرتی ہے کہ لوگوں کی زندگی بہتر بنائے' ان کے لیے آسانیاں پیدا کرے جس میں تقسیمی انصاف کا ذریعہ بھی شامل ہے۔ اس تصور کی ایک صورت چھٹے باب میں دی گئی ہے جب تجویز کیا گیا تھا کہ آزادی کے حق کی خودمختاری کا مطلب حکومت کو یہ فریضہ سونپا ہونا چاہیے کہ وہ فرد کی خودمختاری کی صلاحیت میں اضافہ کرے۔ جرمن تصور اس سمت میں جزوی قدم اٹھاتا ہے جس میں وہ عزت نفس کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔

یہ خواہشات زبردست تو ہیں لیکن انہیں حکمرانی کے تصور میں شامل کرنا بہت سی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ شخصی حقوق میں اور حقوق اور جمہوریت کے درمیان پہلے ہی بہت سے شدید تنازعات موجود ہیں۔ ان میں سماجی بہبود کے حقوق شامل کرنا بنیادی تنازعات میں اضافہ کر دے گا۔ بالخصوص ذاتی آزادی اور اثباتی مساوات میں محاذ آرائی شروع ہو جائے گی۔ راز قانون کی حکمرانی کے اس پُرتکلف تصور کی مخالفت اس وجہ سے کرتا ہے کہ ''اس کی نوعیت کی وضاحت کرنے کے لیے ایک پوری سوشل فلاسفی بیان کرنا پڑتی ہے۔'' سماجی اقدار پر ہونے والی بحثیں قانون کی حکمرانی کے معنی کے حوالے سے لڑائیوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ اس طرح قانون کی حکمرانی کا تصور وسیع تر سماجی مسائل کے بارے میں ایک تنازعے کے لیے نیابتی میدان جنگ کا کردار ادا کرتا ہے۔ ان مسائل کو بھرپور غور و فکر کے راستے سے ان کی شرائط پر ہٹانا اور اس عمل کے دوران قانون کی حکمرانی کو کسی مخصوص معانی سے خالی کرتا ہے۔

قانون کی حکمرانی ہر اس اچھی چیز کے بارے میں نہیں ہو سکتی جس کی خواہش لوگ حکومت سے کرتے ہیں۔ اس انداز میں اسے پڑھنے کی مستقل تحریص قانون کی حکمرانی کی علامتی طاقت کو صحیفہ سمجھنا ہے' لیکن اس تحریص سے بچنا ضروری ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

9

تین تصورات

قانون کی حکمرانی کے تصور کے اردگرد موجود تاریخ' سیاست اور نظریات کی کھوج نے تسلسل اور تبدیلی کی ایک کہانی پیش کی ہے۔ اس میں مشترکہ مفاہیم بھی ہیں اور تیکھے تنازعات بھی۔ مزید برآں قانون کی حکمرانی کے ہر نظریہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چاہے وہ رسمی ہیں یا اثباتی۔ اور جو سنگین اعتراضات اٹھاتے ہیں یا تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی توقع کسی بھی ایسے تصور سے کی جاسکتی ہے جو دو ہزار برسوں سے زندہ ہو اور جو مختلف پس منظروں میں ایک مرکزی کردار ادا کر رہا ہو۔ اس کا یہ تسلسل قرون وسطیٰ کی جدوجہد سے جاری ہے جو بادشاہوں اور پوپ کے درمیان کشاکش کے دوران ابھری اور سوشلزم اور لبرل ازم کے درمیان عالمی مقابلہ تک موجود ہے۔ یہ کہنا غلط بیانی ہوگی کہ اس موضوع میں ایک بالائی ربط اور پیوستگی پائی جاتی ہے۔ عدم اتفاق بہرحال موجود ہے کہ قانون کی حکمرانی کے درست ترین معانی کیا ہیں۔ اس جملہ کو نظریات دان اور حکومتی عمال بے تکلفی سے استعمال تو کرتے ہیں لیکن یہ اصل میں ہے کیا؟ بے قابو غیر یقینیت کا خطرہ یہ ہے کہ قانون کی حکمرانی محض ایک کھوکھلے جملے میں تبدیل ہو کر نہ رہ جائے۔ معانی کا یہ فقدان کینہ پرور حکومتوں کی بریت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

قانون کی حکمرانی کی بہت سی تعریفیں اس کتاب میں دی گئی ہیں۔ ایک اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا اضافہ محض اس امید میں کرنا کہ یہ میدان مار لے گی' بھدے پن اور سادہ لوحی کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ یہ راستہ اپنانے کی بجائے اس باب میں ہم ان تین مانوس تصورات کو زیر بحث لائیں گے جو قانون کی حکمرانی کی روایت کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہیں اور پھر گزشتہ باب تک کی جانے والی کھوج سے حتمی نتائج اخذ کریں گے۔ انہیں یہاں تصورات یا معانی کے خوشے کہا گیا ہے کیونکہ یہ باہم تعلق بھی رکھتے ہیں اور واقعتاً کم و بیش ناقابل تقسیم بھی جبکہ مخصوص خیالات کے گرد گھومتے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنا ایک مخصوص جھکاؤ رکھتا ہے۔ ان تصورات پہ توجہ مرکوز کرنا متعدد معلوماتی نتائج کی طرف لے جاتا ہے' بالخصوص لبرل اور نان لبرل تقسیم کے ساتھ آگے چلتا ہے۔ اگلا باب بین الاقوامی سطح پر قانون کی حکمرانی کا جائزہ لیتا ہے جس میں مزید ثابت ہوگا کہ یہ تین تصورات تجزیاتی فریم ورک میں کتنے مفید ہیں۔

قانون کے تحت محدود حکومت

قانون کی حکمرانی کی وسیع تر تفہیم' ایک ایسی ڈور جو دو ہزار سال سے بندھی چلی آ رہی ہے' اکثر اوقات اسے کمزور کیا گیا لیکن مکمل طور پر کبھی توڑا نہیں گیا' یہ ہے کہ مقتدر اعلیٰ' ریاست اور اس کے حکام قانون کے تحت حدود و قیود میں ہیں۔ اس خیال کے پیچھے موجود خواہش شخصی آزادی کو محفوظ کرنا نہیں بلکہ حکومت کے استبداد پہ قابو پانا تھا۔ مقتدر اعلیٰ کے جبر و استبداد پہ قابو پانے کی جدوجہد دائمی ہے۔ یہ اس وقت بھی موجود تھی جب شخصی آزادی کا نظریہ معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ قانون کی حکمرانی کا یہ مفہوم لبرل ازم کی فتح تک غالب رہا۔ پھر سارا زور رسمی ضابطہ پسندی پہ دیا جانے لگا۔

دو مخصوص مفہوم اس تصور کے بارے میں پائے جاتے ہیں جنہیں حکومتی عمال کو قانون کے محدود فریم ورک کے اندر ضرور زیر عمل لانا چاہیے۔ پہلا مفہوم یہ ہے کہ عمال کو رواں جائز وضعی قوانین کی ہر صورت میں اطاعت کرنا چاہیے۔ قانون کو مناسب طور پر بااختیار حکام تبدیل کر سکتے ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب سرکاری حکام قانون میں تبدیلی کرنا بھی چاہیں تو وہ ایسا اپنی مرضی سے کرنے میں آزاد نہیں ہیں۔ ان کی قانون سازی کے اختیار پر پابندیاں ہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو وہ قانون کے نام پر یا اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بغیر نہیں کر سکتے۔ یہ پابندیاں فطری یا الوہی قانون کے معنوں میں سمجھی جاتی ہیں۔ یا پھر انہیں وقت سے مبرا رواجی قانون سمجھا جاتا ہے جو قرون وسطیٰ میں غالب نظریات تھے۔ اب انہیں انسانی یا شہری حقوق کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ آج کل اس طرح کے جملوں کا استعمال بہت عام ہے۔ اس دوسرے مفہوم کا بنیادی نتیجہ یہ ہے کہ مقتدر اعلیٰ کا اختیار وضعی قانون پہ بذات خود قانونی معنوں میں محدود ہو گیا ہے۔

اس نظریہ کا معمہ کہ مقتدر اعلیٰ قانون کے ذریعے محدود ہے' یہ ہے کہ کس طرح وہی قوت جو قانون تخلیق اور نافذ کرتی ہے قانون کے ذریعے محدود کی جا سکتی ہے؟ مختلف الخیال نظریات دان مثلاً ایکناس اور ہابس کا خیال ہے کہ قانون کی حکمرانی اس مفہوم میں ناممکن ہے' کم از کم نظریاتی طور پر تو ایسا ہی ہے۔ اگر قانون کا اعلان و اجرا مقتدر اعلیٰ کے ذریعے ہوتا ہے تو پھر مقتدر اعلیٰ کو قانون کے ذریعے محدود و پابند نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا مطلب ہو گا کہ مقتدر اعلیٰ خود کو پابند کر رہا ہے..... لیکن جو خود کو از خود پابند بناتا ہے وہ حقیقتاً پابند نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ کہ قانون کو کس طرح محدود کیا جائے اس فرد یا گروہ کے حوالے سے ابھرتا ہے جس کو قانون بنانے اور نافذ کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ مقتدر اعلیٰ بادشاہ ہو یا پارلیمنٹ از منہ جدید سے پہلے کے وقتوں میں یہ معمہ صرف حکومت کے محدود ہونے کے پہلے فہم سے وابستہ تھا۔ خاص طور پر اس لیے کہ ریاست قانونی پابندیوں کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ فطری قانون اور رواجی قانون اس کی قانون سازی کی صلاحیت پر پابندیاں عائد کرتے تھے اور پھر نفاذ بذات خود ریاست نہیں کرتی تھی بلکہ اسے خدا پر چھوڑ دیا جاتا تھا یا عوامی انقلاب پر (حق مزاحمت)۔ جدید دور میں جبکہ پابندی رائج حقوق کی صورت میں آتی ہے یہ معمہ محدود کرنے کے دونوں مفاہیم میں پایا جاتا ہے۔

جدید دور سے پہلے بادشاہوں اور حکومتی عمال کو قانون تین طریقوں سے پابندیوں میں جکڑتا تھا۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ بادشاہ واضح انداز میں قبول یا تسلیم کرتا تھا کہ قانون ایک لازمہ ہے (لیکن وہ قانون کو یہ درجہ ہمیشہ رضا کارانہ طور پر نہیں دیتا تھا)۔ اس کا مظاہرہ تخت نشینی کے وقت بادشاہ حلف برداری کے دوران کرتے تھے۔ مخصوص حلف بادشاہوں کو پابند بناتا تھا کہ وہ الوہی' وضعی اور رواجی قوانین کی اطاعت کریں گے۔ مسلمہ قانونی حدود و قیود کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک صورت میگنا کارٹا تھی۔ اس میں بادشاہ جان پابند ہونے پر راضی (یا مجبور) ہوا تھا۔ بعد میں اور بہت سے انگریز بادشاہوں نے اس دستاویز سے اپنی وابستگی کا اعادہ کیا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ..... یہ وسیع طور پر سمجھا اور مانا جاتا تھا کہ بادشاہ اور حکومتی عمال ان قوانین کے فریم ورک کے اندر کام کرتے ہیں جو سب پر نافذ ہوتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال جرمنی کا رواجی قانون تھا۔ بادشاہ کے بارے میں سب سمجھتے تھے کہ وہ اس قانون کی حدود میں رہتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے مسیحی غلبہ کے دوران ہر ایک بشمول بادشاہ یہ سمجھتا تھا کہ (الوہی) بادشاہ فطری اور الوہی قانون کی پابندیوں کے اندر کام کرتا ہے۔ سرکاری طرز عمل کے بارے میں دعوے اور استدلال باقاعدگی سے معاشرے کے سبھی گروہوں کی طرف سے قانونی اور غیر قانونی اصطلاحوں میں الوہی (خدائی)' رواجی یا وضعی قانون کے مطابق زیر بحث آتے تھے۔

تیسرا طریقہ معمول کے طرز عمل کا معاملہ تھا جس میں عام سرگرمیوں کی انجام دہی بادشاہ اور حکومتی عمال عام لوگوں کی طرح قانونی پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے کرتے تھے۔ (اگرچہ اکثر و بیشتر اپنی پسندیدہ شرائط پر ایسا کرتے تھے)۔ یہ تیسرا طریقہ گزشتہ دونوں طریقوں کی تکمیل اور تسخیر کرتا تھا۔ لیکن باضابطہ دنیاوی مطابقت کے وزن کا الگ سے حامل تھا۔ ایک بادشاہ یا سردار جسے جاگیر کے عوام سے ٹیکس یا خدمات لینے کا اختیار ہوتا تھا' اس کے ذمہ بھی کچھ فرائض تھے جنہیں پورا کرنا ضروری تھا۔ بادشاہ یا سرکاری عمائدین جو قرضہ لینے کے خواہشمند ہوتے تھے انہیں معاہدے کے مطابق رہنا پڑتا تھا' اسی صورت میں انہیں آئندہ قرضہ ملنے کی امید ہوتی تھی۔ بادشاہ تو نہیں البتہ سرداروں اور نوابوں کو ذمہ داریوں سے غفلت برتنے پر عدالتی کارروائی کے دوران جواب دہ ہونا پڑتا تھا۔ سرکاری اور ذاتی کا فرق ابتدائی ادوار میں زیادہ نمایاں نہیں تھا۔ چنانچہ مخفی پیغام یہی ہوتا تھا کہ بادشاہ اور حکومتی عمال کو روزمرہ امور ایک قانونی فریم ورک کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دینا ہوں گے چاہے ان کا مقام و مرتبہ کچھ بھی ہو۔

ان تینوں طریقوں نے نظریئے اور عمل کا ایک طاقتور امتزاج مہیا کیا۔ پہلے طریقے میں مقتدر اعلیٰ اور عمال حکومت نے خود کو قانون کا پابند بنایا۔ اگرچہ ابتدائی طور پر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ دعویٰ موقعہ پرستی کے تحت کیا گیا۔ پھر صدیوں کی تکرار سے یہ حقیقی صورت اختیار کر سکا۔ وہ خود کو قانون کا پابند محسوس کرتے تھے چنانچہ وہ قانون کے پابند تھے۔ دوسرے طریقہ میں معاشرہ کا ہر فرد یہ مشترکہ عقیدہ رکھتا تھا کہ حکومت کے عمال قانون کے پابند ہیں۔ اسی بات نے حکومتوں اور عمال کی تبدیلی کے باوجود یہ تصور یقینی بنائے رکھا۔ تیسرے طریقہ نے روزانہ توثیق اور اعادہ کو ممکن بنایا کہ مقتدر اعلیٰ' امرا اور عمال قانون کے پابند ہیں۔ ان ذرائع کی وجہ سے قانونی حدود کے اندر کام کرنا حکومت کے عمال کے طرز عمل کی جائز حیثیت کا ذریعہ بن گیا۔ برسر اقتدار حکومتوں کی مخالفت چاہے یہ پاپائیت کی طرف سے تھی' مخالفین جو عیاری سے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنا چاہتے تھے' نافرمان اشرافیہ جو ذاتی خدمت کے حوالے سے زر بدل کی مزاحمت کر رہے تھے' تاجر جو اپنی سرگرمیوں کو مداخلت یا جبری وصولی سے بچانا چاہتے تھے یا پھر عوام جو انقلاب چاہتے تھے ان سب کو اپنی مزاحمت اور مخالفت کا جواز مل گیا تھا۔ امریکی اعلان آزادی اسی پس منظر میں ایک تاریخی مثال کی حیثیت سے انگلستان کے بادشاہ کے خلاف قرارداد جرم کی فرد بن گیا۔

ایک تشکیک درست طور پر اصرار کرے گی کہ اکثر اوقات بادشاہوں نے اپنے حلف کی پروانہ کرتے ہوئے اور اس تصور کی عمومی تفہیم کو نظر انداز کرتے ہوئے قانون کی پابندی نہیں کی۔ جب ایک مقصد کسی مقتدر اعلیٰ کے لیے نہایت اہم تھا تو پھر قانون کو راستے کی معمولی رکاوٹ کیوں سمجھا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس اکثر و بیشتر قانون ہی ان کے ہاتھوں میں ایک ایسا ہتھیار تھا جس کے ذریعے انہوں نے اپنے مقاصد حاصل کیے۔ ججوں نے اس کے لیے آسانیاں فراہم کیں جو بادشاہوں کے وفادار تھے یا ان سے خوفزدہ تھے۔ یہ سب کچھ درست تھے لیکن بلاشبہ مقتدر اعلیٰ اور حکومتی عمال قانون کے اندر رہتے ہوئے کام کرتے رہے تھے۔ جب بھی انہوں نے قانون کو نظر انداز کیا' اپنے اقدامات کی قانونی حیثیت ثابت کرنے کے لیے تاویلیں پیش کیں۔ اس طرح کے حکمران اگرچہ اپنے ذاتی مفادات کے لیے قانون کی پابندیوں کے سامنے جھکتے رہے لیکن اس سے یہ حقیقت باطل نہیں ہوتی کہ قانونی پابندیاں بہرحال اہمیت رکھتی ہیں۔

اگرچہ مقتدر اعلیٰ اور اس کے عمال باقاعدگی سے قانون کے مطابق عمل درآمد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے رہے لیکن یہ بھی ذہن میں رہے کہ بہت سے امور میں قانون کی خلاف ورزیوں کا کوئی قانونی حل بھی موجود نہیں تھا۔ جب بھی مقتدر اعلیٰ یا حکومتی عمال نے قانون کو پس پشت ڈالا انہیں اس کی سیاسی قیمت ادا کرنا پڑی۔ مثلاً برادری یا کمیونٹی سے خارج کرنے کی دھمکی (جس کے سیاسی نتائج بھی مرتب ہوتے تھے) یہی وہ ذریعہ تھا جس کو پاپائیت بادشاہوں کے خلاف خدائی قوانین نافذ کرنے کے لیے استعمال کرتی تھی' بغاوت کا خطرہ ہی جرمن رواجی قانون کے نفاذ کا عامل تھا۔ کچھ بادشاہوں کے لیے بہرحال یہ خطرہ بہت دھندلا تھا کہ وہ معزول یا قتل کر دیئے جائیں گے۔ قانون کی خلاف ورزیوں کے الزامات ایک ہیجان انگیز ذریعہ تھا جو شاہی اقدامات کی مخالفت کرنے والوں کو عوامی حمایت حاصل کرنے میں مدد دیتا تھا۔ اس طرح کے واقعات میں بادشاہ یا مقتدر اعلیٰ کے خلاف قانون کے نفاذ کی منظوری قانونی نہیں سیاسی ہوتی تھی (کیونکہ مقتدر اعلیٰ تو خود قانون کا منبع ہوتا تھا)۔

حکومتی عمال پر قانونی حدود و قیود کے دو مختلف مفاہیم جن کی نشاندہی اس باب کے شروع میں کی گئی' مختلف انداز میں روبہ عمل آتے ہیں۔ ان دلائل کے باوجود کہ یہ منطقی طور پر یا نظریاتی طور پر ناممکن ہے' وضعی قانون کی خلاف ورزیوں پر مقتدر اعلیٰ اور حکومتی عمال کے برخلاف قانونی پابندیاں نافذ کرنے کے عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ (پہلا قدم)۔ ڈائسے انگلستان میں قانون کی حکمرانی کے لیے اس چیز کو سب سے بڑا معاون قرار دیتا ہے کہ قانون کی خلاف ورزی پر حکومتی عمال کو عام شہری جواب دہی کے لیے عام قانون کی عدالت میں لا سکتا ہے۔ اس طرح کی پابندی کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ عدلیہ بقیہ حکومتی مشینری سے آزاد ہو۔ معمہ کا یہ حل ریاستی مشینری کو تقسیم اور الگ کرتا ہے۔ ایک حصہ یعنی عدلیہ کو صلاحیت دیتا ہے کہ وہ دیگر حصوں کو قانونی بنیادوں پر جواب دہ بنائے۔ اگر اس فہم کو مؤثر اور قابل عمل بنانا ہے تو عدلیہ کی خودمختاری اور فیصلوں کا احترام کرنا پڑے گا۔

اس فہم کی کامیابی کے بارے میں شکوک و شبہات کے باوجود یہ مؤثر طور پر کام کر سکتا ہے اور اس کا ثبوت دنیا کے مختلف معاشروں میں روزانہ ہمارے سامنے آ رہا ہے۔

مقتدر اعلیٰ کے قانون سازی کے اختیار پہ قانونی حدود و قیود عائد کرنا (دوسرا فہم) مکمل طور پر ایک الگ معاملہ ہے۔ حدود و قیود کا یہ دوسرا فہم پہلے سے زیادہ اولوالعزم ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومتی عمال پہلے فہم کی قانون پابندیوں کو ایسے قوانین میں ترامیم کر کے دھوکہ دے سکتے ہیں جو ان کے مطلوبہ مقاصد کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ دوسرا فہم قانون سازوں کی استعداد پر اس طرح کی پابندیاں عائد کرتا ہے کہ وہ وضعی قانون کو اپنی مرضی کے مطابق نہ ڈھال سکیں۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو مقتدر اعلیٰ نہیں کر سکتا۔ قرون وسطیٰ میں قانون کے تمام ذرائع.....فطری' خدائی اور رواجی.....قانون سازوں کی دسترس سے باہر ہوتے تھے۔

ہم عصر غیر لبرل معاشروں میں کم از کم وہ معاشرے جو خدائی' فطری اور رواجی قوانین کے مشترکہ نظریات رکھتے ہیں' وہاں ریاست پر اس قسم کی پابندیاں ابھی تک قابل عمل ہیں۔ مثلاً بہت سے مسلمان معاشروں میں حکومتیں ان حدود کو پار نہیں کر سکتیں جو اسلامی شریعت نے متعین کی ہیں۔ وہاں حکمران خدا کے قانون کے سامنے جواب دہ ہیں۔ افغانستان کا نیا آئین ایک ایسی اسلامی عوامی جمہوریت تخلیق کرتا ہے جو مردوں اور عورتوں کے لیے مساوی حقوق کی یقین دہانی کرتی ہے اور اسلام سے متصادم قوانین کے اجرا کی اجازت نہیں دیتی۔ لیکن مخصوص ادارہ جاتی انتظامات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ حتمی تشریح کا اختیار بعض اوقات غیر مذہبی ججوں کو اور بعض اوقات مذہبی ججوں' یا کونسلوں یا پھر کسی اعلیٰ تر مذہبی رہنما کو حاصل ہوتا ہے۔ پیچیدہ مسائل اس وقت ابھرتے ہیں جب جدید حالات و واقعات کا حل روایتی قانونی اصولوں اور ضابطوں میں نہیں ملتا اور معاشرے داخلی طور پر تکثیریت پر مشتمل ہوتے ہیں (مثلاً شہریوں کی ایک بڑی تعداد ماڈرن لبرل خیالات سے متاثر ہوتی ہے یا پھر مختلف ثقافتی یا مذہبی فرقوں پر مشتمل کمیونٹیاں اکٹھی رہ رہی ہوتی ہیں)۔ یا پھر اس وقت الجھنیں ابھرتی ہیں جب قانون میں جدید اور روایتی دونوں طرح کے عناصر کا امتزاج ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ مذکورہ معاشروں میں لازمی طور پر پایا جاتا ہے۔ کارآمد انتظامات قابل حصول ہوتے ہیں لیکن چیلنجز بہت بڑے ہوتے ہیں اور ان کا مقابلہ تمام فریقین کی خواہشات کے بغیر پورے معاشرے کی موزونیت کے لیے نہیں کیا جا سکتا۔

ہم عصر لبرل معاشروں میں اس کے برعکس یہ تصور کہ حکومت کی قانون سازی پہ حدود و قیود نافذ ہیں (دوسرا فہم)۔ اگر اسے مکمل طور پر کام کرنا ہے تو اسے مختلف انداز میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنا ہوگا کیونکہ فطری قانون' خدائی قانون اور رواجی قانون کو اب وہ اہمیت حاصل نہیں جو ماضی میں انہیں حاصل تھی۔ لبرل معاشروں میں قانون سازوں پر عائد قانونی حدود وقیود کا جدید متبادل مسودہ ہائے حقوق یا انسانی حقوق کے اعلامیے ہیں۔ حقوق کے مسودے دو مختلف نظریاتی صورتوں میں سامنے آتے ہیں' جو حقوق قانون سازی کے بغیر بھی اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے نظر آتے ہیں وہ قانون سازوں پر حدود وقیود عائد کرنے والے فطری قوانین سے ممیز نہیں اور قابل ذکر استثنا رکھتے ہیں کہ جدید عدالتوں کو ان کی تشریح اور اطلاق کا اختیار حاصل ہے۔ مسودہ ہائے قانون کو متبادل صورت میں وضعی قانون کی ایک شکل سمجھا جائے گا جس کے ذریعے آئینی قانون سازی حقوق کو سربلند کرتی ہے۔ قانون سازوں پہ وہ جو حدود وقیود عائد کرتے ہیں انہیں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ نظریاتی طور پر پہلے مفہوم کی قانونی حدود وقیود کے مشابہ ہیں۔ جب اعلیٰ تر طریقہ کار کی رکاوٹیں حقوق کے مسودوں (قوانین) میں ترامیم (مثلاً اکثریت کا ووٹ) کے راستے میں لانا ضروری ہوں تو پھر انہیں اتنا مشکل بنا دیا جاتا ہے کہ ترامیم کبھی کبھار ہی ممکن رہ جاتی ہیں۔ مسودہ ہائے حقوق دوسرے مفہوم کی طرح مؤثر بہ ماضی بنائے جا سکتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کی قانون سازی پر حدود وقیود مطلق سمجھی جاتی تھیں جبکہ مسودہ ہائے حقوق کو بعض اوقات طریقۂ کار کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ حقوق کو شدید ضرورت یا وزنی جواز کے مظاہرہ کی صورت میں غالب آنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

قانون کی حکمرانی کے کامیاب نفاذ کی کلید حکومت پر حدود وقیود کا نفاذ سمجھنا محض ایک عمومی خیال اور سادگی ہے۔ یہ معاملہ جتنا آسان نظر آتا ہے عملاً اتنا آسان نہیں ہے۔

رسمی ضابطہ پسندی

معانی کا دوسرا خوشہ قانون کی حکمرانی کی تاویل کے گرد رسمی ضابطہ پسندی کی طرح گھومتا ہے۔ اس مفہوم میں قانون کی حکمرانی' عوامی' امکانی (مؤثر بہ مستقبل) کے قوانین عطا کرتی ہے جن کے ساتھ عمومیت' نفاذ کی مساوات اور یقینیت کی خوبیاں ہوتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ یہ رسمی خوبیاں ضابطوں کے اوصاف بھی ہیں۔ رسمی ضابطہ پسندی ایک ضابطہ طلب نظام پر زور دیتی ہے جسے حکومت قائم کرے اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برقرار رکھے۔ ضابطہ پسندی کے طریقۂ کار کا مکمل مفہوم عدالتی کارروائی کے دوران منصفانہ سماعت کا موقعہ دیا جانا بھی ضروری قرار دیتا ہے۔

بیشتر نظریات دانوں کا پسندیدہ' قانون کی حکمرانی کا یہ غالب مفہوم لبرل ازم اور کیپٹل ازم کے لیے ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی پیش بینی کی صلاحیت ہے۔ ہائیک کا کہنا ہے کہ قانون کی حکمرانی اس بات کی پیش بینی پورے وثوق کے ساتھ ممکن بناتی ہے کہ مقتدرہ کس طرح مخصوص حالات میں اپنی استبدادی قوتوں کو استعمال کرے گی اور پھر کسی فرد کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اس علم کی بنیاد پر اپنے معاملات کی منصوبہ بندی کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ پہلے سے جان لیتے ہیں کہ کون سے اقدامات انہیں سرکاری مشینری کی پابندیوں کی زد میں لا سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک فرد اپنے آزادانہ عمل کی وسعت سے باخبر رہتا ہے۔ ایسی صورت میں کسی عمل کو ممنوع قرار دینے والے پہلے سے موجود قانون کے بغیر سزا نہیں دی جا سکتی۔

سرمایہ داری یعنی کیپٹل ازم کے حوالے سے عوامی' امکانی قوانین' عمومیت' نفاذ کی مساوات اور یقینیت (قطعیت) کی خوبیوں کے ساتھ مارکیٹ کے لین دین کے لیے نہایت موزوں ہیں کیونکہ پیش بینی کی صلاحیت اور قطعیت تاجروں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ممکنہ اخراجات (لاگت) اور منافع جات کا تخمینہ پہلے سے لگا لیں۔ معاشی ترقی اور رسمی ضابطہ پسندی کے درمیان ایک مثبت باہمی تعلق کے بڑھتے ہوئے شواہد موجود ہیں۔ اس تعلق کو انہی خصوصیات سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

قانون کی حکمرانی کی ایک اور حد بندی جو انہی معنوں میں سمجھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کسی ایسی قانونی حکومت سے ہم آہنگ ہے جس کے قوانین غیر مساوی یا شر انگیز منشا رکھتے ہوں۔ یہ غلامی' قانونی نسلی علیحدگی اور نسلی امتیاز کو روا رکھتی ہے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جنوبی افریقہ ہیں۔ ایسی حکومت استبدادی اور غیر جمہوری ہوتی ہے۔ اس طرح کی قانون کی حکمرانی چین اور سنگاپور میں دیکھنے میں آتی ہے۔ اس فہم میں قانون کی حکمرانی کا کوئی مؤثر نظام دراصل اپنی مستعدی میں اضافہ کر کے اور اپنے قانونی جواز کو بنیاد بنا کر استبدادی گرفت کو مضبوط بنا لیتا ہے۔ اس بات کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تکذیب نہیں کی جا سکتی کہ رسمی ضابطہ پسندی اس طرح کی حکومتوں کو حدود و قیود میں رکھتی ہیں لیکن اس بات پر زور دینا کہ یہ پابندیاں بلاشبہ عدم مساوات سے ہم آہنگ ہوتی ہیں کیونکہ بنیادی اطمینان سے محروم کرتی ہیں۔ غیر منصفانہ قوانین کا کوئی مجموعہ محض رسمی تقاضوں کو پورا کرنے سے نہیں بنتا۔

قانون کی حکمرانی کی اس صورت میں ایک اور حد بندی ہے۔ رسمی ضابطہ پسندی اس کے حامیوں اور ناقدوں کے مطابق تقاضا کرتی ہے کہ آپ تقسیمی مساوات کے مقاصد کو نظر انداز کر دیں۔ (سماجی خیر کی زیادہ مساوی تقسیم نہ ہو)۔ اسی طرح انفرادی معاملات میں انصاف نہ کریں۔ یہ مقاصد چاہتے ہیں کہ الگ الگ معاملہ (مقدمہ) میں پس منظر کی حساسیت کے ساتھ تعین کیا جائے۔ یہ طرز عمل عمومیت' رسمی مساوات' قطعیت اور پیش بینی کی صلاحیت کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ رسمی ضابطہ پسندی دوسری سماجی اقدار اور مقاصد کے ساتھ کشیدگی میں اپنا وجود برقرار رکھتی ہے لیکن یہ غلط ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے بے نیاز الگ الگ رکھا جا سکتا ہے۔ عظیم تر تقسیمی مساوات کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے عمومی ضابطوں کو سب پر ایک طرح سے نافذ کرنا پڑتا ہے۔ (اگرچہ یہ پھر بھی مکمل طور پر حاصل نہیں ہوتی)۔ مثلاً اثاثوں کی حد ملکیت نافذ کی جا سکتی ہے جو موت کی صورت میں ورثا کو منتقل ہو سکے اور اسی طرح حکومت کے وسائل اس طرح مختص کیے جا سکتے ہیں کہ ان کے ذریعے عمدہ عوامی تعلیمی نظام قائم ہو جس کی بدولت عظیم تر مساوات کے قیام میں مدد ملے۔ یہ تعلیمی نظام اس اکلوتی سب سے بڑی محرومی کو دور کرتا ہے جس سے غریب متاثر ہوتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی کے نظام انفرادی معاملات میں بھی انصاف کرنے کی گنجائش پیدا کرتے ہیں اگر قانون کی حکمرانیوں کو کبھی کبھار انصاف کی روش سے رخصت کر دیا جائے۔ حکومت کی طرف سے استبداد کی قوت کی وجہ سے فوج داری سزا کے تناظر میں یہ رخصتی صرف دفاع کرنے والوں کے حق میں رونما ہو سکتی ہے۔ جب ضابطہ طلب ناانصافیاں دفاع کرنے والوں کے حق میں ہوں گی اور مجرم آزاد رہیں گے تو پھر یہ صورت حال قبول کرنا پڑے گی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا قانونی نظام (اور غالباً انگلستان سمیت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے ممالک کے نظام) نونیٹ اور سیلز نیک کی تجویز کے مطابق اپنے مجموعی ضابطہ پسند کردار کو گنوائے بغیر یہ سقم دور کر چکے ہیں۔ مغرب کے سماجی بہبود کے نظام جو ہائیک کی پہلی تحریر کے بعد ساٹھ سال کے دوران پختہ کار ہو چکے ہیں' یہ حقیقت دکھا رہے ہیں کہ انتظامی صوابدید قانونی پابندیوں یا حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے بھی حاصل ہو سکتی ہے اور یہ کہ رسمی ضابطہ پسندی' حکومتی عمال کے صوابدیدی' پالیسی اقدامات کی مستقل موجودگی میں بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ قانونی آزادی کا کلیدی ضامن رسمی ضابطہ پسندی کی پابندیوں کو انتہائی سختی کے ساتھ برقرار رکھنا ہے۔ یہ پابندیاں حکومت کے خلاف اس وقت انتہائی ضروری ہو جاتی ہیں جب حکومت کا جبر و استبداد فرد یا املاک کے لیے خطرہ بن جائے۔

ایک آخری پابندی یہ ہے کہ ایسے بہت سے حالات ہوتے ہیں جن میں رسمی ضابطہ پسندی نہ تو موزوں ہوتی ہے اور نہ ہی سماجی طور پر مفید۔ حکومت کی پالیسی کے بہت سے شعبے ایسے ہیں' بالخصوص جہاں غیر یقینی صورت حال ہوتی ہے یا بہت سا تنوع پایا جاتا ہے وہاں یہ قانونی ضابطوں کی پابندیوں کے پہلے سے اطلاق کی کوششوں میں مکمل طور پر ناکام ہو جاتی ہے یا اسے زبردست نقصان پہنچتا ہے۔ مزید برآں چھوٹے پیمانہ کی کمیونٹیوں میں جہاں ایک طاقتور اشتمالیت پسندی موجود ہو وہاں ایک اور اہم تناظر پیش کرنا یعنی رسمی ضابطہ پسندی سے وابستگی اور ضابطوں کے ذریعے حکمرانی نقصان دہ ہو سکتی ہے یا پھر ایسی صورت حال میں جہاں بے قابو تشدد پھوٹ پڑنے کا خطرہ ہو وہاں امن کا حصول ضابطوں پہ انحصار کرنے کی بجائے سیاسی کوششوں کے ذریعے بہتر ہوتا ہے۔ اس طرح کے مناقشات دور کرتے ہوئے اکثر اوقات بنیادی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ طویل مدت تعلقات اور مشترکہ تواریخ ان باتوں سے زیادہ اہم ہوتی ہیں کہ ضابطے کیا کہتے ہیں۔ کسی مصالحت پہ اترنا سختی سے ضابطہ پسندی کے برعکس بہتر اور حصول مقصد کو بہتر بناتا ہے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان حالات میں ضابطوں کا کردار اہم نہیں ہوتا۔ ہم عصر ایشیائی اور افریقی معاشروں میں خاص طور پر اس حقیقت کے باوجود کہ وہاں مغربی تصورات سرائیت کر رہے ہیں' اشتمالیت پسند تہذیبی پابندیاں مسلسل موجود ہیں جو مختلف طریقوں سے اور مختلف سیاق و سباق میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسمی ضابطہ پسندی کے پہلوؤں سے متصادم ہیں۔

ان مشاہدات کا اطلاق تجارتی لین دین کے حوالے سے بھی ہے جس کے ساتھ رسمی ضابطہ پسندی گہری وابستگی رکھتی ہے۔ مقامی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر تجارتی شرکاء اپنی اس خواہش کا اظہار کر چکے ہیں کہ عدالتی کارروائی کی بجائے ثالثی اور مصالحت کے دیگر راستے ہونے چاہئیں۔ اس کی جزوی وجہ اخراجات' وقت کا ضیاع' تاخیر اور بعض اوقات مقامی' قومی اور بین الاقوامی عدالتوں کا ناقابل بھروسا ہونا ہے۔ لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تجارتی برادری منفعت بخش تعلقات جاری رکھنا چاہتی ہے اور ایک باہمی قابل قبول حل کے لیے اپنی رضامندی کا مظاہرہ کر کے بزنس کمیونٹی میں اچھی شہرت برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ ضابطے سب کچھ یا کچھ بھی نہیں جیسے نتائج رکھتے ہیں' نتیجہ جیت یا شکست ہوتا ہے۔ لیکن کمیونٹیاں چاہے وہ سماجی ہوں' سیاسی یا تجارتی ہمیشہ اس وقت بہتر رہتی ہیں جب دونوں فریق کسی تنازعے سے بچ کر اطمینان بخش طریقے سے آگے چلتے رہیں۔

رسمی ضابطہ پسندی کے نقائص کی اس گردان کو اس کی قدر و قیمت ختم کرنے کی کوشش نہ سمجھا جائے۔ یہ مشاہدہ کہ تاجر برادری کچھ حالات میں ضابطہ پسندی سے رجوع کیے بغیر کام کر سکتی ہے' اس بات کا ثبوت نہیں کہ ضابطہ پسندی تجارتی دنیا اور مارکیٹ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی یا اس کے بغیر چل سکتی ہے۔ اس کے برعکس قابل اعتماد ضابطہ پسندی کا پس پشت فریم ورک قائم کرنا کیپٹل ازم کا اہم جزو ہے اور آج کل موجود ہے۔ ناکامی کے حوالے سے یہ پس منظر تاجروں کو ایک قابل قبول مصالحت کے حصول میں مدد کرتا ہے۔

رسمی ضابطہ پسندی اور سرمایہ داری کے درمیان یہ گہرا تعلق ایک اہم سبق رکھتا ہے جسے واضح اور نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے کلاسیکل لبرل نظریات کے ذریعے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ معاشرے کے سبھی ارکان رسمی ضابطہ پسندی سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جائیداد یا پراپرٹی کا مالک سب سے زیادہ فائدہ میں رہتا ہے۔ اس کی پراپرٹی محفوظ رہتی ہے اور وہ معاہدات میں داخل ہو سکتا ہے۔ جائیداد کے مالکان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے وکلا کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک معاشرہ جس میں پراپرٹی کی ملکیت آفاقی ہو' ایسا معاشرہ ہوتا ہے جس میں رسمی ضابطہ پسندی کے پیش کردہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ثمرات سے سبھی پوری طرح بہرہ مند ہوتے ہیں۔

رسمی ضابطہ پسندی کو غالباً بہتر طور پر اس کی عدم موجودگی سے موازنہ میں سمجھا جا سکتا ہے۔ پیش بینی کی صلاحیت کے دیگر ذرائع نہ ہونے پر (جب مشترکہ اخلاقیات یا رسوم ورواج نہ ہوں) یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ حکومتی عمال کسی فرد کے عمل پر کیا ردعمل ظاہر کریں گے۔ چاہے یہ عمل تجارتی ہو یا کوئی اور ہمیشہ غیر محفوظ رہے گا۔ وہ معاشرے جو رسمی ضابطہ پسندی پر عملدرآمد کرتے ہیں' تحسین کے قابل ہیں کہ انہوں نے غیر یقینیت کی اس ناخوشگوار صورت حال کو ختم یا محدود کر دیا ہے۔

اس سے پہلے کہ حکومتوں کی طرف سے رسمی ضابطہ پسندی کے مطابق رہنے کے دعوے خود ستائشی کے دائرے میں داخل ہو جائیں انہیں ایسے امتحان سے گزارنے کی ضرورت ہے جو اصل وحقیقت واضح کر دے۔ مغربی نظریات دان بہت کم اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہی حقیقت شناس امتحان جدید قانونی ریاستوں کی پیچیدگی اور ان کے جھلکتے ہوئے بے تحاشہ ضابطوں کی ماہیت جان سکتا ہے۔ اس عمومی آگاہی سے آگے کہ دوسروں کی جان یا املاک کو نقصان پہنچانا عملاً قابل اجازت نہیں ہے اور یہ کہ معاہدات ذمہ داریاں تخلیق کرتے ہیں' کس حد تک شہری اپنے اقدامات کے نتائج سے قبل از وقت اچھی طرح باخبر ہوتے ہیں؟ ایک حاضر جواب ضرور ہونا چاہیے اور وکلا اسی کام کے لیے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ پہلو اضافی اخراجات اور قانونی مشاورت کی دستیابی کے متعلق اضافی حل طلب سوالات رکھتا ہے۔ اگر رسمی ضابطہ پسندی شہریوں کی پیش بینی کی صلاحیت کے بارے میں ہے تو پھر توجہ اس نکتہ پر مبذول کرنا چاہیے کہ کیا یہ پیش بینی کی صلاحیت واقعی قانونی نظام تفویض کرتا ہے۔

فرد کی نہیں' قانون کی حکمرانی

قانون کی حکمرانی کے معانی کا ایک تیسرا خوشہ فرد کی حکمرانی کے موازنہ میں مرتب ہوتا ہے۔ تکرار کے ساتھ سامنے آنے والا یہ موازنہ ایک ضد کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے کہ فرد کی حکمرانی نہیں قانون کی حکمرانی۔ افراد کی حکومت نہیں' قوانین کی حکومت' قانون عقل ہے' فرد جذبہ ہے' قانون غیر صوابدیدی ہے' فرد صوابدیدی اور مرضی کا مالک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ قانون معروضی ہوتا ہے جبکہ فرد موضوعی۔ اس تصور میں مخفی خواہش کہتی ہے کہ قانون کی حکمرانی کے تحت رہنا دوسرے افراد کی تلون مزاجی کا محکوم بننے سے بہتر ہے۔ یہ محکومی نہ تو بادشاہوں کی ہو نہ ججوں کی' حکومتی عمال کی اور نہ ساتھی شہریوں کی۔ اس کے ذریعے تعصب' حسد' جذبات' غلطیوں' تکبر' لالچ' حرص یا ترنگ جیسی انسانی کمزوریوں سے تحفظ ملتا ہے۔ قانون کی حکمرانی کا یہ مفہوم دوسروں پہ بداعتمادی اور خوف کی بنیاد پر استوار ہے۔ یہ ایک ایسی پسند یا خواہش کی عکاسی ہے جو ماضی میں ارسطو تک پہنچتی ہے۔ جو قانون کے ذریعے حکمرانی کو کسی دوسرے فرد کی بے قابو حکمرانی پر ترجیح دیتی ہے۔ یہ فرد چاہے دانشمند ہو لیکن حکمرانی کے اختیار کے ناجائز استعمال کی جبلت کا اندیشہ موجود رہتا ہے۔

فرد کی حکمرانی نہیں' قانون کی حکمرانی کا نظریہ بہت طاقتور ہے اور یہ اس حقیقت کی بدولت مستقل مزاج ہو چکا ہے کہ قوانین نہ تو اپنی تشریح خود کرتے ہیں اور نہ خود نافذ ہوتے ہیں۔ ان کی تشریح اور نفاذ میں انسانی شرکت کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہابس اسی لیے اسکو ایک مغالطہ آمیز نظریہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح کی شرکت ناگزیر طور پر ہر اس کمزوری کو پھر سے شامل ہونے کا موقعہ دیتی ہے جس سے بچنے کے لیے قانون کی طرف رجوع کیا جا رہا ہے۔ قانون اور زبان کا عدم تعین کہتا ہے کہ یہ شگاف کبھی بھی مکمل طور پر بند نہیں ہو سکتا۔

معیاری دو تہوں والی تعبیر میں پہلی یہ ہے کہ عدلیہ (قانونی ماہرین پر مشتمل) کا تشخص قانون کے خصوصی محافظوں کا ہونا چاہیے۔ دوسرے اس فرد کی ذات کی موجودگی کو مسترد (نفی) کر دیا جائے جو جج ہے۔ یہ دونوں تہیں آپس میں مربوط ہیں۔ چونکہ جج قانون اور عدالتی کردار کے لیے غیر نظریت پسند ہوتا ہے چنانچہ وہ مجسم قانون بن جاتا ہے۔ اس نظریہ میں جج کو غیر جانبدار' جذبات سے عاری' تعصب سے خالی' ثالث اور صرف اور صرف قانون کا وفادار ہونا پڑتا ہے' جب بھی یہ اعلان یقین دہانی کراتا ہے کہ جج قانون کا بھونپو ہے' یا جج قانون گوئی کرتا ہے یا جج کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی تو یہ شبیہہ ضابطہ پسندوں کے اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے کہ جج فیصلے کرتے ہوئے میکانکی انداز میں ضابطہ کا اطلاق کرتا ہے۔ قانون کی تشریح اور نفاذ میں حرف آخر درست طور پر عدلیہ ہوتی ہے کیونکہ کوئی اور حکومتی عامل اس ضروری کایا کلپ میں سے نہیں گزرتا جس میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موضوعاتی فرد کی جگہ معروضی جج لیتے ہوئے گزرتا ہے۔ اگرچہ قانون کی حکمرانی اس تیسرے مفہوم میں ان سب حکومتی عمال پر لاگو ہوتی ہے جو قانون کی نگہبانی میں امور سرانجام دے رہے ہوتے ہیں لیکن حتمی تجزیہ میں اسی استدلال کی وجہ سے جج کے لیے خصوصی تحفظ ہوتا ہے۔ آخری رجوع میں جج ہی ایسا فرد ہوتا ہے جو یقین دلاتا ہے کہ دیگر حکومتی عمال قانون کے ماتحت ہیں۔

استدلال کے اس تسلسل نے دو اضافی سماجی امور کی اعانت کی اور یہ دونوں بھی اس کے معاون بنے۔ پہلا یہ کہ ایک بڑا کردار قانونی روایت کی غیر معمولی نشوونما اور اس کے بھرپور سماجی دخول نے ادا کیا۔ اس میں قانون کے علمی مطالعہ کا قیام' خصوصی علم کی حیثیت سے قانون کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی اور اسکے ساتھ اس کی اپنی مخصوص زبان اور نظریات' قانون کے پیشہ کا منظم طور پر گلڈ کی حیثیت سے استحکام اور قانونی خدمات پر اجارہ داری' فوج داری نظام' قانون میں وکلا کی ناگزیر شرکت' جائیداد کی ملکیت کے حق کے قیام میں کردار' تجارتی لین دین کے معاملات کو قانونی شکل دینے کی آسانی اور یہ مرکزی کردار کہ قانون میں مہارت اور تربیت رکھنے والے افراد بادشاہ اور پوپ کے مشیر بنے' مشیر بننے کے علاوہ سرکاری عمال اور قانون ساز بنے۔ سرکاری اور نجی شعبہ میں اہم مناصب پر پہنچے۔ سماجی موجودگی اور طاقت نے وکلا کو ایک طاقتور سماجی گروپ بنا دیا۔ کیونکہ ججز قانون کے پیشہ کی چوٹی پر ایک ماڈل کی حیثیت سے اس طرح کھڑے تھے کہ کامیابی کے حوالے سے کوئی بھی اس کی تمنا کر سکتا تھا۔ اس پیشہ سے تعلق رکھنے والوں نے اس کے نظریہ اور شناخت کے بارے میں دعویٰ کرتے ہوئے کہا کہ قانون معروضی' الگ' خصوصی' اپنی خصوصی سالمیت کا مالک' سیاست کی آلودگی سے مبرا' سماجی نظم کا محافظ اور سماجی میل جول کا معاون ہے۔

دوسرا کردار اختیارات کی تقسیم کے نظریہ کے پھیلاؤ سے ابھرا' جس نے ججوں کی خودمختاری کو قائم کیا۔ مؤثر ہونے کے لیے اسے ادارہ جاتی انتظام درکار تھا جس نے عدلیہ کو دوسروں کی مداخلت سے محفوظ کیا۔ اس کے حصول کا عمومی فارمولا ججوں کا انتخاب قانونی اہلیت کی بنیاد (قانونی تربیت اور تجربہ)' ججوں کا طویل مدت تقرر' ججوں کی برطرفی کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلاف طریقۂ کار کے علاوہ بنیادی تحفظات' ججوں کے لیے معقول معاوضے اور فعال عدالتی نظام کے لیے بھرپور وسائل (معاون عملہ' کتابیں' دفاتر وغیرہ) قانون کی مذکورہ بالا پیشہ ورانہ حیثیت نے عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کو ممکن بنایا لیکن عدلیہ نے بھی اعلیٰ ترین پیشہ ورانہ کامیابیاں پیش کیں۔ اس نے اپنی ادارہ جاتی شناخت اور اپنی تخصیص کا تحفظ درست ثابت کیا۔ یہ ادارہ جاتی عوامل ہی کافی نہ تھے جو ججوں کی خودمختاری کو یقینی بناتے۔ ان کی تکمیل عدلیہ سے باہر حکومتی عمال اور عوام کے رویہ نے کی' جس کے مطابق عدلیہ میں مداخلت مناسب نہیں کیونکہ یہ قانون کی تشریح اور نفاذ کا کردار مکمل طور پر ادا کرتی ہے۔ اسی طرح ججوں کا رویہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ قانون کے معاملے میں خود کو بیرونی اثرات اور دباؤ میں لانے کی اجازت دینا مناسب نہیں۔ اختیارات کی علیحدگی نے عدلیہ کو محفوظ بنانے سے بڑھ کر کام کیا۔ اس نے بیک وقت یہ کیا کہ ججوں کو میسر بہت زیادہ اختیارات کے ناجائز استعمال کی قوت کو کم کیا۔ جج حکومت کی دیگر شاخوں کے تعاون اور شہریوں کی رضاکارانہ اطاعت و تعمیل کے مرہون منت تھے۔ صرف اسی صورت میں وہ اپنے فیصلوں پر عملدرآمد کرا سکتے تھے۔

قانون کی حکمرانی کے اس تصور اور اس کے ساتھ ہمرکاب سماجی' سیاسی اور نظریاتی ترقی کا بنیادی خطرہ یہ ہے کہ قانون کی حکمرانی کہیں ججوں کے ذریعے حکمرانی نہ بن جائے۔ جب کبھی قانون کے ضابطوں کو اختیار و اقتدار ملا اور ججوں کو قانون کی تشریح اور نفاذ کے لیے حرف آخر بنایا گیا تو جج ہی ان قانون کے ضابطوں کے نتائج اور مفاہیم کا تعین کریں گے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ قانون کے عدم تعین پر نظریاتی بحث اس اتفاق رائے کے ساتھ ختم ہوگئی تھی کہ کسی نہ کسی درجہ کا عدم تعین پیش بینی یا پیشین گوئی کے صلاحیت کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور کم از کم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نظام قانون میں ایسا ہی ہے۔ جب کسی درجہ کے عدم تعین کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے بعد یہ دعویٰ کہ جج محض قانون گوئی کرتے ہیں' معقولیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ جب اس میں لاعلمی' کمزوری' لاشعوری طور پر جانبدار ہونا یا بدعنوانی اور اختیار کی خواہش کے فطری انسانی اوصاف شامل کر لیے جائیں تو قانون کی حکمرانی کا ججوں کی حکمرانی میں تبدیل ہو جانے کا خطرہ محض امکان کی بجائے حقیقی تشویش میں بدل جاتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ایک انتباہ ہے کہ ججوں کا انتخاب انتہائی احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے۔ محض ان کے قانونی علم اور ذکاوت و ذہانت پہ نظر نہ رکھی جائے بلکہ قانون سے وفاداری کے لیے وابستگی کو بھی بھانپا جائے کہ کیا وہ قانون کے مخفی عدم تعین کو استعمال کرنے کا رجحان تو نہیں رکھتا' یہ دیکھا جائے کہ کیا وہ قانون سازی کرنے والوں کے جائز اختیار کو تسلیم کرنے پر تیار رہتا ہے۔ (ایسے قانون سازی کے فیصلے قبول کر لیتا ہے جب ججز عدم اتفاق کا اظہار کرتے ہیں)۔ اس کا سماجی پس منظر دیکھا جائے تاکہ یہ بات یقینی ہو جائے کہ وہ کمیونٹی کا حقیقی نمائندہ ہے۔ اس کی ایمانداری اور وفاداری کو جانچا جائے (تاکہ وہ غیر جانبدار رہے اور بدعنوانی میں ملوث نہ ہو جائے)۔ اس کا مزاج اور عمومی طرز عمل دیکھا جائے (کیا وہ مہذب ہے) اور دانشمندی کا جائزہ لیا جائے۔ قانون از خود نہیں بلکہ لوگوں کے ذریعے بولتا ہے۔ جج خواتین وحضرات ایسے افراد ہونے چاہئیں جو معاملات کو بھانپ سکیں' ذہانت اور دانش کے علاوہ صاحب کردار ہوں ورنہ قانون نتائج کے اعتبار سے غبی' کینہ پرور اور غافل ثابت ہوتا ہے۔ یہ ارسطو تھا جس نے سب سے پہلے اصرار کیا کہ جج کا کردار اور ذہنی سمت بندی قانون کی حکمرانی کا لازمی جزو ہے۔

کیا ججوں کے ذریعے حکمرانی کیے جانے کا امکان منفی ردعمل پیدا کرتا ہے یا مثبت' اس کا انحصار کسی معاشرے کے تاریخی اور ہم عصر حالات کے ساتھ ساتھ اس کی سیاست پر منحصر ہے۔ فرانس میں انقلاب سے پہلے عدالتی منصب خریدنا اور اسے محاصل جمع کرنے کے لیے استعمال کرنا اجتماعی یادداشت پر ایک گہرا داغ چھوڑ گیا ہے۔ (اگرچہ اب یہ دھندلا ہو رہا ہے)۔ وہاں قانون کی حکمرانی کو ججوں کی حکمرانی میں بدلنا ایک لعنت سمجھا جاتا ہے۔ انڈونیشیا میں جہاں عدالتیں بدعنوانی کے لیے بدنام ہیں وہاں یہ تصور نفرت انگیز ہے۔ ایران میں جہاں عدلیہ میں مذہبی شدت پسندوں کا غلبہ ہے' وہاں سیاسی باغیوں کے مقدمات بند کمروں میں ہوئے' خبروں کی اشاعت پر پابندی ہے اور مخالف سیاسی جماعتوں کے ارکان کو جیل بھیج دیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ آئین کی مطابقت کے نام پر ہوتا ہے' یہ تصور برہمی پیدا کرے گا۔ لاطینی امریکہ کے متعدد ملکوں میں جہاں عدلیہ دولت مند اشرافیہ کی ہمدرد رہی ہے وہاں یہ تصور رجعت پسندی کہلائے گا۔ دنیا میں آج اور بہت سی مثالیں ہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاں ججوں کے ذریعے حکمرانی کے امکان کو خوف کے ساتھ دیکھا جائے گا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آج کل سپریم کورٹ (ریہنکسٹ کی سربراہی میں) بالترتیب ریاست اور وفاقی حکومت کے اختیارات کی جارحانہ انداز میں نئی تشریح کرنے میں مصروف ہے۔ وہ کانگریس کے بنائے ہوئے بہت سے قوانین کو کالعدم قرار دے چکی ہے اور ابھی حال ہی میں اس نے ہم جنس پرستوں اور سزائے موت کے حوالے سے ہونے والی قانون سازی کو کالعدم قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہاں ججوں کے ذریعے حکمرانی پر گہری تشویش پائی جاتی ہے۔ ججوں کے ذریعے حکمرانی ناقابل مواخذہ اشرافیہ کی طرف سے اختیار کے ناجائز استعمال کا بھوت اس طرح مسلط کیا جاتا ہے کہ سیاسی مسائل سے قانون کے امور کی طرح نمٹا جاتا ہے اور سیاسی فیصلوں کو خالصتاً قانونی تشریحات کے پردہ میں چھپا دیا جاتا ہے۔

قانون کی حکمرانی اور فرد کی حکمرانی کے درمیان فرق کے بارے میں انتہائی تشکیک اس تفریق کو مسترد نہیں کرتی جو اس کی گرفت میں ان دونوں کے موازنے میں واضح انداز سے پائی جاتی ہے۔ اطلاق کے وقت ضابطوں میں انسانی عقل، بصیرت اور معاملہ فہمی سے صرف نظر نہیں کیا جاتا لیکن اسے بدنیت افراد کے ہاتھوں غلط استعمال سے بھی مکمل طور پر نہیں روکا جا سکتا۔ البتہ افراد (سرکاری اہل کار یا ججوں) کو ہدایات دینے میں بہت فرق ہے۔ انہیں یہ کہنا کہ صورت حال کے مطابق متعلقہ قوانین نافذ کریں۔ اس عندیہ سے بہت مختلف ہے کہ وہ قانون وضابطہ سے بے نیاز ہو کر جو درست سمجھتے ہیں اس پر عمل کریں۔ اس بڑے فرق کو قانون کی حکمرانی اور فرد کی حکمرانی کے موازنہ میں درست طور پر گرفت میں لیا گیا ہے جسے ان نقادوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جو بڑی آسانی سے اسے اس لیے مسترد کرتے ہیں کہ یہ بہت زیادہ دعوے کرتا ہے۔ دنیا بھر میں روزانہ اَن گنت مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں کہ حکومتی عمال اور جج دیانتداری کے ساتھ قانون نافذ کرنے کا اپنا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

❖....❖....❖

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

10

بین الاقوامی سطح

مؤرخ پال جانسن کی رائے ہے کہ گزشتہ ہزاریے (Millenium) کا عظیم ترین مآل متعدد قومی ریاستوں میں قانون کی حکمرانی کا قیام تھا جبکہ نئے ہزاریے کی ذمہ داری ہے کہ قانون کی حکمرانی کو بین الاقوامی یا عالمی سطح پر قائم کرے۔ پہلا پراجیکٹ ابھی زیر تکمیل ہے جبکہ نیا پراجیکٹ ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ اس طرح کے طویل مدت امور کے بارے میں پیشین گوئی میں کوئی رکاوٹ نہیں کیونکہ ہر چیز کا امکان ایک سے زیادہ مرتبہ ہوتا ہے۔ یہ باب بین الاقوامی سطح پر قانون کی حکمرانی کی موجودہ صورت حال کے بارے میں ایک جائزہ پیش کرے گا جو گزشتہ باب میں پیش کیے گئے تین تصورات کے حوالے سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ معروضات آزمائشی اور مختصر ہیں جن میں عکاسی کی گئی ہے کہ معاملات کی ابتدائی اور غیر یقینی صورت حال کیا ہے۔ کیونکہ ہر مثبت اشارے کے ساتھ ہی تشکیک کے لیے ایک لازم وملزوم سبب بھی موجود ہے۔

آیئے ہم خوش امیدی کی وجوہات کے ساتھ عمومی انداز میں ابتدا کرتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون دان (جیورسٹس' سکالرز' وکلا) اس بات کا اعادہ کرنے کے شائق ہیں کہ..... ''آج دنیا بھر میں حکومتوں کی اکثریت بین الاقوامی قانون کا احترام کرتی ہے۔'' مزید برآں اس موضوع کے معاملات کی ایک متاثر کن اور روز افزوں تعداد پہ بین الاقوامی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قانون کی حکمرانی ہے۔ مشترکہ علاقائی انتظامات مثلاً یورپی یونین اور NAFTA (نارتھ امریکن فری ٹریڈ ایگریمنٹ) وغیرہ کو جب اس تخمینہ میں شامل کریں تو یہ صورت حال نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ تجارت کی دنیا میں بین الاقوامی ضابطہ کاری بالخصوص بہت فعال ہے۔ حکومتیں تمام پہلوؤں کا احاطہ کر رہی ہیں جن میں ہنرمندی' انٹلکچوئل پراپرٹی' تجارتی لین دین' بینکنگ' بیرونی سرمایہ کاری' ٹیلی مواصلات' سیکیورٹیز وغیرہ شامل ہیں۔ عالمی اور علاقائی قواعد وضوابط اور اصولوں میں سمندر' فضا' آلودگی' اوزون' شہری ہوابازی' محنت' علاقائی تنازعات' سرحد پار سفر' تارکین وطن یا علاقہ بدر افراد کے معاملات' سیاسی پناہ گزین' سفارت کار' بڑی تباہی پھیلانے والے ہتھیار' جنگ سے متعلقہ امور اور بہت کچھ شامل ہے۔ اسی طرح علاقائی اور بین الاقوامی اعلامیوں میں شہری' سیاسی اور انسانی حقوق وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان قواعد وضوابط کو نافذ کرنے کے لیے متعدد بین الاقوامی اور علاقائی ٹریبونلز تخلیق کیے گئے ہیں۔ ان میں سے متعدد گزشتہ کچھ عشروں میں قائم کیے گئے ہیں۔ جن میں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس (عالمی عدالت)' انٹرنیشنل ٹریبونل فار دی لاء آف دی سی' ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (W.T.O)' انٹرنیشنل سینٹر فار سیٹلمنٹ آف انوسٹمنٹ ڈسپیوٹز (ICSID)' انٹرنیشنل کورٹ آف آربیٹریشن آف دی انٹرنیشنل چیمبر آف کامرس (ICC COURT)' سنٹرل امریکن کورٹ آف جسٹس' یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس' انٹرامریکن کورٹ آف ہیومن رائٹس' وار کرائمز ٹریبونلز' انٹرنیشنل کریمنل کورٹ نمایاں ہیں۔

یہ سب کچھ عالمی قانون کا انفراسٹرکچر ہے۔ روز بروز بڑھتے ہوئے عالمی امور کو بین الاقوامی اور علاقائی قواعد وضوابط کا موضوع بنایا جا رہا ہے۔ زیادہ تر ممالک اکثر اوقات ان قواعد وضوابط پر عمل کرتے ہیں۔ عدالتوں اور ٹریبونلز کی صف بندی کی جا رہی ہے تاکہ ان قواعد وضوابط کے لیے رجوع کرنے میں آسانی ہو۔ یہ مستحکم بنیاد سازی پبلک انٹرنیشنل لاء (ریاستوں اور انسانی حقوق کے درمیان تعلقات سے متعلق قوانین) اور پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء (مختلف ممالک کے گروپوں اور اداروں (زیادہ تر تجارتی) کے درمیان تعلقات سے متعلق قوانین) دونوں شعبوں میں ہو رہی ہے۔ قانون سازی کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیادی شکل اور ذرائع کثیر پہلو اور دو طرفہ تعلقات کے معاہدے۔ بین الاقوامی رسوم مشترکہ عوامی اصول اور انٹرنیشنل اداروں (ایجنسیوں اور ٹریبونلز) کے جاری کردہ قواعد و ضوابط' انٹرنیشنل ٹریبونلز کے فیصلے' ماڈل کوڈز اینڈ کنٹریکٹس' ذاتی معاہدوں اور سمجھوتوں میں استعمال ہونے والی وسیع تر شرائط اور قومی سطح پر معاون قانون سازی وغیرہ شامل ہے جو قومی اور بین الاقوامی قانونی نظم میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔

مذکورہ بالا عوامل کو جب اہمیت دی جاتی ہے تو ہوش مند مشیر انتباہ کرتے ہیں کہ اگر چہ یہ درست ہوگا کہ زیادہ تر قوانین کا احترام اکثر و بیشتر کیا گیا لیکن زیادہ طاقتور اور نسبتاً کم طاقتور ملکوں کے لیے کوئی معاملہ زیادہ حساس ہوگا تو وہ اپنے مفروضہ قومی مفاد کے لیے ضروری سمجھتے ہوئے یا برسر اقتدار حکومت کو بچانے کے لیے بین الاقوامی قانون کو نظر انداز کر دیں گے۔ Realpolitik ہی بین الاقوامی قانون کا قابل بھروسا مرکزی سہارا ہے۔ علاوہ ازیں متعدد موضوعات خصوصاً تجارت سے متعلقہ' بلاشبہ بین الاقوامی قانون سازی میں سے گزرے ہیں۔ جبکہ دیگر موضوعات مثلاً انسانی حقوق وغیرہ کاغذات میں یا علامتی سطح پر کم از کم ان ملکوں میں بھی موجود ہیں جنہیں وہ مسترد کرتے ہیں یا ان کا بہت کم احترام کرتے ہیں۔ اگر چہ ٹریبونلز کی فہرست طویل ہے لیکن زیر سماعت مقدمات کی خام تعداد بہر حال ابھی بہت کم ہے۔ (حالیہ برسوں میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور یہ انسانی حقوق اور تجارتی امور سے تعلق رکھتے ہیں)۔ مثلاً عالمی عدالت 11 ملین ڈالرز کے سالانہ بجٹ کے ساتھ کام کر رہی ہے لیکن اس نے ابھی تک ایک سو کے قریب فیصلے کیے ہیں۔ اسی طرح بین الاقوامی اور علاقائی ٹریبونلز کی ایک وسیع تعداد جن کی تشکیل غیر مسلسل امور سے نمٹنے کے لیے کی گئی ہے اور جو معاونت کے لیے کسی سرکاری میکنزم کے بغیر کام کر رہے ہیں' آنے والے غیر منظم گڈمڈ قانونی ڈھانچوں کی ابتدائی شکلیں ثابت ہوں گے جو مقابلہ میں یا ایک دوسرے پہ غالب رہ کر کام کرتی ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر قانون اور نتائج کے اعتبار سے متصادم ہیں۔

یہ اندیشے بین الاقوامی قانون دانوں کے اعتماد کو مجروح نہیں کرتے کیونکہ وہ مشکلات پہ غالب آنے کی دانش سے بہرہ مند ہیں۔ مستقل مزاجی سے اس کے مثبت نتائج

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ناگزیریت کا اظہار کرتے ہوئے یہ گروپ پوری طرح سمجھتا ہے کہ اس کی عملی تعبیر کے لیے یہ ایک ضروری اقدام ہوگا۔ ان کی رجائیت کی اکلوتی ٹھوس بنیاد ہم عصر ناقابل مزاحمت عالمگیر معیشت ہے۔ ٹیکنالوجی' مواصلات' میڈیا' اشیا اور لوگوں کی نقل وحمل' مالی ذرائع اور مارکیٹ کے شعبوں میں ہونے والی ترقی نے دنیا کو اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ اس کا تصور ماضی میں نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اب اس تصور کے بغیر رہنا ناممکن ہے۔ بڑی بڑی بین الاقوامی کارپوریشنیں اس عالمگیریت کا محض ایک مظہر ہے۔ اب مینوفیکچرنگ' اسمبلنگ ڈسٹری بیوشن' مارکیٹنگ' مقامی دفاتر اور پورے کرۂ ارض میں فروخت کے معاملات کسی ایک ملک اور اس سے وفاداری سے بالاتر ہو چکے ہیں۔ ایک ماورائے قوم لیگل انفراسٹرکچر اس معاشی عالمگیریت کے ساتھ تیزی سے تشکیل پا رہا ہے۔

قانون کی حدود میں مقتدر اعلیٰ

عالمی سطح پر قانون ایک منفرد وصف رکھتا ہے جو قومی ریاستوں کے سیاق وسباق میں قانون کی حکمرانی سے آسان مماثلت کو منتشر کرتا ہے۔ پبلک انٹرنیشنل لا سسٹم نظریاتی طور پر آزاد ریاستوں کے درمیان تعلقات کے معنوں میں بنایا گیا ہے۔ اس کے لیے کوئی حقیقی مقننہ یا انتظامیہ نہیں ہے۔ محدود استثنا کے ساتھ (عالمی اصول اور رواجی بین الاقوامی قانون جس پر کسی ریاست کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا) قانونی ڈھانچے جو کسی ریاست پر نافذ کیے جاتے ہیں' وہ ہوتے ہیں جنہیں کوئی ریاست قابل اطلاق قرار دے کر منتخب اور قبول کرتی ہے۔ زیادہ تر انٹرنیشنل ٹریبونلز رضامندی کی بنیاد پر کام کرتے ہیں کہ انہیں کسی مقدمہ کی سماعت کا اختیار اس وقت ہوتا ہے جب تنازعہ کی فریق ریاستیں انہیں متعلقہ مقدمہ کی سماعت کی اجازت دیں۔ (البتہ پہلے سے طے شدہ معاہدہ کے تحت کچھ مقدمات کی سماعت لازمی طور پر ان ٹریبونلز میں ہوتی ہے) اس وقت کوئی مؤثر ادارہ جاتی مشینری ایسی نہیں ہے جو پابندیاں نافذ کر سکے۔ اس لیے منفی فیصلوں پہ عملدرآمد' ہارنے والے فریق کے ذاتی مفاد یا اس کے حسن نیت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ خصوصی پابندیوں کے مفاد کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب عملدرآمد نہیں کیا جاتا۔ لیکن شکست خوردہ فریق بعض

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اوقات ان نتائج کو تسلیم کیے بغیر بھگتتا ہے۔ علاقائی انتظامات مثلاً یورپی یونین وغیرہ درمیانی صورت ہیں اور ان کے کچھ اوصاف مذکورہ بالا اوصاف جیسے ہیں جبکہ دیگر اعتبار سے عام قومی ریاستوں جیسے ہیں۔

اگر پبلک انٹرنیشنل لاء کو افراد کی ایک کمیونٹی کے معنوں میں دیکھا جاتا تو..... تمام بادشاہ اپنے استحقاق میں ایسا ہی کرتے کہ..... یہ ایک ایسا قانون ہوتا جس میں موجود قوانین کا مجموعہ صرف ان افراد پر نافذ ہوتا جو خود کو اس کا پابند بنانے پر تیار ہوتے۔ یوں قوانین کے مختلف مجموعے ہوتے۔ ان میں سے کچھ چند افراد پر نافذ ہوتے جبکہ بقیہ پر نہ ہوتے۔ (البتہ ایک مختصر سی فہرست ان عالمی اصولوں کی ہوتی جن کا اطلاق سب پر ہوتا)۔ کوئی مخصوص فرد کسی عدالت کے سامنے پیش ہونے سے انکار کر سکتا تھا اور بعد میں کسی عدالت کی فیصلے کو مسترد کر سکتا تھا کہ وہ ان قوانین کو قبول ہی نہیں کرتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ تو بہت عجیب محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح کی کمیونٹی میں موجودہ اخلاقیات کے اس امکان کو نظر انداز کرنا کہ قانون کا احترام اس لیے کرنا چاہیے کہ اس کا مرتبہ ایک قانون کا ہے یہ نتیجہ برآمد کرے گا کہ افراد صرف اس وقت قانون کے پابند اور مطیع ہوں گے جب ایسا کرنا ان کے مفاد میں ہوگا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ انتہائی طاقتور افراد جنہیں نہ تو دوسروں کا خوف ہو اور نہ اس خوف کی کسی طرح ضرورت ہو وہ بے دھڑک قانون شکنی کرنے کی صلاحیت اور رغبت رکھیں گے۔

پبلک انٹرنیشنل لاء عملی طور پر اس سے ملتا جلتا ہے جس کی پیشین گوئی یہ منظر کرے گا۔ آزاد ریاستوں پر بین الاقوامی قانون کی پابندیاں مؤثر طور پر صرف تجارت کے شعبہ میں کام کرتی ہیں کیونکہ عالمی معیشت کا اثر عملاً ہر ملک کی معاشی صحت پر پڑتا ہے۔ ممالک رضا کارانہ طور پر خود کو ان پابندیوں کا اسیر کرتے ہیں۔ بعض اوقات ہچکچاہٹ کے ساتھ ایسا کرتے ہیں کیونکہ بصورت دیگر انہیں عالمی تجارت میں مکمل طور پر حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ دوسرے ملکوں کی طرف سے نافذ کردہ معاشی پابندیاں مسائل پیدا کرتی ہیں چنانچہ متعلقہ ملک کو منفی فیصلہ پر عملدرآمد کرانے میں مدد ملتی ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ WTO کی ڈسپیوٹ سیٹلمنٹ باڈی جبراً اپنے اختیارات استعمال کرتی ہے جو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فریقین کی مرضی کی پابند نہیں ہوتی۔

قانون کی حکمرانی کا احترام نہ کرنے والے طاقتور ملکوں کی سب سے بڑی مثال بین الاقوامی قانون دان ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی صورت میں دیتے ہیں (حالانکہ بین الاقوامی قانون کی حکمرانی کی تشکیل میں کلیدی کردار کا کریڈٹ تمام طور پر اسی کو دیا جاتا ہے)۔ امریکہ ہی آج کل دنیا کی اکلوتی سپر پاور ہے۔ اس حوالے سے ایک واقعہ جس کا ذکر بار بار ہوتا ہے' وہ نکاراگوا کی طرف سے 1980ء کے عشرہ میں عالمی عدالت میں لائی جانے والی شکایت ہے۔ اس میں امریکہ کے عسکری اقدامات کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا گیا تھا۔ امریکہ نے اس کے جواب میں عدالت کو کہا تھا کہ وہ اس کے حق سماعت کو تسلیم نہیں کرتا۔ (اور اس کے لیے اپنی رضامندی واپس لے رہا ہے)۔ عدالت نے قرار دیا کہ دستکش ہونے کا اقدام بعد از وقت ہے۔ عدالت کا حق سماعت برقرار ہے۔ امریکہ نے محاذ آرائی کرتے ہوئے عدالت میں پیش ہونے سے انکار کر دیا۔ ایک اور حالیہ واقعہ میں عالمی عدالت نے امریکہ میں ایک غیر ملکی باشندے کی موت کی سزا معطل کرنے کا فیصلہ سنایا لیکن امریکہ کی سپریم کورٹ نے اس کا احترام نہ کیا۔ امریکی انتظامیہ نے موقف اختیار کیا کہ عالمی عدالت کا یہ فیصلہ عبوری حکم تھا جس کی پابندی ضروری نہیں۔ سزائے موت پر عملدرآمد کر دیا گیا جس پر دنیا بھر میں بین الاقوامی قانون دان اور مبصرین نے اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ موجودہ برسوں میں سامنے آنے والا انتہائی متنازعہ اقدام ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی قیادت میں اتحادیوں کا عراق پر حملہ اور صدر بش کا نظریہ حق شفعہ میں ذاتی تحفظ کے لیے حملہ آور ہونا ہے۔ ان اقدامات نے دنیا میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں یہ تاثر پختہ کر دیا ہے کہ امریکہ ایسا ملک ہے جو بین الاقوامی قانون کو جب جی چاہتا ہے روند کر رکھ دیتا ہے۔

بہر طور ریاست ہائے متحدہ امریکہ اکلوتا ایسا ملک نہیں ہے جس نے اس طرح کے طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہو۔ چنانچہ آزاد ملکوں پر قانونی پابندیوں کے معنی میں قانون کی حکمرانی کی عملی تعبیر کے بارے میں شکوک و شبہات قابل فہم ہیں۔ خاص طور پر بہت سے بین الاقوامی قانون دان کہتے ہیں کہ قانون کی حکمرانی کی بنیادی پابندیاں بین الاقوامی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عدالتی حکم میں رضا کارانہ نوعیت رکھتی ہیں۔ مختلف ممالک کو کسی بھی طرح مؤثر طور پر بین الاقوامی قوانین کا پابند نہیں بنایا جا سکتا جب تک وہ کسی بین الاقوامی عدالت کے سامنے لائے جانے سے پہلے یہ رضامندی نہ دے چکے ہوں کہ وہ غیر قانونی طرز عمل پہ جوابدہ ہوں گے۔ یہ درست ہے کہ بہت سے ممالک زیادہ تر قانون کی اطاعت کرتے ہیں لیکن عموماً یہ کمزور یا اچھا طرز عمل رکھنے والے ممالک ہوتے ہیں جبکہ قانون کی حکمرانی کا تصور تو خاص طور پر طاقتور اور غارت گر ملکوں کی اطاعت اور انہیں پابند بنانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اسے لاک کے تجزیہ کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ ملک جو بین الاقوامی قانون کو جب مناسب سمجھتے ہیں قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں دراصل اپنے مقدمات کو جبلی طور پر اپنے مفادات میں جانبدار رہتے ہوئے دیکھ کر ایسا فیصلہ کرتے اور دوسرے ملکوں کے مدمقابل کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ بات قانون کی حکمرانی سے زیادہ ذمہ داری محسوس کرنے کی ہے لیکن یہ سب کچھ سطحی سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ممالک (بشمول طاقتور اور ناشائستہ ممالک) زیادہ تر بین الاقوامی قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔ ماسوائے ایسے مواقع کے کہ جب ان کے لیے یہ سودمند نہ ہو بصورت دیگر مؤثر بین الاقوامی پابندیوں کی عدم موجودگی میں بھی اس کا احترام کرتے ہیں (پابندیوں کی صورت میں سیاسی اور اقتصادی نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے)۔ یہ منظر قرون وسطیٰ میں مقتدر اعلیٰ کے حوالے سے ہوتا تھا جب قانون کی حکمرانی کی روایت بہت مضبوط تھی۔ اسی طرح ایسے حالات میں بادشاہ کرتے تھے جیسے آج کل آزاد ممالک بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ بھی پوری کوشش کرتے تھے کہ اپنے اقدامات کو قانون کی مطابقت میں ثابت کرنے کے لیے تاویلیں پیش کریں۔ وہ ظاہر کرتے تھے کہ قانون ان کے لیے بہت اہم ہے حالانکہ یہ سب کچھ دھوکا ہوتا تھا۔

مذکورہ بالا بحث آزاد ریاستوں کی حیثیت رکھنے والے ملکوں پہ قانونی پابندیوں سے متعلق ہے۔ آزاد ریاستوں پہ بین الاقوامی سطح پہ قانونی حدود و قیود کی ایک اور قسم حکومتی سربراہوں کو ذاتی طور پر نامناسب طرز عمل کے لیے جواب دہ ٹھہراتی ہے۔ یہ نیتا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک نئی صورت حال ہے' اس کی مثال دوسری جنگ عظیم کے بعد نیورمبرگ مقدمہ میں قائم ہوئی تھی۔ اب عالمی سطح پر ایسے ادارے قائم کیے جا چکے ہیں جو وسیع پیمانے پر ظلم وستم کرنے والے بالخصوص انسانیت کے خلاف جرائم اور نسل کشی کے مرتکب سربراہان مملکت اور حکومتی قائدین کو سزا دیتے اور آئندہ ایسے طرز عمل کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ان میں سابقہ یوگوسلاویہ اور روانڈا کے وار کرائم ٹریبونلز اور انٹرنیشنل کریمنل کورٹ شامل ہیں۔ ایسے قائدین کی فہرست بہت طویل ہے جنہوں نے اپنے عوام پر بے پناہ ظلم وستم توڑے اور ان کی جوابدہی کی گئی لیکن ان کو کیفر کردار تک نہ پہنچایا جا سکا کیونکہ انٹرنیشنل کریمنل کورٹ ابھی حال ہی میں بنائی گئی ہے (اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ سختی کے ساتھ دستخط کرنے سے انکار کر رہا ہے)

رسمی ضابطہ پسندی

قانون کی حکمرانی کے گرد پائے جانے والے مفہوم کے دوسرے خوشے سے تعلق میں جو عمومیت' مساوات اور قطعیت کے عوامی اور امکانی ضابطے چاہتا ہے' بہت سے مسائل خاص طور پر بین الاقوامی قانونی ضابطوں کے حوالے سے پوری شدومد کے ساتھ سامنے لائے جائیں گے۔ یہ صورت حال اور قانون کی حکمرانی کا درج ذیل مفہوم خصوصی اور عوامی بین الاقوامی قانون کے دونوں پس منظروں پہ منطبق ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ وہ حالات جو اس باب کے پچھلے حصہ میں بتائے گئے ہیں اور عمومی طور پر وہ کردار جو اقتدار اور سیاست بین الاقوامی قانون پر اثرانداز ہوتے ہوئے ادا کرتے ہیں' قانون کی قطعیت اور نفاذ میں مساوات کے لیے منفی نتائج رکھتا ہے۔

دوسرا مسئلہ غیر مربوط ٹریبونلز کی افراط اور مخصوص موضوعات پہ بین الاقوامی قانون کا انتشار ہے۔ خصوصی حوالے سے معاہدوں کے ذریعے قانون کو بتدریج تخلیق کرنے کا نتیجہ اور یہ حقیقت کہ بین الاقوامی تجارتی قانون بنیادی طور پر معاہدہ کرنے والے فریقین نے وضع کیا تھا' ایسے مسائل پیدا کرتا ہے جو قطعیت اور نفاذ کی مساوات سے دور لے جاتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام نئے معاہدوں' بین الاقوامی تنظیموں کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فیصلوں اور بین الاقوامی عدالتوں اور ٹریبونلز کے مقدمات کی مطابقت میں رہا جائے۔ مطابقت کے لیے مخصوص پیچیدگیاں معاہدہ کرنے والی مختلف حکومتوں کے درمیان ایک دوسرے میں گڈمڈ شعبوں میں ابھرتی ہیں جس طرح ماحولیاتی مسائل کے اثرات صنعت و حرفت پر پڑتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون اس وقت پیش بینی کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے جب کوئی سیاق و سباق قانونی ضابطوں کے متصادم مجموعے کے تحت ہوتا ہے اور نا قابل مصالحت پالیسیوں کا شکار ہوتا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کے نفاذ کا عمل ہمیشہ شفاف نہیں ہوتا۔ WTO کے تنازعات حل کرنے کے فیصلے بند خفیہ سماعت میں ہوتے ہیں۔ ICC عدالت کے ثالثی کے فیصلوں کو عموماً شائع نہیں کیا جاتا۔ ICSID کے جو فیصلے شائع کیے جاتے ہیں وہ فریقین کی رضامندی کے ساتھ مشتہر کیے جاتے ہیں۔ غیر شفافیت قابل بحث حد تک رسمی ضابطہ پسندی کے تشہیری پہلو کو متعفن کرتی ہے۔ اس کے نفاذ کی مساوات پر نظر رکھنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے جبکہ ہم آہنگ تشریح پر مبنی قطعیت کا فروغ بھی مسدود ہو جاتا ہے۔

چوتھا مسئلہ وضاحت' ربط اور اطلاق کی مناسبت کا ہے۔ یہ ایک سے زیادہ مسائل کا مجموعہ اس حقیقت سے جنم لیتا ہے کہ قومی قانونی حکومتیں اور ان کی مقامی عدالتیں عوامی اور خصوصی بین الاقوامی قوانین سے متعدد مرتب اور غیر مرتب طریقوں سے کام لیتی ہیں۔ قومی عدالتیں بین الاقوامی یا ماورائے قومی قوانین اور عدالتوں اور ثالثوں کے فیصلوں کی تشریح کرتی ہیں۔ قومی قانونی حکومتیں بین الاقوامی یا ماورائے قوانین کو شامل کرتی' حوالہ دیتی' انحصار کرتی' ارتباط کرتی' نظرانداز کرتی' مسترد کرتی یا پھر ان باتوں کے برعکس کرتی ہیں۔

رسمی ضابطہ پسندی سے متعلق ایک آخری نکتہ یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کی بنیادی سمت بندی..... ترکیب کے اعتبار سے..... آزاد ملکوں کے درمیان امن قائم رکھنا ہے۔ یہ ایک ایسا ہدف ہے جس کی طرف پیش قدمی سختی سے ضابطوں پر عمل کرنے کی پابندی کی بجائے مصالحت اور باہمی تسلیم و رضا کے ذریعے ہوتی ہے۔ GATT (WTO کے پیشرو) کے تحت تنازعات مصالحتی انداز میں حل کیے جاتے تھے جس میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فریقین سے گفت وشنید کی جاتی تھی۔اس سمت بندی میں سے کچھ WTO کے انتظام میں بھی شامل کی گئی ہے۔اس کے تحت کام کرنے والے ٹربیونل کا نام ڈسپیوٹ سیٹلمنٹ باڈی ہے۔تاہم عملاً اس کے زیادہ تر فیصلے زیادہ رسمی طور پر قانونی یا ضابطہ کے تحت ہوتے ہیں۔ یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ عالمی عدالت کے سامنے پیش کیے جانے والے تنازعات اتنے خطرناک ہیں کہ عدالت کی اولین ترجیح ان کا تصفیہ کرانا ہے ناں کہ قطعی قانونی فیصلہ سنانا۔ یورپی یونین میں باہمی مشاورت سے ایک قابل قبول حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا مقصد رکن ممالک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی شکایات کا ازالہ کرنا ہے۔ بین الاقوامی قانونی سیاق وسباق کے ایک تنوع میں ہوتا یہی ہے کہ تنازعات ایسے انداز میں تصفیہ کیے جائیں کہ دونوں فریق مطمئن رہیں۔کوشش یہی ہوتی ہے کہ ہار جیت کا احساس نہ ابھرے۔یہ انتظامات ضابطوں کے نفاذ میں ہمیشہ مشکوک نہیں ہوتے۔یہ دیکھتے ہوئے کہ خطرے میں کیا ہے اور تنازعہ میں ابھرنے والی سیاسی پیچیدگی کو نظر میں رکھتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ زیادہ انحصار رضا کارانہ عملدرآمد پر ہوتا ہے' ضابطوں سے وفاداری کو بنیادی اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ سمت بندی ضابطہ پسندی کے راستے سے تو ہٹا دیتی ہے لیکن دانشمندی کے تقاضوں پر پورا اترنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے۔

فرد کی نہیں قانونی کی حکمرانی

قانون کی حکمرانی کے بارے میں اندیشے بین الاقوامی قانون کے میدان میں اس کے مفہوم کے تیسرے خوشے یا مجموعے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ججز اور قانونی حکام عموماً' لازمی طور پر قانون کی تشریح اور اس کا اطلاق غیر جانبداری سے کریں۔ایک فوری مشکل یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون دان اس پیشہ ورانہ روایت اور معمول سے کام نہیں لیتے جس کا مظاہرہ زیادہ تر قومی یا ملکی نظام ہائے قانون میں پوری گہرائی اور سنجیدگی سے کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی قانون کے شرکاء اگر مختلف قانونی روایات مثلاً دیوانی قوانین' قوانین عامہ' سوشلسٹ اور اسلامی قوانین اور مختلف دیگر اقسام اور امتزاج کی تعلیم نہیں رکھتے تو ان سے کوئی توقع کیسے رکھی جاسکتی ہے۔ایک تقابل دیکھیں۔دیوانی مقدمات میں عدالتی فیصلے کرنے کے لیے امور کا جائزہ لینا قوانین عامہ کے مقدمات میں غیر جانبدارانہ تحقیق و

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تفتیش کے ساتھ امور بھانپنے سے بالکل مختلف ہے۔ زیادہ تر بین الاقوامی قانون دان اس قانون میں مہارت اپنی تعلیم اور پھر پریکٹس کے دوران حاصل کرتے ہیں۔ عملی میدان میں یہ علم ایک مختلف صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ اختلافات موجود ہوتے ہیں کہ بین الاقوامی قانون کو کس طرح سمجھا اور نافذ کیا جائے۔

ابتدائی ابواب میں تذکرہ ہو چکا ہے کہ ایک مشترکہ قانون کا کلچر اطلاق کے سیاق میں عدم تعین کو کم کر دیتا ہے۔ قانون کی قطعیت اور پیشین گوئی کی صلاحیت میں اضافہ کر دیتا ہے اور اس بات کو ممکن بنا دیتا ہے کہ ججوں کو اپنے فیصلوں میں زیادہ جواب دہ بنا دے۔ چنانچہ ایک گہرا اور پھیلا ہوا مشترکہ قانون کا کلچر اس بات کو یقینی بنانے میں مدد دیتا ہے کہ کسی مقدمہ کا نتیجہ جج کی مرضی کے تابع نہ ہو جائے۔ حالیہ عشروں میں بین الاقوامی اور ماورائے قومی قانونی اداروں کی دھماکہ خیز نشوونما کے حوالے سے دیکھیں تو گلوبل لاء فرموں کا ظہور، بیرون ملک قانونی تربیت حاصل کرنے کا بڑھتا ہوا معمول اور ایک علمی تخصیص کی حیثیت سے بین الاقوامی قانون کا بڑھتا ہوا وقار اور استحکام اور ایک پختہ کار بین الاقوامی قانون کا کلچر یہ امید دلاتا ہے کہ مسائل کا حل یقینی طور پر سامنے آ رہا ہے۔ بہرحال فی الوقت بین الاقوامی قانون کے پیشہ پر مغرب کے تربیت یافتہ افراد (قانون دانوں) کا غلبہ ہے لیکن جس طرح اس باب کے آخر میں نتیجہ اخذ کیا گیا ہے، یہ اہم اور ضروری ہے کہ اس کے شرکا دنیا بھر سے تعلق رکھتے ہوں تاکہ تنازعات کے حل میں وسیع تر اثرات اور نمائندگی موجود ہو۔

قانون کی حکمرانی کے اس پہلو کو درپیش ایک اور پریشان کن خطرہ بین الاقوامی لاٹریبونلز کے عجیب وغریب وصف سے ہے۔ ان ٹریبونلز کی ایک بڑی تعداد جس میں عالمی عدالت، سمندری قوانین کا ٹریبونل اور انسانی حقوق کی یورپی عدالت شامل ہے۔ ان میں فریقین کو یہ حق حاصل ہے کہ فیصلہ کرنے والے جوڈیشل پینل میں ایک جج ان کے ملک کا ہو۔ اگر اس ملک کا کوئی جج دستیاب نہ ہو تو متعلقہ فریق کسی اور ملک کے جج کا عارضی طور پر تقرر کر سکتا ہے۔ لیکن یہ صرف اسی ایک مقدمہ کے لیے ہوتا ہے جو ڈیشل پینلز میں قومی نمائندگی کی روایت تاریخی جڑیں رکھتی ہے۔ ماضی میں فریقین بین الاقوامی تنازعات کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصفیہ کے لیے اس شرط پر تیار ہوتے تھے کہ تصفیہ کاروں میں ان کا قومی نمائندہ بھی شامل ہوتا' کہ ان کے مفادات کی نگہبانی یقینی ہو سکے۔ یہی مشق انٹرنیشنل ٹریبونلز کا معمول بن گئی' البتہ WTO کو استثنا حاصل ہے۔ اس میں مقدمہ کی سماعت کے دوران متعلقہ فریقین کے کسی شہری کی جوڈیشل پینل میں شمولیت کی اجازت نہیں ہوتی۔ لیکن فریقین کو کسی کی موجودگی پر اعتراض نہ ہو تو ایسا ممکن ہوتا ہے۔ اب ان بین الاقوامی عدالتوں میں ججوں کا تقرر اگر سیاسی بنیادوں پر ہو رہا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

ظاہر ہے پینلز میں موجود ''قومی ججوں'' کی غیر جانبداری کے بارے میں سوالات اٹھنا قدرتی بات ہے۔ بلاشبہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ججوں کے رول کا ایک مخفی جزو اس فریق کے مفادات کے محافظ کی حیثیت سے کام کرنا ہے جو ان کا تقرر کرتا ہے حالانکہ انہیں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قانون کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ ان دونوں حیثیتوں (قانون کے محافظ اور اپنے فریق کے مفادات کے محافظ) کے درمیان کشاکش پائی جاتی ہے۔ یہ بات قانون کی حکمرانی کے بنیادی تصور کے خلاف ہے کہ جج کسی ایک فریق کے لیے جانبداری اور دوسرے کے لیے عناد رکھتا ہو۔ عارضی اور عبوری جج تو خاص طور پر متَلوک ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ بنچ کے عمومی رکن نہیں ہوتے چنانچہ وہ منصف کے غیر جانبدارانہ کردار کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ ایک مفروضہ یہ پایا جاتا ہے کہ فریقین کی طرف سے منتخب کردہ ججز آزاد اور غیر جانبدارانہ نہیں رہ سکتے اور لازمی طور پر ہدایات اور اشارے کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ عالمی عدالت کے فیصلوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ججز اپنے ملک کے حق میں بے محابہ فیصلے کرتے ہیں۔ فیصلوں کا یہی انداز عبوری اور عارضی ججوں کی طرف سے دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ جج کمزور پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسے ججز جنہیں خود پر معروضی فیصلے کرنے کا ناز ہوتا ہے وہ بھی اپنی غیر جانبداری ظاہر کرنے کے لیے اپنے ملک کے دعوے پر ناقدانہ سوالات کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن جو بھی صورت ہو' ان ججوں کے فیصلوں میں غیر قانونی اور غیر متعلقہ عنصر ضرور پایا جاتا ہے۔ تیسرے مفہوم میں قانون کی حکمرانی کی کامیابی انٹرنیشنل جوڈیشل ٹریبونلز کی ساخت میں سیاست کی دخل اندازی نے دھندلی کر دی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور آخری تشویشناک بات فیصلوں پر ججوں اور ثالثوں کے ذاتی مفادات کے اثرات ہیں۔ یہ مسئلہ نجی فریقین کے درمیان بین الاقوامی مصالحت کے حوالے سے خاصا سنگین ہے۔ ثالث بھی انہیں ماورائے قوم تجارتی حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں جن سے فریقین یا ان کے وکلا کا ہوتا ہے۔ ''اس صورت حال سے تشکیک ابھرتی ہے کہ کوئی ثالث کسی فریق (یا وکیل) کے لیے جانبداری نہ رکھتا ہو۔ ممکن ہے اس نے اسے ماضی میں ملازمت یا مالی منفعت دی ہو اور مستقبل میں بھی اس کا امکان ہو۔ اس اندیشے کو کچلنے کے لیے ثالثی کی کچھ صورتوں میں' بالخصوص IC.SID میں فریقین اپنا اپنا ثالث منتخب کرتے ہیں اور تیسرے پر متفق ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سے وہ تمام اندیشے پھر سے ابھر آتے ہیں جن کا تذکرہ پچھلے پیراگراف میں ہو چکا ہے۔ اب یہ اندیشے ملک کی جانبداری کی بجائے ذاتی مفادات کے حوالے سے ابھرتے ہیں۔ بین الاقوامی ججز کا تقرر عام طور پر نسبتاً مختصر عرصہ کے لیے ہوتا ہے۔ یا پھر وہ خود جز وقتی ججوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ایک دفعہ پھر یہی ہوتا ہے کہ وہ ان فریقوں یا وکیلوں کی سماعت کر رہے ہیں جن سے ان کا رابطہ ماضی میں رہ چکا ہے یا مستقبل میں ہونے کا امکان ہے۔ اس کا ضروری طور پر یہ مطلب نہیں ہے کہ ان حالات میں فیصلے کرنے والے سبھی ثالث یا جج بدعنوان ہوتے ہیں۔ (ملکوں کے اندر کام کرنے والے جج یا ثالث بھی بعض اوقات بدعنوان ہوتے ہیں) مسئلہ صرف یہ ہے کہ ناجائز ترغیبات ہی غیر جانبداری کو پس پشت ڈالتی ہیں اور قانون کی حکمرانی فیصلے کرنے والوں کی مصلحت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔

غیر جانبداری کے ساتھ فیصلے کرنے کی بین الاقوامی ججوں کی صلاحیت کے بارے میں خدشات بین الاقوامی سطح پر اس وقت بڑھ جاتے ہیں جب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ داخلی سیاست کا عدلیہ میں اثر و نفوذ بین الاقوامی سطح پر بھی دیکھنے میں آ رہا ہے۔ بین الاقوامی فیصلے بذات خود ملکوں کے سیاسی کنٹرول سے نکال کر ان ہاتھوں میں دیئے جا رہے ہیں۔ جسے نیا بین الاقوامی کھلاڑی یعنی بین الاقوامی عدلیہ کہا جاتا ہے۔ بہت دور پائی جانے والی ناقابل مواخذہ اشرافیہ ایسے فیصلے کر رہی ہے جو بین الاقوامی اور قومی مفادات کو متاثر کر رہے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سب کے لیے ایک بین الاقوامی قانون

بین الاقوامی قانون کی حقیقی حکمرانی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ شائد ان مخصوص مسائل میں سے کوئی ایک نہیں جن کی نشاندہی اوپر کی گئی ہے یہ سب حل ہو سکتے ہیں یا ان کی سنگینی کم کی جا سکتی ہے۔ آزاد ممالک کے لیے قانون کی حکمرانی کو تاریخی ارتقا بخشنے والے عوامل میں یہ معاون اعتقادات شامل ہیں کہ قانون کو منصفانہ عوام کا بنایا ہوا اور پوری کمیونٹی کے مفاد میں ہونا چاہیے۔ یہی وہ اوصاف ہیں جو قانون کو قابل احترام بناتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ آج کی دنیا دیوقامت غیر متناسب اختلافیات (اغراض و مقاصد) رکھتی ہے۔ ایشیائی معجزہ کے باوجود جسے 1990ء کے عشرہ میں زبردست دھچکہ لگا۔ امیر ممالک امیر تر اور غریب ممالک غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ تین ارب لوگ روزانہ 2 ڈالر سے کم آمدنی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ ارب کے قریب اس سے بھی آدھی رقم کے ساتھ جینے پر مجبور ہیں۔ دو ارب لوگ بجلی کی سہولت سے محروم ہیں۔ ڈیڑھ ارب لوگوں کو صاف پانی میسر نہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو مغرب میں زندگی بہت حد تک پُرتعیش ہے۔

ایک مادی خطرہ بھی موجود ہے کہ بین الاقوامی قانون کو بقیہ دنیا مغربی ایجاد اور ایک ایسا آلہ سمجھے گی جس کے ذریعے مغربی مفادات کو فروغ دیا جائے گا اور مغرب کی فوقیت کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال ہوگا۔ بین الاقوامی میدان میں مغرب کے کھلی خودغرضی پر مبنی منافقانہ یا جبری اقدامات نے اس تشکیک کو توانا کیا ہے۔ اس کی مثالیں اَن گنت ہیں۔ مغربی ممالک آزاد تجارت کے ثمرات پر زور دیتے ہیں لیکن زیادہ تر مراعات اپنے کسانوں کو دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسی اضافی اجناس پیدا کرتے ہیں جو لاگت سے کم قیمت پر مارکیٹ میں ذخیرہ کر دی جاتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ترقی پذیر ممالک کے غریب کسان مارکیٹ سے باہر رہ جاتے ہیں اور غصہ اور برہمی کی فصل کاٹتے رہتے ہیں۔ مغربی ممالک اس طرح کی مراعات (امدادی رقوم) WTO کے دائرۂ اختیار میں شامل کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ عالمی بنک اور آئی ایم ایف قرضہ اور امداد طلب کرنے والے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ممالک پر معیشت کو عدم مستحکم کرنے والی تکلیف دہ اور سیاسی پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ مغربی ممالک خود ایسی پابندیاں کبھی قبول نہیں کرتے اور انہیں اپنے اقتدار اعلیٰ کے منافی قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ آلودگی کم کرنے اور بارانی جنگلات کے خاتمہ کا عمل سست کرنے کے لیے عالمی کوششوں کو ان ممالک میں دراندازی کا عمل سمجھا جاتا ہے جو اپنے صنعتی شعبہ کو طاقتور بنانے کا آغاز کر چکے ہیں۔ مغرب اس طرح کے اقدامات کو اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر کبھی قبول نہیں کرتا۔ انٹرنیشنل لیبر ریگولیشنز کو مغرب کے محنت کشوں کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ انہیں ترقی پذیر ممالک کے سستے محنت کشوں کے مقابلہ سے بچانے کے لیے پیداواری لاگت میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مستقل مغربی ارکان کو ویٹو کا اختیار حاصل ہے چنانچہ وہ ایک اشارے سے بین الاقوامی برادری کے فیصلوں کو مسترد کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانی حقوق بھی مشکوک ہیں۔ ''بہت سے ممالک ایسے ہیں جو انسانی حقوق اور انسانی حقوق کے قوانین کو مغرب کی ثقافتی سامراجیت کی ایک شکل سمجھتے ہیں۔

اگر دنیا میں ایک پائیدار بین الاقوامی قانون کی حکمرانی قائم ہونا ہے تو اسے پوری بین الاقوامی کمیونٹی کے مفادات کا عکاس بن کر نظر آنا ہوگا۔ بصورت دیگر اس تصور اور یقین کا امکان معدوم ہو جائے گا کہ بین الاقوامی قانون' حکمرانی کا اہل ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

11

عالمی انسانی بہبود

اس کتاب کے آغاز میں کہا گیا تھا کہ سیاستدان' حکومتی عمائدین' سیاست اور قانون کے نظریات دان' کاروباری قائدین' ترقیاتی ماہرین' عالمی بنک' آئی ایم ایف اور کرۂ ارض پہ پائے جانے والے' لبرل اور نان لبرل معاشروں' ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک سے متعدد مفکرین اور دانشور قانون کی حکمرانی کے تصور کو ایک عالمگیر بہبود کی حیثیت سے فروغ دے رہے ہیں۔ ربع صدی پہلے معروف مارکسسٹ مورخ ای۔پی۔تھامپسن نے ایک طوفانی علمی بحث بائیں بازو میں چھیڑ دی تھی جب اس نے انگلستان میں لبرل ازم پہ ایک مفصل تاریخی مطالعہ کرنے کے بعد اعلان کیا تھا کہ قانون کی حکمرانی ایک غیر مشروط (مطلق) عالمی خیر ہے۔ اپنے مارکسسٹ ساتھیوں میں سے ایک کے اس نتیجہ کو بائیں بازو کے لوگوں نے غداری کے مترادف قرار دے دیا۔ تھامپسن نے توثیق کی کہ قانون حکمران طبقہ کے مفادات کی خدمت کرتا ہے۔ ججوں کا انتخاب حکمران طبقہ سے ہوتا ہے جو اسے اپنی جانبداری سے فیض یاب کرتے ہیں۔ انگلش لبرل لاء غیر جانبداری کے بھیس میں اَن گنت نابرابریوں کو چھپاتا اور انہیں تقویت دیتا ہے۔ لیکن یہ کہانی مکمل نہیں تھی اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ قانون کی پابندی کا نظریہ ان لوگوں کو حدود و قیود میں رکھتا ہے جو اقتدار میں ہوتے ہیں' وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ قانون کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پابند ہیں اور اس دعویٰ کا نتیجہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو یقین دلاتا اور مجبور کرتا ہے کہ قانون کی پابندیوں میں رہیں۔ دعوے حقیقت میں بدل جاتے ہیں۔ یہ چیز ذہن میں رکھتے ہوئے' تھامپسن نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قانون کی حکمرانی عالمی اہمیت کی تہذیبی کامیابی ہے۔ قانون اکثر اوقات دائمی غلبے اور عدم مساوات میں ساجھے دار ہوتا ہے لیکن تھامپسن نے قانون کی حکمرانی کے بارے میں دیکھا کہ یہ بذات خود اقتدار و اختیار پہ مؤثر پابندیاں عائد کرتی اور شہریوں کو اقتدار کے پُرفریب دعوؤں سے بچاتی ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک یہ ایک غیر مشروط انسانی خیر ہے۔

جب قانون کی حکمرانی کے مسلمہ طور پر معنی یہ ہیں کہ حکومت قانون کی پابند ہے۔ (معانی کا پہلا خوشہ) تو تھامپسن درست کہتا ہے کہ یہ ایک عالمی انسانی بہبود ہے۔ اس نظریہ کی میراث جو سب سے پہلے مضبوطی سے قرون وسطیٰ میں قائم ہوئی لبرل ازم کی ابتدائی شکل تھی' یہ نہ تو جبلی طور پر لبرل معاشروں سے بندھی ہے اور نہ ہی حکومت کی لبرل صورت ہے۔ اگر حکومت ان دونوں مفاہیم میں ایک لیگل فریم ورک کے اندر رہتے ہوئے کام کرتی ہے تو سب لوگ خوش وخرم رہتے ہیں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کہاں رہتے ہیں اور کون ہیں۔ دونوں مفاہیم سے مراد تحریر شدہ قانون کی پابندی اور قانون سازی کے اختیار کی حدود و قیود۔

اس دعویٰ کے مخالفین استدلال پیش کرتے ہیں کہ حکومت دراصل کمیونٹی کی توسیع ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف مزاحمت نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ حکومت کے اختیارات کے مفید استعمال کا راستہ روک دے گی۔ یہ استدلال خطرناک حد تک سادہ لوحی پر مبنی ہے۔ آج کہیں بھی یہ دعویٰ بظاہر معقولیت کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت محض کمیونٹی کی تجسیم ہے۔ ریاستی نظام اور حکومتیں اپنی جدید صورت میں نسبتاً حالیہ ایجاد ہیں۔ چند صدیوں سے زیادہ قدیم نہیں' ابتدائی طور پر مغرب کی تشکیل کردہ ہیں جو نوآبادیاتی دور میں دوسرے خطوں میں متعارف ہوئیں یا نقل کی گئیں۔ حکومت کبھی بھی کمیونٹی کی توسیع نہیں تھی' کم از کم سیاسی نظریات دانوں کے تخیل سے باہر کبھی موجود نہیں تھی۔ البتہ مرتکز قوت و اختیار کے ایک ادارہ کی صورت میں ہر جگہ موجود تھی جو ریاست کے فعال میکنزم کو حرکت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں لاتا ہے۔ سماجی، ثقافتی، نسلی، لسانی یا مذہبی تکثیریت کی صورت حال جو آج کی دنیا میں ہر لبرل اور غیر لبرل معاشرے میں پائی جاتی ہے، اس میں حکومت کمیونٹی کی توسیع نہیں ہوتی کیونکہ ان معاشروں میں کوئی ایک کمیونٹی نہیں پائی جاتی۔ علاوہ ازیں تکثیریت میں چونکہ مختلف گروہ باہم مقابلے میں ہوتے ہیں، اس بات کا زبردست خطرہ موجود ہوتا ہے کہ حکومتی مشینری پہ معاشرے کا کوئی ذیلی گروہ قبضہ کر کے دوسروں کو دبانے کے لیے استعمال کرے۔ یہ حقیقت کئی مرتبہ نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے کہ معاشرے میں موجود افراد کے لیے حکومتی عمال کے اختیارات سے ڈرنے کی وجہ بھی اتنی ہی بھرپور ہونی چاہیے جتنی وہ ان اختیارات کے سبب حاصل ہونے والے ثمرات کے لیے رکھتے ہیں۔

قانون کی حکمرانی کی اس تفہیم کے بارے میں کوئی جبلی انفرادیت نہیں ہے۔ اگر کوئی اشتمالیت پسند رویہ موجود ہو تو یہ کمیونٹی کی سالمیت کو حکومت کے استبداد سے بچاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی انفرادیت پسندی کا رویہ پایا جاتا ہو تو یہ فرد کو تحفظ دلاتی ہے اور اگر تکثیریت ہو تو یہ فرد اور کمیونٹی دونوں کو بچاتی ہے۔ حکومت پہ قانونی پابندیاں وہ ہوتی ہیں جو معاشرہ اور اس کے سیاسی ادارے تخلیق کرتے ہیں۔ ایک مذہبی معاشرہ جیسا کہ قرون وسطیٰ میں مسیحی معاشرے تھے یا آج کی دنیا میں بہت سے اسلامی معاشرے ہیں یا پھر کوئی ایسا معاشرہ جس میں رسم و رواج آج بھی غالب سماجی قوت ہیں۔ وہاں حکومتی عمال پہ دونوں مفہوم میں پابندیاں (حدود و قیود) نافذ ہوتی ہیں۔ وضعی قانون کی صورت میں اور قانون سازی کے اختیار کی حدود و قیود۔ جو ان سماجی، ثقافتی نظریات کا احترام اور اعانت کرتی ہیں۔

حوصلہ شکن پیچیدگیاں اس وقت ابھرتی ہیں جب وضعی قانون کے مستقل حصے یا قانون کی حدود و قیود (مثلاً مسودہ ہائے حقوق) کسی مغربی معاشرے سے لا کر غیر مغربی تہذیب میں اس طرح نصب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ موجود نظریات سے متصادم ہو جائیں۔ اس طرح کی صورت احوال میں مغربی نظریات (مثلاً ڈورکن کا نظریہ) جو موجود پس پردہ اخلاقیات اور قانون سے محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں۔ ان معاشروں کے لیے ناموزوں ہوتے ہیں۔ قانون معاشرے کی اخلاقیات سے محاذ آرائی نہیں کرتا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور نہ ہی کوئی بالائی ارتباط رکھتا ہے۔ اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کا کوئی معیاری فارمولا نہیں۔ چنانچہ احتیاط سے چلنا ہی ضروری ہوتا ہے۔

کچھ ایشیائی معاشروں کے رہنماؤں نے مغرب کے مسودہ ہائے حقوق یا انسانی حقوق کے اعلامیوں پر اعتراض کرتے ہوئے انہیں انفرادیت پسند قرار دیا ہے جو اپنے اشتمالیت پسند معاشروں کے منافی ہیں۔ بہت سے مسلمان رہنما مغرب کے لبرل معاشروں کو ''مادہ پرست' بدعنوان' زوال پذیر اور غیر اخلاقی'' کہہ کر مسترد کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان معاشروں یا تہذیبوں میں شخصی آزادی اتنی نمایاں نہیں ہے۔ چنانچہ ان حقوق کو غیر مغربی حکومتوں پر حدود و قیود نافذ نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ خیالات یکسر مسترد نہیں کیے جا سکتے۔ تہذیبیں بلاشبہ مختلف ہوتی ہیں اور شخصی آزادی جہاں تک مغرب اسے طے شدہ سمجھتا ہے' عالمگیریت کے معنوں میں جائز نہیں قرار دی جا سکتی۔

اگرچہ اس موضوع پر گفتگو عموماً نتیجہ خیز نہیں ہوتی لیکن ان مسائل کو ایک اور انداز سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ محفوظ شدہ انفرادی خودمختاری کے کسی علاقے سے ابتدا کرتے ہوئے اس طرح حکومت کی حدود و قیود کی نشاندہی نہ کریں جس طرح لبرل ازم میں انفرادی (شخصی) حقوق کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس کی بجائے حکومتی استبداد سے تحفظ کے تصور کے ساتھ ابتدا کریں اور فیصلہ کریں کہ کون کون سی حدود و قیود اس جدید ''دیو'' کے لیے ضروری ہیں اور پھر موجودہ سماجی ثقافتی نظریات اور انتظامات سے موازنہ کریں۔ یہ معاملہ اس بات سے مطابقت رکھتا ہے کہ ریاست پہ قانونی حدود و قیود کا ارتقا قرون وسطیٰ میں کس طرح ہوا۔ (حالانکہ یہ ارادتاً نہیں ہوا تھا)۔ اس بات کا امکان ہے کہ مغربی مسودہ ہائے حقوق کے اہم اجزا مثلاً اذیت رسانی یا فوج داری سزاؤں کے فوری عملدرآمد کی ممانعت جس سے حکومت کے استبداد کی انتہائی المناک صورتوں سے تحفظ ملتا ہے' اس متبادل سمت بندی کے ساتھ آگے لائے اور نافذ العمل کیے جائیں۔

حکومتی استبداد کو روکنا قدیم ایتھنز کا ایک مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ قرون وسطیٰ میں بھی موجود رہا اور آج بھی ہر جگہ موجود ہے۔ حدود و قیود کی نوعیت ہر معاشرے' ثقافت' سیاسی اور معاشی نظام میں مختلف ہوتی ہے۔ لیکن حکومت کی منشاء پر حدود و قیود کے نفاذ کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضرورت کبھی ترک نہیں کی جا سکے گی۔ قانون کی حکمرانی کی انسانی وجود کے لیے زبردست خدمت اس مفہوم میں یہی ہے کہ یہ اس ضرورت کا ایک جواب مہیا کرتی ہے۔

جب قانون کی حکمرانی کو ضابطہ پسندی کی صورت میں سمجھا جاتا ہے (معانی کا دوسرا خوشہ) تو یہ انتہائی قابل قدر خیر ہے۔ لیکن لازمی طور پر ایک آفاقی انسانی خیر نہیں ہے۔ کسی بھی معاشرے میں یہ نہیں سوچا جاتا کہ قواعد وضوابط ..... ضابطہ پسندی کا جوہر..... ہر طرح کے حالات میں غالب نہیں رہنا چاہیے۔ رسمی ضابطہ پسندی اس وقت زیر عمل آتی ہے جب حکومت پر مذکورہ بالا قانونی قیود نافذ ہوں۔ رسمی ضابطہ پسندی اس وقت ضروری ہوتی ہے جب حکومت کا استبداد فرد یا املاک کو خطرے میں ڈالے' بالخصوص مجرمانہ حدود کے نفاذ میں ضروری ہوتی ہے۔ رسمی ضابطہ پسندی تجارت اور دیگر شعبوں میں تحفظ اور لین دین (سودے بازی) میں پیشین گوئی کی صلاحیت مہیا کرتی ہے۔ اس کی ضرورت اجنبیوں اور مختلف کمیونٹیوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو خاص طور پر ہوتی ہے۔ اگرچہ ایسی صورت میں رسمی ضابطہ پسندی کی ضرورت نہیں ہوتی جب مارکیٹ میں کوئی اور متبادل سماجی میکنزم مؤثر طریقے سے تحفظ اور لین دین میں بھروسا اور پیش بینی کی صلاحیت مہیا کرتا ہو۔ ان تمام واقعات میں جہاں سماجی بندھن اور مشترکہ مفاہمت کمزور ہوں تحفظ اور پیش بینی کم ہو جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے شہری علاقوں میں رسمی ضابطہ پسندی ہی اہم فوائد پیش کرتی ہے۔

اس طرح کی صورت حال سے باہر' خاص طور پر نان لبرل معاشروں میں ضابطہ پسندی کی اطلاقیت کا سوال پوری سنجیدگی سے زیر غور لانا چاہیے۔ رسمی ضابطہ پسندی یعنی ضابطوں کے ذریعے حکمرانی ایسے حالات میں جوابی وار ہوتی جو دانشمندی' معاملہ فہمی' مصالحت یا مخصوص حالات کے مطابق ردوبدل کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کا اطلاق خاندانی امور میں محدود اور کمیونٹی کی سرگرمیوں میں اگر ضروری ہو تو بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ اکثر اوقات ضابطہ پسندی سے ہٹ کر کی جانے والی سمت بندی موجود تعلقات اور سماجی بندھنوں کے لیے کم تفرقہ انگیز ہوتی ہے۔ ضابطہ پسندی کی سخت قسم کی پابندی اس وقت الگ تھلگ کر دینے والی اور نہایت تباہ کن ہو سکتی ہے۔ جب یہ اردگرد کی سماجی تفہیم سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متصادم ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب مشترکہ اشتمالیت پسندی کی اقدار موجود ہوں اور جب ہر شخص کی توقع ہو کہ انصاف کیا جائے۔ رسمی ضابطہ پسندی پر دیا جانے والا زور ایسے حالات میں پوری قوت کے ساتھ خصوصی مشکلات پیدا کرتا ہے جب قانون کا بہت بڑا بنیادی مجموعہ اور قانونی ادارے کہیں اور سے لا کر نصب کیے گئے ہوں۔ اس طرح کے مناظر نوآبادیاتی دور کے بعد استعماری طاقتوں کے آزاد کردہ معاشروں میں دیکھنے میں آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قانونی قاعدے اور ادارے مقامی قاعدوں اور اداروں سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص پیچیدہ مسائل ہمیشہ دوغلی صورت حال میں ابھر آتے ہیں جہاں لبرل اور نان لبرل سمت بندیاں دونوں ہی متحرک ہوتی ہیں۔ یہاں اس آمیزش کا تعین ملوث مفادات رکھنے والوں کے درمیان گفت وشنید کے بعد لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ ''سب کچھ یا کچھ بھی نہیں'' جیسی حکمت عملی سے گریز کرنا چاہیے۔ رسمی ضابطہ پسندی کا درست ترین اطلاق صرف اس وقت متعین ہوتا ہے جب تناظر موجود ہو اور لوگ ملوث ہوں۔ بصورت دیگر یہ ناکام ہو جائے گا یا نقصان پہنچائے گا۔

معنی کا تیسرا خوشہ..... فرد کی حکمرانی نہیں' قانون کی حکمرانی اس وقت ابھرتا ہے جب پہلے دونوں معنی میں سے کوئی ایک اپنا لیا جاتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو یہ نقطۂ نظر اپناتا ہے کہ حکومت قانون کی حدود کی پابند ہوتی ہے اور قانون کو رسمی ضابطہ پسندی کی خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے ضروری طور پر قانون کی حکمرانی سے ہمکنار ہونا چاہیے ناں کہ افراد کی حکمرانی سے۔ کیا یہ کامیابی کے ساتھ ججوں کے ذریعے حکمرانی کے بغیر تکمیل پا سکتا ہے' اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کیا متعلقہ معاشرہ ضروری توازن برقرار رکھنے کا اہل ہے۔ ایسے توازن کا ایک فیصلہ کن عنصر ہر طرف خود کو پابند رکھتا ہے۔

اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ قانون کی حکمرانی کے یہ تینوں پہلو جو تجریدی اصطلاحوں میں زیر بحث لائے گئے ہیں۔ منشا کے اعتبار سے کھلے ہیں۔ یہ کہنا کہ حکومت پر قانونی حدود و قیود نافذ ہیں یہ نہیں بتاتا کہ یہ حدود و قیود کیا ہیں۔ ضابطہ پسندی کے تقاضے شکل کی تخصیص تو کرتے ہیں لیکن قانون کی منشا کی تخصیص نہیں کرتے۔ فرد کی حکمرانی نہیں قانون کی حکمرانی کا کہنا ہے کہ سرکاری عمال لازمی طور پر اپنے نظریات کو قابل اطلاق

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قوانین کی طرف بلند تر رکھیں لیکن یہ نہیں بتاتی کہ ان قوانین کو کیسا ہونا چاہیے۔ نہ تو جمہوریت اور نہ ہی شخصی حقوق اور انصاف ان تینوں تصورات میں ملوث ہوتے ہیں۔ یہ یاددہانی اس لیے ضروری ہے کہ اکثر اوقات قانون کی حکمرانی کو ایسے انداز میں زیر بحث لایا جاتا ہے جو اپنی قانونی حیثیت کا دعویٰ کرتی ہے اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتی کہ قانون منصفانہ یا کمیونٹی کے مفادات سے ہم آہنگ ہے۔ کلاسیکل دور اور قرون وسطیٰ میں قانون کی حکمرانی کو دی گئی بالادستی براہِ راست اس یقین سے تعلق رکھتی تھی کہ قانون کا منشا اخلاقی طور پر درست اور کمیونٹی کی بہبود کی سمت میں ہے۔ جدید ادوار سے پہلے کے زمانہ میں لوگ سمجھتے تھے کہ قانون کو اخلاقیاتی منشا کے ساتھ وضع ہونا چاہیے۔ یہ نظریہ کہ قانون کی حکمرانی ایک اخلاقی خیر لیکن مذکورہ اعانت کے بغیر ہے' ان لوگوں کے لیے سطحی اور پست ہوتا اور ہم بھی لازماً اسے مسترد کر دیتے۔ جب بھی قانون کی حکمرانی کا قیام عمل میں آئے گا (ان تینوں پہلوؤں کی تفہیم کے ساتھ) تو یہ انصاف اور کمیونٹی کی بہبود سے مشروط اور انہی کی قدر و قیمت کی بنیاد پر ہوگا۔

قانون کی حکمرانی کے ان معنوں میں سے ہر ایک کی ضروریات' خوبیاں اور خامیاں زیر بحث آ چکی ہیں۔ ان کو یہاں نہیں دہرائیں گے۔ یہ تحقیق و تفتیش اس نشاندہی کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے کہ قانون کی حکمرانی کے قیام کے لیے کیا چیز نہایت ضروری ہے۔ قانون کی حکمرانی سے وفاداری کے بارے میں موجود سماجی رویے..... ان تینوں معانی میں سے ہر ایک میں وہ پُراسرار خوبی ہے جو قانون کی حکمرانی کو قابل عمل بناتی ہے۔ اس حوالے سے خوش امیدی کی بنیادیں اس مشاہدہ میں تلاش کی جا سکتی ہیں جس کا ذکر کتاب کی ابتدا میں کیا گیا ہے کہ..... آج دنیا میں کوئی حکومت برسرعام قانون کی حکمرانی کو مسترد نہیں کر سکتی جبکہ متعدد سربراہان حکومت اس کو خراج تحسین پیش کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ جب یہ حقیقت سے زیادہ جوش خطابت کا موضوع تھی تب بھی یہ بنیادی اہمیت رکھتی تھی اور اس کی وجہ تھامپسن نے واضح کر دی ہے جو لوگ اقتدار میں ہیں وہ قانون کی پابندیوں کی خوبیوں کی تائید بالتکرار کرتے آئے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ جوش خطابت ایک اعلیٰ تہذیبی قدر بن چکا ہے۔ اب حکومت اور قانون کے لیے یہ نقطۂ نظر سب نے اپنا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیا ہے۔ ٹھیک اسی انداز میں انہی راستوں پہ چل کر جو قرون وسطیٰ میں قانون کی حکمرانی کے فروغ کے لیے تھے۔ قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے عشروں کی کوشش کے باوجود پیش رفت نظر نہ آنے پر مایوسی قبل از وقت ہے۔ قانون کی حکمرانی کی روایت قائم ہونے میں صدیاں لگی تھیں۔ پوری تاریخ میں اس کا ایک ناگزیر عنصر یہ تھا کہ حکومتی عمال اور عام لوگوں نے اسے قبول کیا اور قانون کی حکمرانی کی قدر و قیمت اور معقولیت کو طے شدہ امر بنالیا۔ آج پورے کرۂ ارض میں اس کی ابتدا کے آثار نظر آ رہے ہیں اور ان بہت سے معاشروں میں بھی دکھائی دے رہے ہیں جہاں قانون کی حکمرانی کی روایت کبھی پائی ہی نہیں جاتی تھی۔ اسی میں امید کے چراغ روشن ہو رہے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قانون کی حکمرانی، دور جدید کا انتہائی اہم سیاسی نصب العین ہے۔ لیکن اسکے باوجود زبردست ابہام پایا جاتا ہے کہ اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب کیا ہے اور یہ کس طرح زیر عمل آتا ہے۔ یہ کتاب قانون کی حکمرانی کے اردگرد پائی جانے والی تاریخ، سیاست اور نظریہ کی تحقیق و تشخیص اور تدوین ہے۔ جس کا آغاز یونان اور روم کے کلاسیکل نظریات سے کرتے ہوئے قرون وسطیٰ میں اس کی ابتدائی شکل اور نشوو ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر جدید ادوار میں لبرل نظریات اور لبرل سیاسی نظاموں میں قانون کی حکمرانی کے کردار کو نقد و نظر کا موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف نے مغرب کے قدامت پسندوں کی اس تشویش پر بھی بحث کی ہے کہ کیا واقعی قانون کی حکمرانی انحطاط کی شکار ہے اور اگر ہے تو انتہا پسند بائیں بازو نے مبینہ طور پر اس انحطاط کو تیز تر بنانے میں کیوں دلچسپی لی اور پھر قانون کی حکمرانی کے دو نظریاتی دھارے ان کی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ عالمی سطح پر قانون کی حکمرانی کے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ قانون کی حکمرانی عالمی انسانی بہبود کا لازمی حصہ ہے۔

مصنف کا مختصر تعارف

برائن زیڈ ٹاماناھا، سنٹ جانز یونیورسٹی آف لاء میں چیف جج جسٹس این کارڈوزو، پروفیسر آف لاء ہیں۔ انہوں نے لیگل تھیوری میں ایوارڈ یافتہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی تحریریں قانون کی دنیا کے سرکردہ جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ وہ لاء اینڈ سوسائٹی ریویو کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر بھی ہیں۔

تخلیقات
shers
340 ب 276 ق
25517-EU-64
علی پلازہ۔ 3 مزنگ روڈ، لاہو
Email: takhleeqat@yahoo.com
www.takhleeqat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ